جلد نمبر ۱۲۰ جولائی ۱۹۷۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن - عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

مجلسِ ادارت

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۱۸ ماہ جولائی سنہ ۱۹۷۶ء مطابق ماہ رجب المرجب ۱۳۹۶ھ عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

……٭……

شذرات

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے الجھے ہوئے مسائل سلجھتے جارہے ہیں، شملہ کے معاہدہ نے اس کی بنیاد ڈال دی تھی، خیال تھا کہ اس کے بعد تعلقات کی بحالی اور استواری میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، لیکن رہ رہ کر کچھ ایسے حالات رونما ہوتے رہے اور ایسی رکاوٹیں سامنے آتی رہیں کہ ایک مدت دراز امید و بیم کی حالت میں گزر گئی، اور ارتباط باہمی کے قیام میں تاخیر ہوتی رہی، لیکن موانع و مشکلات کے باوجود مصالحت و مفاہمت کے لئے کوششوں کا سلسلہ برابر جاری رہا آخرکار دشواریوں پر قابو حاصل کر لیا گیا، اور ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جڑنے لگے پچھلے دنوں حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے نمایندوں کی میٹنگ ہوئی اور طے پایا کہ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات از سر نو قائم کئے جائیں، اور ہوائی جہازوں اور ریل گاڑیوں کا سلسلہ پھر شروع کیا جائے، اس سمجھوتہ کے مطابق دونوں حکومتوں کی جانب سے سفیروں کی نامزدگی ہو گئی ہے سفارت خانوں کے کھولنے کے انتظامات ہو رہے ہیں، ریلوے لائن درست ہو گئی ہے اور ہوائی جہازوں کی پرواز کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں، امید ہے کہ جب تک معارف قارئین کے پاس پہونچے گا، اس وقت تک دونوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت شروع ہو چکی ہو گی، اور تعلقات پورے طور پر بحال ہو گئے ہوں گے اس طرح کئی برسوں کے بعد لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے آسانی کے ساتھ مل سکیں گے، اور تجارت کا سلسلہ شروع ہو جائیگا

مولانا محمد عثمان فارقلیط سے معارف کے ناظرین بخوبی واقف ہیں، وہ پلکھنہ ضلع میرٹھ کے رہنے

والے تھے لیکن ان کی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں بسر ہوا، وہیں مدرسۂ علی جان میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی، وہ مذہباً اہل حدیث تھے، مگر مزاج میں بڑا اعتدال تھا، حنفیوں کے ساتھ بڑا اختلاط تھا، اپنے اصول میں پختہ تھے، مگر تحزب اور گروہ بندی سے کوسوں دور تھے، دوسروں سے ایسی محبت اور یگانگت کے ساتھ پیش آتے کہ کسی کو غیریت کا احساس نہ ہوتا، وہ جماعتی عصبیت کے بجائے اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری کو پیش نظر رکھتے تھے، تعلیم کے زمانہ ہی سے مناظرہ سے دلچسپی تھی، فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک یہی مشغلہ رہا، اس سلسلہ میں دہلی کے علاوہ مدراس، کلکتہ، اور ملایا تک کے سفر کئے، ۱۹۲۹ء میں الجمعیۃ (سہ روزہ) کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے، ہلال احمد زبیری صاحب کے بعد ادارت کی پوری ذمہ داری ان کے سپرد ہوگئی، درمیان میں مدینہ میں بھی کچھ عرصہ کام کیا، تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے الجمعیۃ بند ہوگیا تو لاہور چلے گئے اور ۴۷ء تک زمزم کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد دہلی واپس آگئے، اور اسی سال دسمبر میں روزنامہ الجمعیۃ کا اجرا ہوا تو وہ اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے، ان کے مضامین قوت استدلال، دلنشیں طرز تحریر اور موثر انداز بیان کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے تھے، ۲۶ ۲۶ سال تک وہ برابر الجمعیۃ سے وابستہ رہے، ۱۹۷۳ء میں جب صحت نے بالکل جواب دیدیا، اور ضعف حد سے زیادہ ہوگیا تو مجبوراً اس خدمت سے سبکدوش ہوئے لیکن جمعیۃ علماء ہند سے ان کا دلی تعلق برابر قائم رہا اور جمعیۃ بھی ان کی خدمت رہی، الجمعیۃ کے علاوہ دوسرے اخبارات ورسائل میں بھی کبھی لکھا کرتے تھے، لوگ ان کی جرأت وبے باکی اور صداقت وحق گوئی کی بڑی قدر کرتے تھے، گزشتہ سال اردو ایڈیٹرس کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی تو اس کی صدارت کیلئے ان کا انتخاب کیا گیا، ان کا خطبۂ صدارت بہت پسند کیا گیا، افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ قوم وملت کا یہ خدمتگذار دنیا سے رخصت ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور ان کے عزیزوں، دوستوں اور قدر دانوں کو صبر کی توفیق اور ان کے نقش قدم کو دلیل راہ بنانے کی ہمت عطا فرمائے،

حدیث کی کتابوں میں جامع ترمذی اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہم سمجھی جاتی ہے، اس میں یوں تو زہد و رقاق اخلاق و آداب مناقب و تفسیر سبھی مضامین کی حدیثیں ہیں لیکن ان احادیث کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے جن کا تعلق فقہی ابواب سے ہے، امام ترمذی ائمہ المجتہدین کا مسلک بیان کرتے ہیں اور وہ حدیثیں نقل کرتے ہیں، جن سے وہ استدلال کرتے ہیں اس کے ساتھ راویوں کی حیثیت اور روایات کے صحت و سقم کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر یہ کتاب حدیث کے درس میں داخل ہے اور بڑی توجہ کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے، اسی بنا پر اس کی شرحیں بھی کافی لکھی گئی ہیں، قدیم شروح کے علاوہ مولانا رشید احمد گنگوہی کی تشریحات، مولانا انور شاہ کشمیری کی تعلیقات اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کی ضخیم شرح خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیکن ان کے باوجود اب بھی ایک ایسی جامع معتدل اور متوازن شرح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو طلبہ اور مدرسین دونوں کی ضروریات پوری کر سکے، یہ اہم کام مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی نے انجام دیا، وہ مولانا لطف اللہ کے شاگرد اور مولانا محمد علی مونگیری کے مسترشد تھے، مدتوں حدیث و فقہ کا درس بھی دیا تھا، قدیم مدارس کے علاوہ مدت تک جامعہ عثمانیہ اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر بھی رہے، اس طرح ان کی ذات میں بڑی جامعیت تھی، ان کے اندر معلم کی باریک بینی صوفی کی روشن ضمیری، مصنف کی وسعت نظر اور عصر حاضر کے تقاضوں سے واقفیت پائی جاتی تھی، اس بنا پر ان کی شرح میں بڑی جامعیت ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے عزیز اور لائق شاگرد مولانا فضل اللہ صاحب شارح ادب المفرد نے مفتی صاحب کے تصحیح کردہ متن اور شرح پر نظر ثانی کی، اور حسب ضرورت اضافے کئے، ان اضافوں کے بعد یہ شرح اور مفید ہوگئی ہے لیکن افسوس ہے کہ ایسی مفید کتاب اب تک طباعت سے محروم ہے، ملک میں عربی کتابوں کے پہلے جیسے ناشر اب نہیں رہے، مگر پھر بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ خدمت انجام دے کر نفع دارین حاصل کر سکتے ہیں ہمیں امید ہے کہ کوئی باہمت ناشر اس خدمت کے لئے تیار ہو جائیگا اور طالبان حدیث کو اس علمی ذخیرہ سے استفادہ کا موقع دیگا۔

مقالات

اسلام میں خالقِ کائنات کا تصوّر

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

انسان جب زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو طرح طرح کے مسائل و معاملات اس کے سامنے آتے ہیں جنھیں حل کرنا ضروری ہوتا ہے، اس موقع پر اسے زندگی کا نصب العین متعین کرنا پڑتا ہے، اور اس کی روشنی میں وہ طے کرتا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے نصب العین کے ماتحت اسکے خیالات و افکار میں مرکزیت پیدا ہوتی ہے، اور ایک بنیادی تخیل دل کے اندر ایسا پیوست اور رگ وریشہ میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ کسی حال میں اس سے الگ نہیں ہوتا، یہی مرکزی خیالات یا عقائد زندگی میں اصل بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں جس طرح بنیاد کے بغیر کوئی عمارت نہیں بن سکتی ہے، اور جڑ کے بغیر کوئی درخت نشو ونما نہیں پا سکتا ہے، اسی طرح عقیدے کے بغیر کوئی عمل نہ برگ و بار لا سکتا ہے، نہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے، مقاصد سے انحراف اور اصول کی خلاف ورزی کے بعد خواہ کتنی ہی محنت اور جانفشانی سے کام کیا جائے، بے سود ہوگا، اگر مشرق تک پہونچنا مقصود ہے تو مسافر کا رُخ بھی مشرق ہی کی طرف ہونا چاہیے، اگر اس نے مغرب کی طرف منھ کر لیا تو خواہ کتنی ہی تگ و دو کرے، اور منزل بہ منزل طے کر ڈالے کبھی مشرق تک نہیں پہونچے گا،

بلکہ جتنے قدم مغرب کی سمت اُٹھائے گا اسی قدر اپنی منزلِ مقصود سے دور ہوتا جائے گا یہی حال اس عمل کا ہوگا جو عقیدہ کے مطابق نہ ہوگا عمل کی صحت اور سقم کا فیصلہ محنت اور جد و جہد کی کمی بیشی سے نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کہاں تک نیت اور عقیدے کے مطابق ہے اسی حقیقت کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

انما الاعمال بالنیات وانما لامرئ ما نوی فمن کانت هجرته الی دنیا یصیبها او الی امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه

(صحیح بخاری آغاز جلد اول)

اعمال کا دار و مدار صرف نیت پر ہے، اور ایک شخص کے لئے وہی ہے جس کی اُس نے نیت کی، یہاں تک کہ ہجرت (جیسا کارِ ثواب بھی) جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے کی، تو اس کی ہجرت اسی کام کے لئے سمجھی جائے گی جس کے لئے اُس نے ہجرت کی ہو،

ایک اور روایت میں شہید کے بارے میں بیان کیا گیا ہے جس کے دل میں شجاعت اور ناموری کا خیال تھا، اس سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے میری راہ میں جان نہیں دی تجھے بہادری اور نام آوری کی خواہش تھی، وہ دنیا میں مل چکی، اس کے بعد اس کے لئے دوزخ میں لیجانے کا حکم ہوگا،

قرآن مجید میں عقیدہ اور ایمان کے بغیر عمل کی لاحاصلی کو ان الفاظ سے واضح کیا گیا ہے،

مثل الذین کفروا بربهم اعمالهم کرماد اشتدت به الریح فی یوم عاصف لا یقدرون مما کسبوا

ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا یہ ہے کہ اُن کے اعمال اس راکھ کے مانند ہیں، جس پر ایک طوفانی دن

علی شیٔ ذلک ھو الضلال البعید	تیز ہوا چلی، انھوں نے جو کچھ کام کیا،
(سورۂ ابراھیم رکوع ۳)	اس میں سے کسی چیز پر وہ قدرت نہ
	رکھیں گے، یہ بڑی لمبی گمراہی ہے،

ایک اور موقع پر اسی حقیقت کو اس طرح سمجھایا گیا ہے،

والذین کفروا اعمالھم کسراب	اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے ان
بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتی	کے اعمال اس سراب کی طرح ہیں جو
اذا جآءہ لم یجدہ شیئًا،	ایک چٹیل میدان میں ہے، پیاسا اسے
(نور - ۵ رکوع - ۵)	پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب اس
	کے پاس پہونچتا ہے، تو کچھ بھی نہیں پاتا،

ایمان اور عقیدہ کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے، اعمال کے بامعنی اور نتیجہ خیز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے پیچھے دل کا یقین اور عمل کا خلوص ہو، یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس سے ارباب دانش، اصحاب فکر اور اہل مذاہب کسی کو انکار نہیں، سب کاروبار حیات کو با مقصد بنانا چاہتے ہیں، اور زندگی کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کے لئے سرے کی تلاش میں ہیں، اور اس عالم کی کثرت کو کسی وحدت میں سمونے کی خواہش رکھتے ہیں، اصطلاحات الگ الگ ہیں، راہیں بھی مختلف ہیں لیکن منزل مقصود سب کی ایک ہے، سب کا مطمح نظر یہی ہے کہ فتنہ و فساد، ظلم و جور اور حرص و ہوس کے طوفان سے انسانیت کے سفینہ کو ساحل مراد تک پہنچایا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے کچھ اصول و ضوابط بنائے ہیں، اور ان کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے کچھ تجویزیں پیش کی ہیں، اسلام نے ان کوششوں کا اعتراف کیا ہے، متفق علیہ باتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور جن امور میں اختلاف ہے ان میں افراط و تفریط سے بچ کر صراط مستقیم کی نشان دہی کی، اور

ایک ایسا نظامِ حیات پیش کیا جو نوعِ انسان کی دائمی فلاح و بہبود کا ضامن ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ان بنیادی عقائد کی تلقین کی، جو زندگی کا محور ہیں، اور جن کے بغیر حیاتِ انسانی کی کل سیدھی نہیں ہو سکتی،

خالقِ کائنات ان ایمانی عقائد میں سب سے مقدم ایک ایسے ہمہ داں، ہمہ بیں اور ایک ہمہ گیر خدا کا اعتقاد ہے جس کی ذات تمام عیوب سے مبرا اور ساری کمزوریوں سے پاک ہے جس کے اندر ہر قسم کے کمالات پائے جاتے ہیں، اور جو جلال و جمال اور قدرت و کمال کی تمام صفات سے متصف ہے، ایک ایسی ہستی کو تسلیم کر لینے کے بعد رازِ حیات کی پردہ کشائی آسان ہو جاتی ہے، اور زندگی کی گرہیں کھل جاتی ہیں، اور ہمارے ہاتھ میں وہ سرا آجاتا ہے جس سے کائنات کی پیچیدہ گتھی سلجھائی جا سکتی ہے، اس کے بغیر وہم و گمان کے اندھیرے میں بھٹکنے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں، قرآن مجید نے ایمان و یقین سے محروم اشخاص کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے،

کظلمات فی بحرٍ لجیٍّ یغشٰه موج	(ان لوگوں کی مثال) ان تاریکیوں
من فوقه موج من فوقه سحاب	کی طرح ہے جو گہرے سمندر میں ہیں
ظلمات بعضها فوق بعض اذا اخرج	اس (سمندر کو) ایک موج ڈھانپے ہو
یده لم یکد یرٰها ومن لم یجعل	اس (موج) کے اوپر ایک اور موج
الله له نوراً فما له من نور،	ہو، اس کے اوپر بادل ہو، بعض
(سورہ نور رکوع ۵)	پر بعض، جب وہ اپنا ہاتھ نکالے
	تو اس کو دیکھ نہ پائے جس کو خدا
	نے روشنی نہیں دی، اس کے لئے
	کوئی روشنی نہیں،

دنیا کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس کے اول و آخر کے بہت سے صفحات غائب ہیں، صرف درمیان کے چند اوراق ہمارے سامنے ہیں، ان میں مصنف کا نام بھی درج نہیں، ان موجودہ اوراق کو سامنے رکھکر اگلے اور پچھلے گم شدہ اوراق کے مضامین اور ان کے مصنف کا پتہ چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے، مگر حال کو دیکھ کر ماضی اور مستقبل کا صحیح صحیح پتہ لگا لینا آسان نہیں ہے، اس موقع پر راقم الحروف کو خود اپنا ایک واقعہ یاد آیا، غالباً ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا، مشہور مصری مفکر ڈاکٹر بہجت وہبی کی انجمن اسلام ہال بمبئی میں تقریر تھی، میں اس زمانہ میں روزنامہ خلافت کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھا، تقریر سننے کے لئے گیا، اتفاق سے ذرا دیر میں پہنچا، تقریر کچھ ہو چکی تھی، اخبار کے لئے نوٹ لیتا رہا، لیکن نامکمل حالت میں اسے اخبار میں درج کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا، اور جو باتیں سنی تھیں، انہی پر قیاس کر کے شروع کا حصہ بھی مرتب کر لیا، صبح جب اخبارات شائع ہوئے تو تقریر کا آخری حصہ سب میں یکساں تھا، لیکن ابتدائی حصہ خلافت میں دوسرے اخبارات سے بالکل مختلف تھا جیف ایڈیٹر نے وجہ پوچھی، تو میں نے سارا قصہ سنا دیا، وہ ہنسنے لگے، اور کہا تمہارا اندازہ کیا غلط نکلا، یہ بات تو آئی گئی ہو گئی مگر مجھے خیال ہوا کہ جب مقرر کی تقریر سن کر اس کی ابتدائی میں اسی وقت اس کی گم شدہ کڑی ملانے میں اتنی بڑی غلطی ہوئی، تو کائنات کے تھوڑے سے حصہ کو دیکھکر اس کے آغاز و انجام کے اندازہ میں کس قدر غلطی ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتاب کائنات کے گمشدہ اوراق کے پتہ لگانے میں بڑی غلطیاں ہوئیں بہتوں نے عاجز ہو کر کہہ دیا کہ ہم کچھ نہیں بتا سکتے کہ پہلے کیا تھا، اور بعد میں کیا ہوگا، کسی نے ناواقفیت کی بنا پر سرے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ اس عالم کی کتاب کا کوئی مصنف نہیں ہے، یہ کائنات خود بخود وجود میں آ گئی، اور خود بخود چل رہی ہے لیکن

یہ خیال انسانی مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہے، دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی بغیر کسی بنانے والے کے نہ بنی ہے، نہ بغیر کسی چلانے والے کے چلی ہے، پھر یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ زمین آسمان، سورج، چاند، ستارے بغیر کسی بنانے والے کے بن گئے ہیں، تاریخ کے اوراق ہمارے سامنے کھلے ہیں، اس میں ایک مثال بھی ایسی نظر نہیں آتی، کہ کسی موجد کے بغیر کوئی شے وجود میں آگئی ہو، انسانی فطرت اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی، قرآن مجید نے اس حقیقت کو یوں سمجھایا ہے۔

ام خلقوا من غیر شئ ام ھم الخالقون ام خلقوا السمٰوٰت والارض بل لا یوقنون،	کیا وہ بغیر کسی شے کے خود بخود پیدا ہوگئے ہیں، یا وہ خود اپنے خالق ہیں، یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، (حقیقت یہ ہے کہ) وہ ایمان ویقین سے
(طور)	محروم ہیں،

واقعہ یہ ہے کہ انسان نہ اپنا خالق ہے نہ کائنات کا، وہ تو خود قوانین قدرت کے اندر اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ اسے نہ اپنی زندگی پر اختیار ہے نہ موت پر، اس کی مجبوری و محتاجی قدم قدم پر نمایاں ہے، وہ ہوا کا محتاج ہے، پانی کا محتاج ہے، غذا کا محتاج ہے، لباس کا محتاج ہے، الغرض سراپا احتیاج ہے، جو خود اپنا وجود بھی قائم نہ رکھ سکتا ہو وہ دوسروں کو کس طرح وجود میں لا سکتا ہے، اور کیسے اُن کی پرورش کا سامان کرسکتا ہے، انسان کے علاوہ دنیا کی اور چیزوں پر نظر ڈالئے، عظیم الشان پہاڑ، لمبے چوڑے دریا، بلند و بالا ستارے، وسیع سیارے، سب انسان سے زیادہ مجبور نظر آتے ہیں، آدمی کو تو کچھ اختیار بھی حاصل ہے، مگر یہ مفرد نظام سے سرمو انحراف

ں کر سکتے، سورج اور چاند کے طلوع و غروب کے ضابطے مقرر ہیں، زمین بے چون و چرا روش کر رہی ہے، پہاڑ اور دریا اپنے کام میں لگے ہیں، غور سے دیکھئے یہ کارخانۂ عالم ت بنا کر کھڑا ہی نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ چل بھی رہا ہے، اور بڑے مرتب اور منظم طریقے سے ر کوئی تو اس کا چلانے والا ہونا چاہئے، جب کوئی معمولی گاڑی بھی کسی ہوشیار ڈرائیور بغیر نہیں چل سکتی، تو زمین و آسمان کی یہ عظیم الشان گاڑی بغیر کسی علیم و قدیر ہستی کے کیونکر ل سکتی ہے۔

کائنات پر جب ہم غور کرتے ہیں، تو اس کی ہر چیز میں اعلیٰ درجہ کی صناعی اور غیر معمولی یک جہتی نظر آتی ہے، اشیاء کی تخلیق اور نشو و نما ایک اٹل اور مستحکم ضابطہ کے ماتحت ہے، اور طاط و ارتقاء اور فنا و بقا کا ایک ہمہ گیر قاعدہ ہر موقع پر عمل کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، انسان اپنی ذات پر غور کرے، تو اسے یہاں بھی اصول و قوانین کی منظم کارفرمائی نظر آئے گی، اس اندر کی مشین اس باقاعدگی کے ساتھ کام کر رہی ہے کہ اگر ایک رگ بھی اپنا کام بند دے، یا قاعدہ کی پوری پابندی نہ کرے تو جسم امراض و آلام کی آماجگاہ بن جائے، کیا یہ اہدہ ہمیں خالق کائنات اور مدبر عالم کے اعتراف پر مجبور نہیں کرتا اور کیا اس کے بعد بھی ہمارا ضمیر یں کہتا کہ اس عالم کا بنانے اور چلانے والا بے انتہا طاقت و اقتدار، علم و اختیار اور و تدبیر کا مالک ہے، اور اس کے اندر تخلیق و تحسین اور اصلاح و تعمیر کی غیر معمولی قدرت ہے،

نے یہ کارخانۂ عالم بڑی نفاست اور دقت نظری کے ساتھ بنایا، اور بڑی خوبی اور ش اسلوبی کے ساتھ اسے چلا رہا ہے، اس کا ہر قاعدہ مستحکم اور ہر اصول اٹل ہے، دنیا ذرہ ذرہ اس کی قدرت و حکمت، علم و نظر اور عقل و بصیرت کا شاہد ہے، فلسفہ کی اصطلاح یہی تخلیق عالم کا باعث اولین اور علت العلل ہے، اور مذہب کی زبان میں اسی کو خدا

یا اللہ کہتے ہیں،

یہ سچ ہے کہ خدا ہمیں دکھائی نہیں دیتا ہے لیکن اس سے اس کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے کسی چیز کے نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود نہیں ہے، ہوا کو ہم کہاں دیکھتے ہیں لیکن اس کی موجودگی سے کون انکار کر سکتا ہے، قوت کس کو نظر آتی ہے جسم کا درد کون دیکھ سکتا ہے لیکن نہ دیکھ سکنے کے باوجود اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے، اور اثرات وعلامات اس کا پتہ دیتے ہیں اسی طرح خدا اگرہمیں نظر نہیں آتا ہے۔ اور ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہے، مگر کائنات کی ہر شے اس کے وجود کی شہادت دے رہی ہے، مخلوق خالق کا پتہ دیتی ہے۔ اور وجود موجد کا یقین دلاتا ہے، اس حقیقت کو قرآن مجید نے فلسفہ کی دقیق اصطلاحات کے بجائے عام فہم انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ بات دلوں کے اندر اتر جاتی ہے، اور خواص و عوام یکساں اس سے متاثر ہوتے ہیں، اس نے بتایا کہ خالق کائنات، اور مدبّر عالم کے وجود میں کوئی شبہہ نہیں ہے، مادی آنکھیں اس کے دیدار کی طاقت نہیں رکھتی ہیں لیکن اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے تو آسمان سے زمین تک ہر چیز اس کے وجود کا اعلان کر رہی ہے،

انّ فی خلق السّمٰوٰتِ و	آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور
الارض و اختلاف اللیل و	شب و روز کے الٹ پھیر میں عقلمندوں
النہار لآیات لاولی الالباب۔	کے لئے نشانیاں ہیں،

(آل عمران رکوع ۲۰)

جانوروں پر غور کرے تو ان کے حالات بھی قدرت خداوندی کا پتہ دیتے ہیں،

وانّ لکم فی الانعام لعبرۃ	اور تمھارے لئے جانوروں کے اندر
نسقیکم من بطونہا من بین	سامان عبرت ہے، ہم ان کے پیٹوں

فرث ودم لبنًا خالصًا سائغًا	سے گوبر اور خون کے درمیان سے
للشّٰربین،	خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں
(نحل۔ رکوع - ۹)	کے لئے خوشگوار ہے،

آسمان کی طرف کوئی نگاہ اٹھائے اور چمکتے ہوئے سورج اور نورانی چاند پر نظر ڈالے تو اُسے قدرت وتدبیر الٰہی کا ایسا جلوہ نظر آئے، کہ بے ساختہ پکار اٹھے۔

تبارکَ الّذی جعلَ فی السّمآءِ	بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمانوں
برُوجًا وجعَل فیھا سِرَاجا	میں برج بنائے اور اُن کے اندر چراغ
وقمرًا منیرًا،	(سورج) اور روشنی دینے والا چاند
(فرقان۔ رکوع-۶)	بنایا،

وہ زمین کی حالت پر غور کرے کہ اس کے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں ہیں، اور کتنے ذخائر پوشیدہ ہیں، نیز اپنی ذات پر غور کرے، اور نفس کی قوتوں کا جائزہ لے، تو خالقِ عالم کی بے مثال قدرت کا یقین ہوجائے،

وفی الارض آیات للموقنین	یقین کرنے والوں کے لئے زمین کے
وَفی انفسکُمْ افلاتبصرُوْنَ	اندر نشانیاں ہیں، اور تمھارے نفوس
(ذاریات رکوع-۲)	کے اندر بھی قدرتِ خداوندی کی
	نشانیاں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

کارخانۂ عالم پر نظر ڈالنے سے نہ کوئی نقص نظر آتا ہے، نہ کہیں بے قاعدگی محسوس ہوتی ہے،

مَاترٰی فی خلقِ الرّحمٰن مِنْ	تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں

تفاوت فارجع البصر هل	دیکھ گے نگاہ دوڑا کیا تم کوئی فطور
تری من فطور ثم ارجع البصر	دیکھتے ہو پھر دوبارہ پلٹ کر نگاہ ڈالو
کرتین ینقلب الیک البصر	نگاہ تمہارے پاس پلٹ کر اور تھک کر
خاسئًا وھو حسیر،	واپس آجائے گی،

(ملک ۔ رکوع ۔ ۱)

کائنات کی جس چیز پر غور کرو گے، اس کی تخلیق میں عجیب و غریب صناعی اور استحکام نظر آئے گا، اور زبان سے بے اختیار نکلے گا۔

صنع اللّٰہ الّذی اتقن کل شیئٍ (نمل ۷) اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو بڑی مہارت اور استحکام کے ساتھ بنایا ہے،

قرآن مجید میں اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں مشاہدۂ کائنات کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور عالم کے ان حیرت انگیز جلووں کو دکھا کر پوچھا گیا ہے کہ

افی اللہ شک فاطر السمٰوٰت	کیا خدا کے بارے میں کوئی شک ہے،
والارض، (نحل ۷)	جو آسمان اور زمین کا بنانے والا ہے،

توحید | اس میں کوئی شک نہیں کہ جو بھی اس کائنات پر غور کرے گا وہ اس کے موجد و خالق کے اعتراف پر مجبور ہوگا، ناممکن ہے کہ یہ کارخانۂ عالم اس نظم و ضبط اور اس خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ بغیر کسی علیم و بصیر اور حکیم و قدیر کی نگرانی کے چل رہا ہو، اس اعتراف کے ساتھ اسے یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس کا کوئی شریک نہیں، وہ اکیلا اس کائنات کا مالک ہے، اسی نے اسے بنایا ہے، اور وہی اسے چلا رہا ہے،

الا لہ الخلق والامر
(اعراف - ۵۳)

خوب سمجھ لو کہ تخلیق بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے اور حکمرانی بھی اسی کی ہے،

اللّٰہ لا الٰہ الّا ھُوَ الحی القیّوم لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم لہٗ ما فی السّمٰوٰت وما فی الارض
(بقرۃ - ۳۴)

اللہ کے سوا وہ کوئی معبود نہیں ہے، وہ ہمیشہ زندہ ہے، ورسارے عالم کو سنبھالے ہوئے ہے، اُسے نہ اونگھ آتی ہے، نہ نیند، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اسی کی ملک ہے،

وَلہٗ اسلم مَنْ فی السّمٰوٰت وَالْاَرض ۔ (آل عمران - ۹)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کے سامنے سرنگوں ہے،

لہٗ ملک السّمٰوٰت والارض والی اللّٰہ ترجع الامور،
(حدید - ۱)

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، اور اللہ ہی کی ذات تمام معاملات کا مرجع ہے،

تبارک الّذی بیدہ الملک وھو علی کل شیئ قدیرہ
(ملک - ۱)

بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں فرماں روائی ہے، اور ہر چیز پر قادر ہے،

سارا نظام عالم خدا کی یکتائی کی گواہی دے رہا ہے، زمین سے آسمان تک جدھر نظر ڈالو ایک باقاعدگی نظر آئے گی کہیں بھی قاعدہ و ضابطہ سے سرِ مو انحراف محسوس نہ ہوگا،

سورج پابندی کے ساتھ ایک مقررہ وقت پر نکلتا ہے، ڈوبتا ہے جس مقام پر طلوع وغروب کا جو وقت ہے، ہزاروں سال میں بھی اس میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں ہوتا، چاند کی گردش کا ایک پختہ اصول ہے، ایک باریک ٹیڑھی لکیر سے رفتہ رفتہ بڑھ کر پورا گول ہو جاتا ہے، پھر کم ہوتے ہوتے اسی طرح ایک منحنی لکیر بن جاتا ہے،

والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم، (سورۃ یٰسین - ۳۹)	اور چاند کی ہم نے منزلیں متعین کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ لوٹ کر پھر ایک پرانی پتلی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے،

ہلال نو ۲۹ یا ۳۰ کو ہر شام دکھائی دیتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ۲۸ کو نظر آجائے یا ۳۱ تک مؤخر ہو جائے، بے شمار ستارے اور سیارے فضائے لامتناہی میں رواں دواں ہیں لیکن کوئی کسی سے ٹکراتا نہیں سب اپنے اپنے دائرے کے اندر ہی چکر لگاتے رہتے ہیں،

کل فی فلک یسبحون ہ (یٰسین)	سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں،
لاالشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا الیل سابق النہار ہ (یٰسین)	سورج کو حق نہیں پہنچتا کہ چاند کو پالے، نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے،
الشمس تجری لمستقر لھا ذٰلک تقدیر العزیز العلیم (یٰسین)	سورج اپنے مستقر پر چلتا رہتا ہے، یہ غالب اور علم والی ذات کا اندازہ کردہ

دیکھو کس طرح دن سے رات اور رات سے دن نمودار ہوتا ہے، اور ہر ایک کا ایک حساب ہے جس سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتا، روشنی کی رفتار اور ہے اور آواز کی اور ہے، موسم کسی ترتیب کے ساتھ

نے ہیں جس علاقے میں جو وقت اور کیفیت ہے، صدیوں سے وہی حال ہے، ہوائیں کیسے اصول کے مطابق چل رہی ہیں، بارش کے کیسے ضابطے مقرر ہیں، پودے کس طرح اگتے اور بڑھتے ہیں، اور کس طرح برگ و بار لاتے ہیں، جانوروں اور آدمیوں کے توالد اور تناسل کا کیا باقاعدہ انتظام ہے، انسانی جسم کے اندر ہر عضو کس طرح اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ دماغ کا دائرہ کار الگ ہے، دل کا الگ، معدہ اپنا کام کررہا ہے جگر اپنا، کوئی کسی کے دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتا، جس قدر باریکی سے غور کروگے، خدا کی عظمت و قدرت، اور علم و حکمت دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاؤگے، اصول و قواعد کی باقاعدگی ہمیں اس یقین پر مجبور کرتی ہے کہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (قتال ۳)	اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے،
وَلَہُ الْکِبْرِیَاءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (جاثیہ ۴)	اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی عظمت و کبریائی ہے،

وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے،

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ۔ (اعراف ۷)	تخلیق اور حکمرانی سب اسی کی ہیں، ساری کائنات اس کی مطیع و فرمانبردار ہے،
وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (مومن ۷)	وہ جو چاہتا ہے چشم زدن میں ہو جاتا ہے،

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (نور ۵) آسمان و زمین اسی کے نور سے منور ہیں،

نظام عالم کی یکتائی خلّاق عالم کی یکتائی کی شہادت دے رہی ہے، اگر اس کائنات کے کئی مالک ہوتے، تو دنیا کی یہ باقاعدگی، اور ہم آہنگی باقی نہیں رہتی، ہر ایک اپنا حکم چلاتا تو سارا عالم

زیروزبر ہوجاتا، قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے،

لوکان فیھما اٰلِھۃٌ الّا اللّٰہ لَفَسَدَتا فسُبحانَ اللّٰہ رَبِّ العَرشِ عَمّا یَصِفُوْنَ، (انبیاء-ع-۲)	اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا اورمعبود ہوتے تو وہ دونوں بگڑکر رہ جاتے، پس اللہ رب العزت ان تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ مشرک بیان کرتے ہیں۔

جس طرح ایک ادارے کے کئی یکساں اختیار رکھنے والے ناظم، کسی کارخانے کے کئی منیجر اور کسی ملک کے کئی بادشاہ نہیں ہوسکتے، اسی طرح اس دنیا کے کئی مالک نہیں ہوسکتے، اسی لئے قرآن مجید خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کو ثابت کرنے کے ساتھ شرک کی نفی پر بھی زور دیتا ہے، اس نے شرک کی تمام راہیں مسدود کر دیں، یہاں تک کہ روزمرہ نماز کے اندر تشہد میں اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے ساتھ وَحْدَہٗ (وہ اکیلا ہے) اور اسکے بعد لاشریک لَہٗ (اس کا کوئی شریک نہیں) کا اضافہ کردیا گیا، حج کے موقع پر اللّٰھُمَّ لبّیکَ کے ساتھ لاشریک لک کا اعلان بھی ضروری قرار دیا، تاکہ ذہن شرک کے خیال سے پاک رہے، اس اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے اقرار کے بعد بھی بہت سے لوگ شرک میں مبتلا ہوجاتے ہیں، بعض خیروشر کی کشمکش دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا نیکی اور بدی کی قوتوں کے درمیان تقسیم ہے، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خیروشر کا وجود اضافی ہے نیکی بدی کے فیصلے کا انحصار استعمال پر ہے کسی کو بے گناہ مارا جائے، تو یہ شر ہے لیکن کسی مجرم کو سزا دی جائے تو خیر ہے، بے سبب کسی کا سامان چھین لیا جائے تو یہ ڈاکہ ہے لیکن کسی محتکر (ہورڈر) کا سامان چھین کر ضرورتمندوں کے درمیان تقسیم کردیا جائے تو یہ کارِ ثواب ہے، امن پسند شہریوں کو گولی کا نشانہ بنایا جائے

تو ظلم ہے لیکن باغیوں اور قاتلوں کے ساتھ یہی سلوک مقتضائے عدل ہے، الغرض خیر و شر کسی شے یا عمل میں نہیں ہے، بلکہ انسان کی نیت اور موقع و محل کے اعتبار سے کام محمود و مذموم بن جاتے ہیں،

بعض لوگ شئون و احوال کی نیرنگیوں میں یکرنگی کو محسوس نہ کر سکے، اور ہر جلوے کو ایک نئے خدا کی تجلی سمجھے اور ایک معبود کی جگہ سینکڑوں معبودوں کے سامنے سر جھکانے لگے، شرک کی اس کے علاوہ بھی بہت سی صورتیں ہیں، بہت سے لوگ خدا کو دنیاوی بادشاہوں کی طرح سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس طرح بادشاہ کو کاروبارِ سلطنت کے لئے وزیروں اور معاونوں کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح خدا نے بھی اپنے وزیر اور مشیر مقرر کر رکھے ہیں لیکن ان کا یہ اندازہ صحیح نہیں ہے،

ماقدروا اللہ حق قدرہٖ　　انھوں نے اللہ کا صحیح اندازہ

(انعام ۱۱)　　نہیں لگایا،

بادشاہ کی قوت محدود اور علم ناقص ہوتا ہے، لیکن خدا کی قوت لامحدود ہے، ہر چیز اس کی نظر میں ہے، وہ علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے، ہر چیز کی فرماں روائی اس کے ہاتھ میں ہے،

بیدہٖ ملکوت کل شیئٍ (یٰسٓ ۵)　　اسی کے دستِ قدرت میں ہر چیز ہے،

ولہ مافی السمٰوٰت والارض　　اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے

(نحل ۷)　　سب اسی کے تابع فرمان ہے،

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اللہ کے بعض نیک بندے اس کی بارگاہ میں ایسا تقرب رکھتے ہیں، کہ خدا ان کی سفارش ٹال نہیں سکتا، اسی لئے خدا کے ساتھ ان کی بندگی بھی

ضروری سمجھتے ہیں، کہتے ہیں :-

مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ، (زمر-ع-۳)	ہم ان کو خدا نہیں سمجھتے لیکن ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں

یہ ان کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کرتے ہیں ، اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح نجات حاصل کرلیں گے لیکن اللہ فرماتا ہے، شفاعت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، للہ الشفاعۃ جمیعا (زمر) اُن کے معبودانِ باطل اور خود تراشیدہ بت کیا سفارش کریں گے ، سفارش تو فرشتے اور پیغمبرانِ برحق بھی اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتے ہیں، مَنْ ذالذی یشفع عندہ الا باذنہٖ وہ اس کی اجازت کے بغیر بات بھی نہیں کرسکتے، لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن (سورۂ نبا) خدا کے کتنے ہی مقبول بندے ہوں ، بہرحال بندے ہیں بڑے بڑے پیغمبر اپنی بندگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کے سلسلے میں فرمایا ،

لن یستنکف المسیح ان یکون عبد اللہ ولا الملٰئکۃ المقربون (نساء ۲۴)	مقرب فرشتے اور حضرت مسیحؑ خدا کی بندگی میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ،

خود سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ

قُلْ انّمآ انا بشرٌ مثلکُم یوحیٰ الیّ ، (کہف-ع-۱۲)	کہدو میں تمہارا جیسا آدمی ہوں، ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے،

اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنے کے لئے نمازوں میں تشہد کے موقع پر رسالت سے پہلے عبدیت کا اقرار کرایا گیا، اور کہلایا گیا اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ ،

یہ سارا انتظام اس لئے کیا گیا تاکہ آپؐ کی رسالت میں کوئی الوہیت کا رنگ نہ بھر سکے، اور

گزشتہ زمانوں کی طرح نبوت میں خدائی شان نہ پیدا کی جا سکے، حضرت مسیحؑ کی طرح نہ کوئی خدا کا بیٹا کہا جا سکے، اور نہ بنی اسرائیل کی طرح کوئی،

نحنُ ابناء الله واحباءہٗ (مائدہ۔۳) ہم خدا کے بیٹے اور اسکے چہیتے ہیں)

کا نعرہ لگا سکے، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارہ میں اتنی فکر تھی کہ بار بار اپنی بشریت کا اعلان فرماتے تھے، کہ میں عبداللہ کا بیٹا محمد خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں[1] آپ کو یہ بھی گوارا نہ تھا، کو کوئی آپ کو سید (آقا) کہے، فرماتے تھے سید تو اللہ ہے[2] خدا کے سامنے بار بار اپنی عاجزی اور بے چارگی کا اظہار فرماتے تھے، عزیزوں اور اہل خاندان سے خاص طور پر فرماتے تھے، کہ میں خدا کے یہاں تمھارے لئے کچھ نہیں کر سکتا[3] آپ معصوم تھے، اللہ کی طرف سے رحمت ومغفرت کا وعدہ بھی تھا، مگر بایں ہمہ احساس بندگی کا یہ حال تھا کہ فرمایا کہ کوئی اپنے اعمال کے بھروسہ پر جنت نہیں جا سکتا ہے، جب تک کہ خدا کی رحمت دستگیری نہ کرے، حضرت عائشہؓ نے پوچھا آپ بھی یا رسول اللہ فرمایا ہاں میں بھی، سوائے اس کے کہ اللہ اپنی رحمت سے ڈھانپ لے[4] آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک بار کسی شادی کے موقع پر بچیاں گا رہی تھیں، اس کے دوران ان کی زبان سے نکلا :-

وفینا رسول یعلم ما فی غدٍ ہ — ہمارے درمیان ایک ایسا رسول ہے جو کچھ کل پیش آنے والا ہے اُسے جانتا ہے،

آپنے فوراً انھیں ٹوکا اور فرمایا یہ نہ کہو[5]، وحی الٰہی نے بھی اعلان کیا کہ

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ابو داود، کتاب الادب وادب المفرد، امام بخاری باب هل یقول سید ی، [3] تفسیر وانذر عشیرتک الاقربین، [4] صحیح مسلم [5] صحیح بخاری کتاب النکاح،

قُلْ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَائِنُ	کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ
اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ ۝	میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں،
(انعام - ۵)	اور میں غیب نہیں جانتا ہوں،
وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا	اور غیب کی کنجیاں اسی (اللہ)
یَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ،	کے پاس ہیں، اس کے سوا انھیں
(انعام - ۷)	اور کوئی نہیں جانتا ہے،

انکسار و احتیاط کی حد یہ ہے کہ آپ نے اپنی جو مہر بنوائی تھی، اس میں اپنا نام سب سے نیچے رکھا تھا، اس کے اوپر رسول، اور سب سے اوپر اللہ، گویا یہ اس کا اظہار تھا کہ مجھے جو کچھ شرف حاصل ہوا ہے، وہ رسالت کی وجہ سے ہے، اور رسالت اللہ کی دین ہے،

وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ	اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت
یَّشَاءُ (آلِ عمران)	کے لئے خاص کر لیتا ہے،
اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ	اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت
(انعام)	سے کس کو سرفراز کرے،

ذات و صفات اوپر کی سطور میں خدا کے وجود، اور اس کی توحید کا ذکر ہو چکا ہے، انسان کے لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے، کہ دنیا کی یہ ساری چہل پہل ایک بالادست ہستی کی رہینِ منت ہے، ہماری نگاہیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں لیکن ہمارا دل اس کے وجود کی شہادت دیتا ہے، صانعِ عالم کا اعتراف ہمارے وجدان کا تقاضا اور ہماری فطرت کی پکار ہے،

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ	یہی اللہ کی وہ فطرت (بناوٹ) ہے

علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون ، (نحل)

جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے ، اللہ کی بناوٹ میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا ، یہی سیدھا دین ہے ، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں ،

لیکن اس نادیدہ ہستی کا تصور کس طرح کیا جائے جو برتر از خیال وقیاس وگمان و وہم ، جو جمال آرائی وجلوہ نمائی کے باوجود مستور ہے[1]

انسان کی پروازِ خیال اس تک پہونچنے سے قاصر ہے ، مگر اپنی بےبسی اور بیچارگی کے باوجود اسے آرزوئے دید ہے ، اس کو اپنے بازوؤں کی سستی اور کمند فکر کی کوتاہی کا اعتراف ہے لیکن پھر بھی اس بام بلند تک رسائی کی تمنا سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے ، اس کا یہ جذبہ منشائے فطرت کے موافق اور مقصد تخلیق کے مطابق ہے ، انسان کو خدا نے اپنا نائب (خلیفہ) مقرر کیا ہے ، پھر اگر اسے آقا کے دیدار کی تمنا اور مالک سے ملاقات کی آرزو ہے ، تو کیا بیجا ہے ؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ انسانی نگاہیں اس مستور ازل کے جلوے کی تاب نہیں رکھتیں (لا تدرکہ الابصار (سورۂ انعام) عام انسانوں کا کیا ذکر ہے پیغمبران اولوالعزم بھی اس کی ایک جھلک نہ دیکھ سکے ، حضرت موسیٰ کا قصہ اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے بالواسطہ تجلی کی بھی تاب نہ لاسکے اور بیہوش ہوکر گر پڑے ، اور پہاڑ چور چور ہو گیا[2]

پھر جب پیغمبروں کا یہ حال ہے تو دوسرے آدمیوں کی کیا بساط ہے کہ نظر ڈال سکیں ، وہ

---

[1] آسی غازی پوری نے کیا خوب کہا ہے ،

بے حجابی کا یہ عالم ہے کہ ہر شے سے ہے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

[2] حضرت موسیٰ کا پورا واقعہ سورۂ اعراف میں ہے ،

ہمارے دل کے قریب اور ہماری شہرگ سے بھی قریب ہے اس کی تشریف فرمائی دشوار نہیں ہے اپنے ہی حوصلہ کی تنگی اور اپنی ہی نظر کی کوتاہی مانع نظارہ ہے، اس لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ دیدار ذات کے بجائے تصور صفات پر اکتفا کی جائے، گو بے چون وچگوں ہستی کی صفات کا تعین بھی مشکل ہے، انسان کے بس میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمام صفات حسنہ اس سے وابستہ کردے، وہ خالق ورازق ہے، وہ رب کریم ہے، وہ علیم و بصیر ہے، وہ رحمن ورحیم ہے لیکن اس کے ساتھ وہ صاحب عظمت وجلال ہے، اس کی گرفت شدید اور اس کا انصاف بے لاگ ہے، وہ حاکم وغالب ہے،

قرآن مجید میں بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا ہے، کہ اسکی صفات لا محدود ہیں،

ولو ان ما فی الارض من	اگر زمین کے سارے درخت قلم
شجرۃ اقلام والبحر یمدہ	بن جائیں اور ایک سمندر کے علاوہ
سبعۃ ابحر ما نفدت کلمٰت	سات اور سمندر سیاہی بن جائیں
اللہ،	تب بھی اللہ کی باتیں کبھی ختم نہ
(کہف رکوع - ۱۲)	ہوں گی،

اس لئے خدا کی بہت سی صفات بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی کہدیا کہ سارے اچھے نام اس کے ہیں،

اللہ لا الٰہ الا ھو لہ الاسماء	اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے،
الحسنیٰ ٥ (طٰہٰ - رکوع -۱)	تمام اچھے نام اسی کے ہیں،

اس طرح قرآن مجید نے اللہ کے ساتھ ربط وتعلق کی ایک راہ نکال دی تاکہ انسان کی

بے چین روح کی تسکین کا سامان ہو جائے، عشق و شیفتگی کے لئے حسن و جمال کا مرقع سامنے آجائے جبینِ عقیدت کو اظہارِ نیاز کے لئے آستانۂ عظمت و کمال نظر آئے، اور جذبۂ عبودیت کو عرضِ حال کے لئے پیرایۂ بیان نصیب ہو لیکن ان صفات کے بیان میں اس کا خاص خیال رکھا گیا، کہ ایسے الفاظ نہ استعمال کئے جائیں جن سے ذاتِ باری مخلوق کے مشابہ ہو جائے، اسی بنا پر ماں باپ بیٹا اور بھائی وغیرہ کے الفاظ سے اجتناب کیا گیا، کیونکہ اس سے خدا کی عظمت میں کمی آتی، اور ذہن دنیوی رشتوں میں الجھ کر حقیقت سے دور ہو جاتا تصحیح خیال کے لئے متفرق آیتوں کے علاوہ ایک پوری سورہ نازل فرمائی۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ	کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز
يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا	ہے، نہ وہ باپ ہے نہ بیٹا، اس کے برابر
أَحَدٌ ۝ (سورہ اخلاص)	کا کوئی نہیں ہے،

لوگوں کو تاکید کی کہ تم اس کے لئے مثالیں نہ گڑھو، فلا تضربوا لله الامثال سورۂ نحل) اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے،) لیس کمثله شئ (سورۂ شوریٰ)

اس طرح تشبہ اور تجسم کی تمام راہیں بند کر دیں لیکن اس کے باوجود ذات و صفات کو ایسے دلآویز طریقہ سے بیان کیا کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتے ہیں، اور روح اس کے عشق میں سرشار ہو جاتی ہے، اور انسان والہانہ عقیدت کے ساتھ آقا کے حکم کی تعمیل کرتا ہے، اس کے سامنے ایک بلند نصب العین ہوتا ہے، جو اگرچہ اس کی دسترس سے دور ہوتا ہے لیکن سمندِ شوق کے لئے ہمیشہ مہمیز کا کام دیتا ہے، وہ اپنے اندر صفاتِ الٰہی کی جھلک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ تخلقوا باخلاق الله کا مظاہرہ ہو اور چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے رنگ میں رنگ دے وہ پکار اٹھتا ہے،

صبغۃ اللّٰہ ومن احسن من اللّٰہ صبغۃ، (بقرہ۔)	ہم نے اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لیا، اور اللہ سے بڑھ کر کس کا رنگ چوکھا ہے،

لیکن یہ تلقین اس خوبی سے کی گئی کہ عبد و معبود کی حدیں قائم رہیں اور ذات کے ساتھ صفات میں بھی شرک کی گنجائش نہیں رہی، خدا کی صفات اصل اور انسانی اوصاف نقل ہیں، خدا کی صفات حقیقت اور انسانی صفات مجازی شکل میں ہیں، مثلاً انسان کے اندر بھی رحم پایا جاتا ہے، مگر خدا کی رحمت سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے، وہ بھی پرورش کا کام کرتا ہے مگر خدا کی ربوبیت کی شان ہی اور ہے، وہ بھی دوسروں کو عطا کرتا ہے مگر اس کا خزانہ خدا ہی کے یہاں ہے، وہ اس سے لے کر دوسروں کو پہنچاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

انما قاسمٌ واللّٰہ یعطی،	میں تقسیم کرنے والا ہوں دیتا اللہ ہے،

جس طرح اللہ کی ذات میں کوئی شریک نہیں، اسی طرح اس کی صفات میں بھی کسی کی شرکت جائز نہیں ہے، اگر کسی کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی خیال آجائے کہ رزق کوئی دوسرا دیتا ہے، نفع نقصان کسی اور کے ہاتھ میں ہے، دعائیں کوئی دوسرا قبول کرتا ہے، تو یہ عقیدہ شرک سمجھا جائے گا، خدا کی ذات اور صفات دونوں شرکت سے مبرا ہیں اسلام کی توحید درمیانی وسائط کی بھی متحمل نہیں ہے، ارشاد ربانی ہے "مجھے پکارو میں تمھاری درخواست قبول کروں گا (ادعونی استجب لکم - سورہ مومن) میں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں، پس چاہئے کہ مجھ سے مانگیں اور مجھی پر یقین رکھیں (اجیب دعوۃ الداع اذا دعانِ فلیستجیبوا لی والیومنوا بی - بقرہ) اس لئے ہم ہر نماز میں اقرار کرتے ہیں کہ

ایاک نعبدُ وایاکَ نستعین،	خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں،

کتاب و سنت میں ان امور کے بارہ میں ایسی صفائی اور وضاحت سے کام لیا گیا ہے کہ کسی کے لئے ظاہر پر باطن کا پردہ ڈالنے کی گنجایش نہیں رہ گئی، حالانکہ ذات و صفات کے مسائل بہت نازک ہیں، اسلام سے پہلے ان مباحث نے بہتوں کو ڈگمگا دیا، کسی نے ذات کے تجرد پر اتنا زور دیا، کہ صفات کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا کسی نے صفات کی اہمیت اتنی بڑھائی کہ ہر صفت نے ایک خدا کا روپ اختیار کیا، اور شرک و بت پرستی کے دروازے کھل گئے لیکن اسلام نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کیا کہ ذات الٰہی کے ساتھ والہانہ تعلق کی راہ کھل آئی لیکن تجسم کی ہوا بھی نہیں لگنے پائی، صفات نے بندوں کے لئے مالک سے ربط و شیفتگی کی راہیں کھول دیں، مگر نہ شرک کو سر اٹھانے کا موقع ملا، نہ صورت گری کی گنجایش باقی رہی نہ عوام و خواص کے لئے عقائد کے الگ الگ خانے بننے پائے، عالم و جاہل، خواص و عوام سب کے لئے ایمان باللہ کی ایک ہی صورت ہے، ایمان اپنی کمیت میں ناقابلِ تقسیم ہے، البتہ مجاہدہ اور حسنِ عمل سے اس کی کیفیت میں اضافہ و ارتقا ہو سکتا ہے، اور ہوتا رہتا ہے، علماء و حکماء دلائل و براہین کے ذریعہ اپنے یقین کو مزید مستحکم کر سکتے ہیں، اور اصحاب سلوک و طریقت ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ اپنے ایمان کو جلا دے سکتے ہیں، اسلام نے کسی کے لئے ترقی کی راہ بند نہیں کی ہے، جو جتنا آگے بڑھنا چاہے بڑھ سکتا ہے الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا لیکن فلاسفہ و متکلمین کے دلائل ہوں یا اصحابِ طریقت کے کشف کسی کو کتاب و سنت کی تصریحات سے تجاوز کی اجازت نہیں ہے، دلائل و مشاہدات پر انسانی افکار و خیالات اور جذبات و میلانات کا اثر پڑتا ہے، نہ عقل آزاد ہوتی ہے نہ کشف ہماری تاریخ عقل و کشف کی غلطیوں کے واقعات سے پُر ہے، اس لئے ان ذرائع کو یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے، ایمان و یقین کا سزاوار وہی علم ہے جو وحی الٰہی سے حاصل ہوا ہو اور لسانِ نبوت نے جس کی تصدیق کی ہو،

شیخ بوعلی سینا اور اسکے علمی کارنامے

از جناب ڈاکٹر شفقت اعظمی صاحب لٹریری ریسرچ یونٹ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگ

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ فلسفہ وحکمت کی تاریخ کا عہد زریں قرا جاسکتا ہے، کیونکہ ابونصر فارابی، ابن مسکویہ، ابوزکریا رازی ابن ہیثم، امام غزالی، ابوریحان البی اور شیخ بوعلی سینا جیسی نادرہ روزگار شخصیتیں اسی عہد روشن میں آسمان علم وفن پر مہر وما بن کر چمکیں، ان میں بوعلی سینا خاص طور پر اپنی غیر معمولی قوت حافظہ، گوناگوں علمی فضائل کمالات، اور کثرت تصانیف میں عدیم النظیر تھا، گو اس کا آفتاب عظمت مطلع مشرق پر ہوا لیکن آج تمام یورپ ابوی سینا (Avicenna) کے نام اور اس کی شہرت وعبقر کے غلغلہ سے گونج رہا ہے، اس کی گراں قدر تصنیف القانون فی الطب مدتوں طبی با سمجھی جاتی رہی اور دنیا کی بکثرت زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے، بلاشبہ ابن سینا بڑ جامع اور ہمہ جہت شخصیت کا حامل تھا، وہ بیک وقت فلسفی، طبیب، ادیب، شاعر اور ای معاملہ فہم مدبر ومفکر سب ہی کچھ تھا، خصوصاً اس نے طب عربی کو معراج کمال پر پہونچا د ان ہی تمام کمالات وامتیازات کے باعث زبان خلق نے اس کو شیخ الرئیس اور معلم ثا (بعد از ارسطو) کا لقب عطا کیا۔

بوعلی سینا کے بارے میں تفصیلات کا سب سے مستند ماخذ وہ مختصر رسالہ ہے، جس ابتدائی نصف حصہ خود شیخ نے مرتب کیا اور آخری نصف ابوعبید جوزجانی نے سپرد قلم

ابو عبید جوزجانی جو یورپ میں جوردس کے نام سے مشہور و متعارف ہے، شیخ کے ارشد تلامذہ میں سے تھا، وہ کامل پچیس برس تک شب و روز ابن سینا کی خدمت میں رہا ہے، اس کی درخواست پر ابن سینا نے اپنے جو حالات بیان کئے ہیں[1]، وہ اس نے خود نوشت سوانحعمری کے طور پر رسالۂ مذکور کے آغاز میں دیدیئے ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ شیخ کے حالات میں اس رسالہ کو ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں بتمام و کمال اور قفطی نے اخبار الحکما میں ملخص کر کے نقل کر دیا ہے، اس رسالہ کا اصل نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے، بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے تمام تر اسی رسالہ کی بنیاد پر شیخ کے سوانح و کمالات اور تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے، اس کے علاوہ جن ماخذ میں تلاش و تفحص کے بعد شیخ کا تذکرہ مل سکا ان کے نام یہ ہیں، ابن خلکان (ج ا ص ۱۹۰) تاج التراجم قطلوبغا (ص ۱۹) ابو الفداء (ج ۲ ص ۱۶۱) روضات الجنات (ص ۲۴۲) خزانۃ الادب (ج ۳ ص ۴۶۶) تاریخ مختصر الدول (ص ۳۲۵) اور تاریخ فلاسفۃ الاسلام لطفی جمعہ، ابھی تک اردو میں شیخ بو علی سینا کے ساتھ باایں ہمہ جلالت مرتبت و علوے شان خاطر خواہ اعتنا نہیں کیا گیا ہے، ذیل کی سطور اسی نقص اور خلا کو پر کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے،

ولادت اور تعلیم و تربیت شیخ ابو علی حسین بن عبد اللہ ابن سینا ۳۷۰ھ میں نواح بخارا کے ایک بڑے گاؤں خرمیثن میں پیدا ہوا، تعلیم و تربیت کی ابتدا قرآن مجید اور علم ادب سے ہوئی، دس سال کی عمر میں اس نے ان دونوں علوم میں پختگی حاصل کر لی، اس کے بعد حساب اور جبر و مقابلہ کا بڑا حصہ حفظ کر لیا، ریاضی کے ساتھ فقہ کی تحصیل شیخ اسماعیل زاہد سے کی، اسی اثناء

---

[1] اخبار الحکماء قفطی ص ۴۶۸،

میں حسن اتفاق سے مشہور حکیم اور فلسفی ابو عبد اللہ الناتلی کا بخارا میں ورود ہوا، شیخ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے، پہلے منطق اور پھر اقلیدس و مجسطی میں دسترس حاصل کی اور بقول ابن خلکان اپنی وہبی ذہانت سے ان علوم میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ خود اپنے استاذ پر بھی گوے سبقت لے گیا[1] ناتلی کے خوارزم چلے جانے کے بعد شیخ نے طبعیات اور الٰہیات کی کتابیں خود پڑھنی شروع کیں، اور ان کے پیچیدہ مسائل کو اپنے غیر معمولی شغف اور انہماک سے حل کیا۔

اس کے بعد شیخ کو علم طب کا شوق پیدا ہوا اور اس کی تحصیل اس نے ایک مسیحی استاذ عیسیٰ بن یحییٰ اور مشہور طبیب الحسن بن نوح القمری سے کی،[2] اور پھر تھوڑی مدت میں جبکہ اس کی عمر صرف سولہ[3] سال کی تھی، طب میں اس قدر کمال پیدا کر لیا کہ

اصبح فیہ عدیم القرین فقید المثل	وہ اس فن میں فقید المثال اور عدیم النظیر
واختلف الیہ فضلاء ہذا الفن	ہو گیا، اور اس کے پاس بڑے بڑے اطباء
وکبراءہ یقرؤن علیہ انواعہ[4]	اور فضلاء آکر طب کی تعلیم حاصل کرنے لگے،

علم طب میں اس غیر معمولی مہارت کا سبب یہ تھا کہ جب اس نے اپنی عنان توجہ اس فن کی طرف منعطف کی تو بقول خود کبھی پوری رات نہیں سویا، اور دن کو بھی اس کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہ تھا، شیخ کے انہماک علمی اور شبانہ روز مصروفیت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ رات میں چراغ سامنے رکھ کر مطالعہ شروع کر دیتا اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو نبیذ کا ایک پیالہ پی لیتا، اس حد سے بڑھے ہوئے شوق مطالعہ کا نتیجہ یہ تھا کہ رات کو جب کسی

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۔ [2] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲ ۔ خود شیخ کے بیان میں فن طب میں کسی استاد سے فیضیاب ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔ [3] روضات الجنات ص ۲۴۳ [4] عیون الانباء ج ۲ ص ۴،

ہ مسئلہ پر غور کرتے کرتے سو جاتا تو اکثر پیچیدہ سوالات خواب ہی میں حل ہو جاتے تھے[1]
ا طرح اس کو صرف اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون میں اس قدر کمال حاصل
یا کہ پھر بقیہ عمر میں اس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

بلاشبہ تاریخ انسانی کا یہ ایک نادر واقعہ ہے، کہ اتنی کم عمری میں شیخ بوعلی سینا
طبی قابلیت کی شہرت مغرب و مشرق میں پھیل گئی، چنانچہ بخارا کا فرمانروا نوح
منصور سامانی ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا، جس کے معالجہ میں تمام اطبا ناکام
گئے، بالآخر اس نے شیخ کو طلب کیا، اس کے علاج سے امیر موصوف کو کامل شفا حاصل
ئی، اور اظہار تشکر کے طور پر اس نے شیخ کو اپنے ظل عاطفت میں لے لیا، اور اپنے
بین خاص میں شامل کیا، مزید برآں اس نے شیخ کو کتب خانہ شاہی سے استفادہ
جازت دیدی، اس کتب خانے کے بارے میں ابن خلکان رقمطراز ہیں:

كانت عديمة المثل فيها	وہ کتب خانہ عدیم المثال تھا، اس
من كل فن من الكتب المشهورة	میں ہر فن کی مشہور کتابیں موجود تھیں،
بايدي الناس وغيرها مما	جن میں بہت سی تو ایسی تھیں، جو
لا يوجد في سواها ولا سمع	اس کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی
باسمه فضلاً عن معرفته[2]	تھیں، اور کسی نے ان کا نام بھی نہیں [illegible]

شیخ نے اس کتب خانہ سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا، اور اس کی نادر الوجود کتابوں کے
قیمت فوائد ذہن نشین کر لیے، سوئے اتفاق سے اس گراں قدر کتب خانہ میں
گ لگ گئی، اور تمام ذخیرۂ فوائد خاکستر ہو گیا، بعض لوگ اس آتش زدگی کا ذمہ دار شیخ کو

---

[1] اخبار الحکما قفطی ص ۲۷۰ [2] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۹۱

یں حسن اتفاق سے مشہور حکیم اور فلسفی ابو عبد اللہ ناتلی کا بخارا میں ورود ہوا، شیخ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے، پہلے منطق اور پھر اقلیدس و مجسطی میں دسترس حاصل کی اور بقول ابن خلکان اپنی وہبی ذہانت سے ان علوم میں ایسی مہارت پیدا کر لی کہ خود اپنے استاذ پر بھی گوے سبقت لے گیا۔[1] ناتلی کے خوارزم چلے جانے کے بعد شیخ نے طبعیات اور الٰہیات کی کتابیں خود پڑھنی شروع کیں، اور ان کے پیچیدہ مسائل کو اپنے غیر معمولی شغف اور انہماک سے حل کیا۔

اس کے بعد شیخ کو علم طب کا شوق پیدا ہوا اور اس کی تحصیل اس نے ایک مسیحی استاذ عیسیٰ بن یحییٰ اور مشہور طبیب الحسن بن نوح القمری سے کی۔[2] اور پھر تھوڑی مدت میں جبکہ اس کی عمر صرف سولہ سال کی تھی، طب میں اس قدر کمال پیدا کر لیا کہ

اصبح فیہ عدیم القرین فقید المثیل	وہ اس فن میں فقید المثال اور عدیم النظیر
واختلف الیہ فضلاء ھذا الفن	ہو گیا، اور اس کے پاس بڑے بڑے اطباء
وکبراء لا یقرؤن علیہ انواعہ[3]	اور فضلاء آکر طب کی تعلیم حاصل کرنے لگے

علم طب میں اس غیر معمولی مہارت کا سبب یہ تھا کہ جب اس نے اپنی عنان توجہ اس فن کی طرف منعطف کی تو بقول خود کبھی پوری رات نہیں سویا، اور دن کو بھی اس کے علاوہ کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔[4] شیخ کے انہماک علمی اور شبانہ روز مصروفیت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ رات میں چراغ سامنے رکھ کر مطالعہ شروع کر دیتا اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو نبیذ کا ایک پیالہ پی لیتا، اس حد سے بڑھے ہوئے شوق مطالعہ کا نتیجہ یہ تھا کہ رات کو جب کسی

---

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۰ [2] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲ خود شیخ کے بیان میں فن طب میں کسی استاد سے فیضیاب ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔ [3] روضات الجنات ص ۲۴۲ [4] عیون الانباء ج ۲ ص ۴

علمی مسئلہ پر غور کرتے کرتے سو جاتا تو اکثر پیچیدہ سوالات خواب ہی میں حل ہو جاتے تھے[1] اس طرح اس کو صرف اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم و فنون میں اس قدر کمال حاصل ہو گیا کہ پھر بقیہ عمر میں اس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔

بلاشبہ تاریخ انسانی کا یہ ایک نادر واقعہ ہے، کہ اتنی کم عمری میں شیخ بوعلی سینا کی طبی قابلیت کی شہرت مغرب و مشرق میں پھیل گئی، چنانچہ بخارا کا فرمانروا نوح بن منصور سامانی ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گیا، جس کے معالجہ میں تمام اطبا ناکام ہو گئے، بالآخر اس نے شیخ کو طلب کیا، اس کے علاج سے امیر موصوف کو کامل شفا حاصل ہو گئی، اور اظہار تشکر کے طور پر اس نے شیخ کو اپنے ظل عاطفت میں لے لیا، اور اپنے مقربین خاص میں شامل کیا، مزید برآں اس نے شیخ کو کتب خانہ شاہی سے استفادہ کی اجازت دیدی، اس کتب خانے کے بارے میں ابن خلکان رقمطراز ہیں:۔

کانت عدیمۃ المثل فیھا	وہ کتب خانہ عدیم المثال تھا، اس
من کل فن من الکتب المشھورۃ	میں ہر فن کی مشہور کتابیں موجود تھیں
بایدی الناس وغیرھا مما	جن میں بہت سی تو ایسی تھیں جو
لا یوجد فی سواھا ولا سمع	اس کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی
باسمہ فضلاً عن معرفتہ،[2]	تھیں، اور کسی نے ان کا نام بھی نہیں [illegible]

شیخ نے اس کتب خانہ سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا، اور اس کی نادر الوجود کتابوں کے بیش قیمت فوائد ذہن نشین کر لئے، سوئے اتفاق سے اس گراں قدر کتب خانہ میں آگ لگ گئی، اور تمام ذخیرۂ نوادر خاکستر ہو گیا، بعض لوگ اس آتش زدگی کا ذمہ دار شیخ کو

---

[1] اخبار الحکماء قفطی ص ۲۷۰ [2] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۹۱

خیال کرتے ہیں، تاکہ وہ ان علوم کو اپنی طرف منسوب کرلے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ ان علوم کا سب سے بڑا عالم ہے[1]، لیکن یہ معاصرانہ منافست کی باتیں ہیں، شیخ جیسے قدردان علم کے بارہ میں یہ سوء ظن نہیں کیا جا سکتا ہے، الغرض ۱۸ سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے وہ تمام علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہو گیا،

سیاسی مصروفیات | شیخ ۲۱ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گیا، وہ اپنے والد کے ساتھ نوح بن منصور سامانی کی ملازمت میں تھا، لیکن ۳۹۲ھ میں جب سامانیوں کا نظام سلطنت درہم برہم ہو گیا تو حالات نے شیخ کو بخارا چھوڑنے پر مجبور کیا، خود کہتا ہے،

ثم دعتنی الضرورة الی الاخلال	پھر حالات نے بخارا چھوڑنے اور
ببخاری والانتقال الی کرکانج	کرکانج منتقل ہونے پر مجبور کیا،

اس کے بعد پھر شیخ نے کہیں بھی مستقل قیام نہیں کیا، اور مسلسل سفر کرتا رہا، چنانچہ نسا، ابیورد، طوس، دہستان، شقان، سمیقان وغیرہ ہوتا ہوا امیر شمس المعالی قابوس ابن وشمگیر کے دربار میں حاضر ہونے کی غرض سے جرجان پہونچا، لیکن اس کے دربار تک رسائی ہونے سے قبل ہی فوج نے بغاوت کرکے امیر مذکور کو قلعہ میں مقید کر دیا جہاں ۴۰۳ھ میں اسکا انتقال ہو گیا شیخ نے جرجان میں متعدد کتابیں مثلاً قانون کا ابتدائی حصہ، مختصر المجسطی اور بہت سے رسائل تصنیف کئے، اس کے بعد وہ جرجان سے نکل کر رے گیا، اور کچھ دن بعد قزوین ہوتا ہوا ہمدان آیا،

اسی زمانہ میں امیر شمس الدولہ سخت درد قولنج میں مبتلا ہوا، اور شیخ کے علاج سے خدا نے اس کو شفا دی، امیر مذکور نے نہ صرف اس کو خلعت فاخرہ سے معزز کیا، بلکہ اپنا

---

[1] ابو الفداء ج ۲ ص ۱۴۲، [2] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۴،

وزیر بھی بنا لیا، لیکن فوجیوں میں اس کی وزارت کے خلاف سخت ناراضگی پھیل گئی اور اور انھوں نے شیخ کے خلاف بغاوت کردی، اس کے مکان پر حملہ کرکے لوٹ لیا اور شیخ کو گرفتار کرکے امیر شمس الدولہ سے اس کو قتل کرنے کا مطالبہ کیا، جس کو اس نے منظور نہیں کیا، اور بلطائف الحیل ملک بدر کردیا، اتفاق سے شمس الدولہ دوبارہ اس عارضہ میں علیل ہو گیا، اور پھر شیخ کو علاج کے لئے بلایا، اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو دوبارہ منصبِ وزارت تفویض کی، جس پر وہ شمس الدولہ کے انتقال تک فائز رہا،

فضائل و کمالات | جیسا ذکر ہوچکا ہے، شیخ بوعلی سینا کی تعلیم کی ابتداء عربی ادب سے ہوئی تھی، ۱۰ سال کی عمر میں اس نے اس کی تحصیل شروع کی تھی۔ اور صرف چار سال کی قلیل مدت میں علوم ادبیہ میں اس کی مہارت کا یہ عالم ہو گیا کہ بقول ابن ابی اصیبعہ اس نے اس کے بعد زندگی میں عربی ادب کا دوبارہ عربی ادب کی حیثیت سے مطالعہ نہیں کیا، اس قلیل ترین مدت ہی میں اس نے اس پر اس قدر عبور اور ملکہ راسخہ حاصل کر لیا کہ عربی کے اساطین ادبا کے اسلوبِ نگارش اپنا سکتا تھا،[1] اس سلسلہ میں اس نے خود اپنے حالات میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، کہ ایک بار امیر علاء الدولہ کے دربار میں لغت کے کسی مسئلہ پر بحث چھڑ گئی، شیخ نے بھی اس مباحثہ میں حصہ لینا چاہا، لیکن وہاں موجود مشہور ادیب ابومنصور الجبائی نے اس پر لغت سے ناواقفیت کا طعن کرتے ہوئے کہا کہ آپ صرف حکیم و فلسفی ہیں۔

تاریخ الحکماء اور طبقات الاطباء دونوں میں مذکور ہے، کہ اس کے بعد شیخ نے خود کو دو تین سال تک مسلسل لغت کی کتابوں کے مطالعہ میں منہمک کر دیا، اور اس

---

[1] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۷،

مدت میں لغت پر اتنا عبور حاصل کر لیا کہ اس کے بعد اس نے تین قصیدے لکھے، جن میں غرائب لغت کا استعمال کیا، اور تین رسائل مرتب کئے، ایک ابن العمید کے طرز میں، دوسرا صابی کے اسلوب میں اور تیسرا صاحب بن عباد کے طرز نگارش میں[1]۔

شیخ کی پوری زندگی تگاپوئے دمادم میں گذری، وہ ہم کو ہر دم رواں، پیہم دواں نظر آتا ہے، علمی انہماک، سیاسی سرگرمیاں، درس و تدریس اور پھر تصنیف و تالیف یہ سب مصروفیتیں ایک ساتھ ہی جاری رہتی تھیں، اور ہر چیز پوری یکسوئی اور جمع خاطر کے ساتھ، جس زمانے میں وہ امیر تاج الدولہ کے خوف سے شیخ ابو غالب عطا کے گھر میں روپوش تھا، اس نے بغیر کسی کتاب کے مطالعہ کے محض زبانی یاد داشت سے شفاء کے تقریباً بیس اجزا لکھے، اس زمانے میں تصنیف کی روزانہ مقدار پچاس ورق تھی، اس طرح طبیعیات اور الہیات کا پورا حصہ، کتاب الحیوان اور کتاب النباتات کے سوا لکھ لیا، اس کے بعد منطق کا ایک حصہ لکھا[2]، اسی دوران تاج الملک نے علاء الدولہ سے خفیہ خط و کتابت کے الزام میں شیخ کو گرفتار کر کے فردجان کے قلعہ میں نظر بند کر دیا، جہاں وہ چار مہینے تک رہا، اسی زمانے میں اس نے کتاب الہدایہ، رسالہ حی بن یقظان، رسالۃ الطیر اور کتاب القولنج لکھی۔

شیخ بوعلی سینا، آخر عمر تک ایک نہایت راسخ العقیدہ مسلمان رہا، اگرچہ اس کے باپ اور بھائی دونوں اسماعیلی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ شیخ کو اس مذہب کی دعوت دیتے تھے، لیکن وہ اس سے قطعی متاثر نہ ہوا، جس سے اس کے استقلال رائے، استقلال فکر اور استقلال ارادہ کا اندازہ ہوتا ہے، عقائد کے ساتھ اس کی عملی زندگی بھی نہایت پاکیزہ اور اچھی تھی، تعلیم کے ابتدائی زمانے میں جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ اس کے سامنے آتا تو وہ سیدھا

---

[1] اخبار الحکماء ص ۲۰۰، ۲۰۲ و طبقات الاطباء ج ۲ ص۔ [2] حکمائے اسلام اول ص ۱۰۱، ۱۰۲

جامع مسجد کا رُخ کرتا، وضو کر کے صلوٰۃ حاجت پڑھتا، اور درگاہ خداوندی میں تضرع و زاری کرتا تھا جس کے نتیجہ میں بقول خود درپیش مسئلہ پانی ہو جاتا[1]۔

شیخ ذوق شعر و سخن سے بھی بہرہ وافر رکھتا تھا، اس کے عربی قصائد صاحب طبقات الاطبا نے پورے نقل کر دیئے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے متفرق اشعار بھی ملتے ہیں، اس کے قصیدے بالکل جاہلی شعرا کے انداز پر ہیں یعنی معشوق کے کھنڈرات پر آہ و زاری وغیرہ سے تشبیب کی ابتدا کرتا ہے، علاوہ ازیں نادر تشبیہات و استعارات سے بھی اس کا کلام مزین[2]

وفات اگرچہ شیخ بوعلی سینا کے جسمانی قویٰ نہایت اچھے تھے، لیکن مسلسل غیر محتاط زندگی گذارنے کے باعث اس کی صحت کافی خراب رہنے لگی تھی، اور مختلف عوارض اس کی جان کے ساتھ لگ گئے اسی زمانہ میں امیر علاء الدولہ کے ساتھ بیماری کی حالت میں ہمدان کی طرف گیا، راستہ میں بیماری نے نہایت شدت اختیار کر لی، ہمدان پہونچ کر اس کو اپنی شفا سے بالکل مایوسی ہوگئی اور پھر اس نے علاج چھوڑ کر خود کو خدا کے حوالے کر دیا، غسل طہارت کر کے توبۃ النصوح کی اور اپنا تمام مال و متاع فقرا کو خیرات کر دیا، تمام غلام آزاد کر دیئے، اور ہر تیسرے دن ایک قرآن ختم کرتا رہا، بالآخر اس کا جام حیات لبریز ہو گیا، اور رمضان ۴۲۸ھ میں جمعہ کے دن ہمدان ہی میں وفات پائی[1]، ابن خلکان نے ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ شیخ کا انتقال اصفہان میں ہوا، لیکن پہلی روایت کو اصح قرار دیا ہے[2]۔

تصنیف و تالیف شیخ بوعلی سینا بہت زود نویس مصنف تھا، اس نے اکیس سال کی عمر سے یہ شغل اختیار کیا اور عمر بھر اس کا قلم مختلف موضوعات پر گوہر افشانی کرتا رہا، اس لئے

---

[1] تاریخ مختصر الدول ص ۳۲۵ [2] خزانۃ الادب ج ۳ ص ۴۶۶

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۱۹۲

اس نے اپنی تصنیفات کا ایک عظیم ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔[1] ابن خلکان نے لکھا ہے کہ اس کی مطول و مختصر کتابوں کی مجموعی تعداد سو کے قریب ہے[2] قفطی نے شیخ کی تالیفات کی جو فہرست دی ہے، اس میں اکیس ۲۱ بڑی اور چوبیس ۲۴ چھوٹی کتابوں کے نام درج ہیں[3]، خود شیخ کے شاگرد ابوعبید جوزجانی نے بائیس بڑی کتابوں اور اکیس ۲۱ رسائل کے نام شمار کرائے ہیں، لیکن ابن ابی اصیبعہ نے اس فہرست پر اضافہ کرتے ہوئے، شیخ کی ۱۵ مزید چھوٹی بڑی کتابوں کا ذکر کیا ہے[3]، بروکلمن نے اپنی مشہور کتاب میں ابن ابی سینا کی تصنیفات کی جو فہرست دی ہے وہ قفطی سے بھی زیادہ طویل ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے دینیات اور علم مابعد الطبیعات پر اڑسٹھ ۶۸ کتابیں لکھی ہیں، اور گیارہ کتابیں فلکیات اور فلسفہ طبیعیات پر، اور سولہ طب پر تالیف کی ہیں، اور چار اس کے کلام کے مجموعے ہیں، اس طرح کل ننانوے کتابیں ہوئیں۔

اس کثرت تصانیف پر اس وقت اور بھی تعجب و حیرت ہوتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بوعلی سینا کی پوری زندگی مختلف النوع مشاغل اور سرگرمیوں سے معمور رہی ہے اور اس کو کبھی جمع خاطر کے ساتھ کہیں بھی قیام کرنے کا موقع نہیں مل سکا، لیکن بایں ہمہ اس کی کسی بھی تصنیف پر اس کے انتشار فکر و ذہن کا سایہ بھی نہیں پڑسکا ہے، خواہ وہ قید و بند میں رہا ہو یا منصب وزارت پر فائز- ہر حال میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا، اوپر مذکور ہوا کہ اس نے روپوشی کی حالت میں بغیر کسی کتاب کی مدد کے شفا کے ۲۰ جزو لکھے، زود نویسی کے ساتھ وہ تصنیف میں محنت و جانکاہی بھی بہت کرتا تھا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ منطق میں شیخ کی ایک کتاب مختصر الاصغر پر کسی اہل علم کو کچھ شکوک پیدا ہوئے، اور اس نے اپنے اشکال مرتب کرکے شیخ کو ارسال کئے، قاصد ان کو لے کر شام کے وقت

---

[1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۹۳، [2] تاریخ الحکماء ص ۴۱۸، [3] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۱۸،

شیخ کے پاس پہونچا، ابن سینا نے نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر ان مسائل کا جواب لکھنا شروع کیا اور نصف شب تک متواتر اس کا اشہب قلم رواں رہا،

ابن سینا کی بعض کتابیں متعدد ضخیم جلدوں پر مشتمل ہیں، مثلاً کتاب الحاصل و المحصول جو اس نے اپنے ایک ہمسایہ عالم ابو بکر البرقی کی فرمائش پر لکھی تھی بیس جلدوں میں ہے، اسی طرح کتاب الشفاء ۱۸ جلدوں کتاب القانون ۱۴ جلدوں اور کتاب الانصاف ۲۰ جلدوں اور کتاب لسان العرب دس جلدوں پر مشتمل ہیں[۱]، شیخ کی مشہور ترین کتابوں میں شفا، القانون اور الاشارات والتنبیہات سب سے زیادہ ممتاز اور لائق ذکر ہیں، بقول براؤن یہ تینوں کتابیں دنیا کی علمی امہات کتب شمار کی جاتی ہیں[۱]،

کتاب الشفا کو حکمت کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے، انوری اپنے ایک مشہور قصیدہ میں اس کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے،

مرورا باید کہ حکمت نیز در من گیر دش   تا شفائے بو علی خوانند نزد بحتری

شفا کے شارحین میں ابو عبد اللہ محمد بن احمد البیہاقی[۲]، محمد البخاری سرخستی اور محمد بن علی بن ابی نصر الاسفرائنی[۳] کے نام خصوصیت سے نمایاں ہیں، متاخرین میں شمس الدین منصور[۴]، صدر شیرازی[۵] اور آقا حسین خوانساری[۶] نے اپنے قیمتی حواشی سے اس کو مزین کیا، علاوہ ازیں شمس الدین خسرو شاہی اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے بھی اس کی تلخیص کی ہے[۷]،

اسی طرح منطق و حکمت میں شیخ کی تصنیف الاشارات والتنبیہات کے ساتھ بھی

۱؎ تاریخ ادبیات ایران ص۱۳۰ ۲؎ کشف الظنون ج ا بیان شفا ۳؎ جشن نامۂ ابن سینا، ذبیح اللہ صفا ج ا ص ۱۷۰،
۴؎ ایضاً ۵؎ فہرست کتب خانہ رامپور حکمت ص۲۰ ۶؎ ایضاً ص۲۲ ۷؎ جشن نامہ ابن سینا ج ا ص ا،

خصوصی اعتنا کیا گیا ہے، یہ کتاب مشرقی ملکوں خصوصاً ہند و ایران کے اعلیٰ نصاب میں آج بھی داخل ہے، اس کے شروح و حواشی لکھنے والوں میں امام رازی، محقق طوسی، سراج الدین ارموی، رفیع الدین جیلی[1] اور عز الدین بن منصور[2] وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، نجم الدین البسودی نے مختصر الاشارات والتنبیہات کے نام سے اس کی ایک تلخیص بھی لکھی ہے[3]،

القانون فی الطب | شیخ کی سب سے اہم تصنیف جس نے ..... علم و فن کی تاریخ میں اس کو حیات جاوداں عطا کی ہے، القانون فی الطب ہے، آج تک اس کتاب کو علم طب کا ایک عظیم الشان اور گراں قدر خزانہ سمجھا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل "اس میں بو علی سینا اپنی لطافت بیان میں ارسطو اور جالینوس پر بھی گوئے سبقت لے گیا ہے[4]"، یورپ میں بھی یہ کتاب صدیوں طبی درسگاہوں کے نصاب کا ایک اہم حصہ بنی رہی اور وہاں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لاطینی زبان میں اس کے تقریباً بیس[5] اڈیشن شائع ہوئے، قفطی اس کی اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہے،

ھو کتاب جلیل و کناش نبیل	ترجمہ	یہ ایک شاندار کتاب اور قابل قدر
اشتمل علی علم الطب وعملہ		بیاض ہے، جو علم طب کے علمی و عملی حصوں
حسن الترتیب[6]،		پر مشتمل ہے اس کے مضامین میں حسن

نظامی عروضی لکھتا ہے کہ اگر بقراط و جالینوس کو حیات نو مل جائے تو بھی وہ ابن سینا کے قانون کے سامنے سر عقیدت خم کردیں[7]، سر ولیم آسلر نے قانون کو طبی بائبل سے موسوم کیا ہے[8]

[1] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲۰، [2] فہرست قدیم کتب خانہ رام پور حکمت ۱/۱۰ [3] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۸، [4] ارمین میڈیسن ج ۱ ص ۱۰، [5] تاریخ الحکماء ص ۲۳۲ [6] چہار مقالہ کتب ۱۰ ایڈیشن، [7] ایوولیوشن آف ماڈرن میڈیسن مطبوعہ ۱۹۲۱ء آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن ص ۹۰

قانون پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد امور کلیہ، دوسری ادویہ مفردہ تیسری معالجات، چوتھی امراض عامہ اور پانچویں مرکبات کے بیان میں ہے، قانون کی تلخیص اور شروح بے شمار لکھی گئی ہیں، سب سے زیادہ مشہور و مقبول تلخیص محمود بن عمر الجغمنی کی قانونچہ اور ابوالحسن علاء الدین قرشی کی موجز ہیں، پھر قانونچہ کی شرح فارسی زبان میں حکیم محمد اکبر ارزانی نے لکھی ہے[1] اور موجز القانون کی شروح اقسرائی، کرمانی تبریزی، سدیدی اور نفیسی کے ناموں سے لکھی گئیں[2] اور ان میں سے بعض اس قدر مقبول ہوئیں کہ آج تک داخل نصاب ہیں، علاوہ ازیں قانون کی ایک تلخیص خود شیخ کے ممتاز شاگرد شرف الزمان الایلاقی (م ۵۳۶ھ) نے مختصر کے نام سے لکھی[3] جس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔

تلخیصات قانون کی شرح کے علاوہ خود اصل کتاب کی بہت سی ضخیم شروح لکھی گئی ہیں، جن میں شرح خجندی، شرح سمرقندی، شرح آملی، شرح قرشی اور شرح گیلانی کے نام خاص طور پر نمایاں اور قابل ذکر ہیں،[4] اسی طرح ہندوستان میں بھی قانون کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا گیا ہے، اس کے ہندی شارحین اور حاشیہ نویسوں میں سے کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں، شیخ کلیم اللہ جہان آبادی (اس شرح کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے)[5] حکیم محمد شریف خاں[6] حکیم اسحٰق بن اسماعیل دہلوی[7] حکیم معز الدین فانس پوری[8] حکیم علوی خاں[9] حکیم شفائی خاں[10] شیخ محمد مومن جزائری[11] حکیم محمد اکبر ارزانی سید عبد الفتاح بن عبد اللہ الملا مہدوی[12] وغیرہ،

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ تذکرہ قانون [2] ایضاً [3] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۴۳ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۳۰۰،
[6] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند [7] ایضاً ص ۲۱۳-۲۲۲ [8] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۲۹۳ [9] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۲۲۳ [10] نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۲۰۳ [11] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۲۳،

الغرض شیخ کی اس مایہ ناز تصنیف کی گونج صدیوں گذر جانے کے باوجود آج بھی دنیائے علم و فن میں اسی طرح قائم ہے جیسی عہد تصنیف میں تھی بلکہ مرور وقت کے ساتھ اس کی عظمت، اہمیت اور مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تدارک الخطا ان تالیفات کے علاوہ شیخ کی ایک اور بے نظیر طبی تالیف بھی ہے، جس کا نام چہار مقالہ میں نظامی سمرقندی نے "تدارک انواع الخطاء فی التدبیر الطبی" بیان کیا ہے[1] اور حاشیہ نگار چہار مقالہ علامہ محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے اس کا پورا نام "دفع المضار الکلیۃ عن الابدان الانسانیۃ بتدارک انواع خطاء التدبیر" ذکر کیا ہے[2]، یہ کتاب ۱۳۰۵ھ میں مطبع خیریہ مصر سے ابوبکر یا رازی کی کتاب منافع الاغذیہ و دفع مضارہا کے حاشیہ پر شائع ہوئی ہے[3]، قزوینی نے تصریح کی ہے کہ شیخ نے یہ کتاب خوارزم شاہ کے علم دوست وزیر ابوالحسین احمد بن محمد السہلی کے لئے تالیف کی تھی، شیخ نے وزیر موصوف کے حکم کی تعمیل میں اسکے علاوہ ایک اور کتاب "قیام الارض فی وسط السماء" کے نام سے بھی لکھی تھی، چنانچہ ثعالبی نے تتیمۃ الدہر[4]، قفطی نے تاریخ الحکماء[5] ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء[6] اور یاقوت رومی نے معجم الادباء[7] میں بیان کیا ہے کہ شیخ نے ابوالحسین احمد السہلی کے لئے دو کتابیں لکھیں، ایک قیام الارض فی وسط السماء اور دوسری التدارک لانواع خطاء التدبیر،

اس کتاب کے سبب تالیف کے بارے میں خود شیخ ابن سینا کا بیان ہے کہ میں نے اس وزیر کے تعمیل ارشاد میں مختلف معلومات حاصل کرکے ایک لڑی میں پرونے کا قصد

---

[1] چہار مقالہ گب اڈیشن مطبوعہ لیدن ص ۸۱، [2] حواشی چہار مقالہ ص ۲۴۳ [3] معارف ۔ اس کا ایک نسخہ کتبخانہ دار المصنفین میں بھی موجود ہے [4] تتیمۃ الدہر ج ۴، ص ۱۴۵ [5] تاریخ الحکماء ص ۴۱۸ [6] طبقات الاطباء ج ۲ ص ۱۹۲-۲۰۰ [7] معجم الادباء ج ۲ ص ۱۰۳

ا، جس میں حکمت کے متعلق معلومات کا خزانہ ہو، لہذا ایک کتاب دفع المضار الکلیۃ للابدان الانسانیۃ کے نام سے مرتب کی،

تدارک الخطا کے مخطوطات رضا لائبریری رام پور، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ میں محفوظ ہیں، یہ لالہ جگل لال دہلوی کی فرمائش پر سید فخرالدین احمد کے زیر اہتمام اعلار المطابع دہلی سے بھی طبع ہو چکی ہے، اس کا ایک نسخہ ہمارے یہاں لٹریری ریسرچ یونٹ کی زینت ہے، علاوہ ازیں اس کے ایک فارسی ترجمے کا مخطوطہ (جس پر مترجم کا نام درج نہیں) برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے اس کی تاریخ کتابت سنہ ۸۸۳ھ ہے، مقدمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ جمال الدولہ والدین حسین ترخان کے لئے لکھا گیا تھا،[1]

فارسی زبان میں اس کا ایک اور ترجمہ "موجز عظیم النفع" کے نام سے شیخ حسین انصاری المخاطب بہ حاذق خان نے کیا ہے، جو مطبع مجتبائی دہلی میں سنہ ۱۸۹۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا، علمی و فنی نقطۂ نظر سے بلاشبہہ یہ کتاب اس لائق ہے، کہ اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا جائے اور اگر ساتھ ہی اس موضوع پر دوسری معیاری کتابوں کا مطالعہ کرکے مزید مواد پیش کیا جائے تو اس کی اہمیت و افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے،

یہ کتاب سات مقالات پر مشتمل ہے، پہلے مقالہ میں اعتدال مزاج کی توضیح، اجتناب امور اور مختلف النوع امور میں تعدیل کا بیان ہے، اس مقالہ میں پوری کتاب کا لب لباب آگیا ہے، اسی لئے یہ نسبتۂ طویل بھی ہے، دوسرے مقالہ میں مختلف ہواؤں اور خصوصاً گرم اور متعفن ہواؤں سے بحث کی گئی ہے، تیسرا مقالہ حمام سے متعلق ہے، اس میں حمام کی ضرورت و

---

[1] کتاب التدارک ص ۳۳ [2] رسالہ جودیہ با مقدمہ و حواشی از حکیم سید ظل الرحمٰن ص ۱۲۲،

اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی مضرت بھی واضح کی گئی ہے، چوتھے مقالہ میں غذاؤں کا بیان ہے، پانچویں میں پانی کے اقسام بیان کئے گئے، اور مشروبات کا ذکر ہے، چھٹے مقالہ میں مختلف حرکتوں سے عارض ہونے والی مضرتوں اور مختلف حالات میں مختلف حرکات و سکنات سے پیدا ہونے والے نقصانات اور اس کے دفعیہ کے اصول درج ہیں، کتاب کا آخری مقالہ استفراغ کی مختلف صورتوں اور ان میں عدم اعتدال و توازن کے نقصانات و تدارک سے متعلق ہے۔

شیخ نے تدارک الخطا میں انتہائی سلیس اور عام فہم انداز نگارش اختیار کیا ہے اور غیر ضروری تفصیلات اور حشو و زوائد سے حتی الامکان اجتناب کیا، اس کتاب میں حفظان صحت کے بہت سے ایسے مسائل آگئے ہیں، جن کی طرف اطبائے قدیم نے بالعموم اعتنا نہیں کیا تھا، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام و خواص سب کیلئے اس مفید اور کارآمد خزانے کو اردو میں منتقل کرکے وقف عام کیا جائے، یہ نہ صرف ایک اہم علمی خدمت ہوگی، بلکہ خالص فنی حیثیت سے بھی یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہوگا، اور عربی و فارسی زبانوں سے ناواقف لوگ بھی اس سربند خزانۂ طب سے فائدہ اٹھا سکیں گے،

حکمائے اسلام

اس میں دوسری صدی ہجری سے لیکر ہندوستان کے خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام حکمائے اسلام کے مستند حالات، اُن کی علمی خدمات، اور ان کے فلسفیانہ نظریات و افکار کی تفصیل بیان کی گئی ہے، پہلی جلد میں پانچویں صدی ہجری تک کے حکما کے حالات ہیں، جن میں حکیم بو علی سینا بھی داخل ہیں، اور دوسری جلد میں متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات ہیں، ان ہی میں حکمائے خیرآباد و فرنگی محل داخل ہیں، مولفہ مولانا عبد السلام ندوی جلد اول ۷۵ - ۵ جلد دوم ۹۵ - ۱۰

غزالی مشہدی

از ڈاکٹر محمد سلمان عباسی صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی۔

سولھویں صدی کی ابتدا میں شاہ اسمٰعیل اول (۱۵۰۰-۱۵۲۴ء) نے ایران میں صفوی حکومت کی بنیاد رکھی، یہ ایران کی تاریخ کا بڑا سنگین دور تھا، اس کے حکمراں سرحدی اور اندرونی خطروں کے تدارک میں اس قدر مصروف تھے کہ شعرا اور ادبا کی سرپرستی تو درکنار انھوں نے ان کی باقاعدہ حوصلہ شکنی شروع کر دی تھی اور ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں، شاہ اسمٰعیل کا بیٹا شاہ طہماسپ (۱۵۲۴-۱۵۷۶ء) بھی اپنے پیش رو کی طرح غیر ملکی حملوں اور اندرونی مداخلت کا مقابلہ کرنے کے لئے فوجی قوت بڑھاتا رہا، اس نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں شعراء و ادبا کی قدردانی کی، لیکن جلد ہی مذہب اور علمائے مذہب سے اس قدر متاثر ہو گیا کہ اس نے یہ حکم دیدیا کہ بادشاہوں اور امیروں کی مدح کے بجائے شعراء صرف ائمہ کرام کی شان میں قصائد کہا کریں، مذہبی شاعری کے علاوہ ہر قسم کی شاعری پر مکمل پابندی عائد ہو گئی، ان حالات میں ایرانی شعراء اور ادبا، اپنے وطن میں گھٹن محسوس کرنے لگے، اور بقول بدایونی کے شاید یہی سب سے بڑا سبب تھا کہ ایک سو ستر نامور ایرانی شاعر اسی دور میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان آگئے،[1]

ہندوستان کی ادب نوازی، داد و دہش اور قدر افزائی کا سلسلہ صرف مغل حکومت تک ہی

---

[1] منتخب التواریخ ص ۲۴۴،

محدود نہ تھا، بلکہ بادشاہ کے دربار سے وابستہ امرا اور دکن کی خود مختار ریاستوں میں بھی ادب پروری اور شاعر نوازی کا دور دورہ تھا،

علی عادل شاہ کی ادبی سرپرستیاں دکن کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہیں، مرزا محمد قاسم "تاریخ فرشتہ" میں رقمطراز ہیں،[1]

سادات وعلماء وفضلاء را گرامی	(علی عادل شاہ) علماء اور فضلاء کا احترام
داشتہ ادرارات معین کردہ بگی	کرتا تھا . . . . . . اس نے ان کے
ہمت آں گزرانید کہ مردم خوب دہ	روزینے مقرر کئے، اور کوشش کی کہ عمدہ
درگاہش جمع شوند، لہذا در اندک	اور تجربہ کار لوگوں کو اپنی بارگاہ میں
فرصتی از ایران وتوران وسائر اقالیم	جمع کرے، تھوڑے ہی عرصہ میں ایران
بسے مردم خوب تشریف آوردہ	توران اور دوسرے ممالک سے بہترین
بیجاپور رشک ربع مسکون گردید	لوگ آکر بیجاپور میں جمع ہوئے اور بیجاپور
وعلی عادل شاہ کہ بہ ارث ادرسیدہ	رشک ارم بن گیا، علی عادل کو جو خزانہ
بود یک ونیم کرور ہن می شد در	میراث میں ملا تھا اور جو ڈیڑھ کروڑ ہن تھا
اندک مدت بر خلق پاشید	اسے تھوڑے ہی زمانہ میں لوگوں کو تقسیم کر دیا،

ابراہیم عادل شاہ نے بھی فیاضی اور سرپرستی کی یہ عادت اپنے چچا اور پیشرو علی عادل شاہ سے ورثہ میں پائی تھی،

ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنی قدر افزائیوں کی وجہ سے ایران تک میں مشہور تھا، اس نے ادب اور ارباب ادب کی اعلیٰ پیمانہ پر سرپرستی کی اور انھیں ہر طرح سے نوازا وہ

---

[1] تاریخ فرشتہ (مرزا محمد قاسم) ص ۳۵، روضہ ۲، مقالہ ۳،

بڑا ہی عادل، نیک طینت اور خوش مزاج حکمراں گذرا ہے۔ اس کی انہی خوبیوں اور محاسن سے متاثر ہو کر سنجر کاشانی نے اس کی تعریف میں کہا ہے[1]،

دو شاہ شاعر پرور بلند پایہ نام شدند　　نخست والیٔ غزنین دوم خدیو دکن
رسد بہ عہد تو شاعر بہ پایۂ ملکی　　زہے نوازش شاہ و زہے ظہور سخن

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنے دربار میں بہت سے نامور ادبا اور شعرا کو مدعو کیا، انھیں حسب مراتب انعامات و اکرامات سے نوازا اور صلہ، جاہ و مناصب کی داد و دہش میں کوئی کمی باقی نہ رکھی، اس کے دربار میں بہت سے نامور ایرانی شاعر موجود تھے، جن میں ملک قمی اور ظہوری ترشیزی صف اول میں شمار ہوتے ہیں، فیضی نے اکبر کو اسی سلسلہ میں تحریر کیا تھا[2]،

در احمد نگر دو شاعر خاک نہادند　　احمد نگر میں دو بلند مرتبہ شاعر ہیں جن میں
صافی مشرب اند و در شعر مرتبہ عالی　　ایک ملک قمی ہیں جو کسی سے بہت کم
دارند یکی ملک قمی کہ کمی کم تر اختلاط　　اختلاط کرتے اور ہمیشہ ان کی آنکھیں
می کند و ہمیشہ قرۂ تر ے وارد　　اشک آلود رہتی ہیں، دوسرے ملا ظہوری
دیگر ملا ظہوری کہ بغایت رنگین کلام است　　جن کا کلام نہایت رنگین ہوتا ہے،

ہر چند کہ یہ فیاضیاں اس پیمانہ پر نہ تھیں جیسی کہ مغل سلاطین کے درباروں میں تھیں اور جن کی توقع پر ان لوگوں نے سرزمین ایران کو خیرباد کہہ کے ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا تھا، لیکن دکن کی تاریخ ایسے دریا دل اور فیاض حکمرانوں سے بھری پڑی ہے، جنھوں نے شعرا اور ادبا کو ہر موقع پر نذر و جواہرات سے نوازا، ظہوری نے اپنا مشہور "ساقی نامہ" برہان نظام شاہ کی خدمت میں روانہ کیا تھا، برہان نظام شاہ کو اگرچہ شعر و ادب سے زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن

---

[1] سرو آزاد (غلام علی آزاد) ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۳۲

وہ ظہوری کے ساقی نامے سے اس قدر متاثر ہوا کہ خزانے سے لدے ہوئے کئی ہاتھی اسے تحفہ کے طور پر دیئے، اور اس کی قدر افزائی کی ادب نوازی کا یہ جذبہ ہندوستانی امراء اور روساء کے درباروں میں عام تھا اور ہندوستانی تہذیب اور درباری روایات کا جزو بن چکا تھا۔ صرف دکن ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کا یہی حال تھا، البتہ دکن کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے حکمرانوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھتے ہی ان باکمالوں کا استقبال کیا، سمندر کی راہ سے آنے والوں کی پہلی منزل دکن ہی کی سرزمین ہوتی تھی، اسی لئے علم و ادب کی سرپرستی کے سلسلہ میں دکن کا نام سرفہرست نظر آتا ہے، ان میں سے کچھ دکن ہی میں رچ بس گئے اور کچھ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جا کر قیام پذیر ہوئے اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کر کے قبولیت خاص و عام حاصل کی، ان میں سے کچھ شعراء نے مغل سلاطین کے دربار میں رسائی حاصل کی، اور کچھ امراء و رؤساء کے درباروں سے وابستہ رہے، جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوتی اور مال و جواہر سے نوازا گیا۔

جب ایران میں فارسی شاعری کی ساکھ گر رہی تھی اسی دور میں ہندوستان میں وہ اوج کمال پر پہنچ چکی تھی، گوشہ گوشہ میں اس کا بول بالا تھا، اور ہر طبقہ کی طرف سے اسے خوش آمدید کہا جا رہا تھا، تصوف جو کہ فارسی شاعری کی جان ہے اب ہندوستانی ذہنوں میں بھی سرایت کر رہا تھا، شہنشاہ اکبر جو بذات خود علم کا دلدادہ اور سرپرست تھا تصوف کی اس لہر میں ڈوب کر سرشار ہو گیا، اسی کا اثر تھا کہ وہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری اور فتح پور سیکری کے مشہور بزرگ شیخ سلیمؒ سے والہانہ عقیدت رکھتا تھا، اس دور میں فارسی شاعری نے جو فروغ پایا، اس کی مثال تاریخ میں کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی، سلاطین و امراء شعراء و ادباء کی محض سرپرستی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے

اندر ایسے ذی علم اور صاحب نظر بھی تھے جو ان شاعروں اور ادیبوں کو اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہتے تھے،

مغل دربار اکبر کی زیر سرپرستی منبع علم و ادب بنا ہوا تھا، حکیم ابوالفتح گیلانی، عبدالرحیم خان خاناں اور ملک الشعرا فیضی جیسی اعلیٰ مرتبہ اور صاحب کمال ہستیوں کی وجہ سے فارسی شاعری کو روز افزوں عروج حاصل ہو رہا تھا، ان کی قدر دانی نے ہندوستان میں فارسی شاعری کی جڑیں مضبوط کر دیں، یہی وجہ ہے کہ غزالی اور عرفی جیسے باکمال شاعر جو اپنے وطن ایران میں خاطر خواہ حیثیت نہ حاصل کر سکے ہندوستان آئے، اور یہاں ان کی شاعری پر نکھار آ گیا اور ان کے نتائج فکر شعر و ادب کے شاہکار سمجھے گئے، صاحب "مآثر رحیمی" عبدالباقی نہاوندی نے ان اصحاب علم و دانش کی قابلیت اور ادبی صلاحیت پر تنقید کرتے ہوئے اپنے تذکرے میں بہت کچھ لکھا ہے، عبدالرحیم خان خاناں کے دربار کے سلسلہ میں ان کی تحریر ذیل میں درج کی جا رہی ہے ؎

اکثر اعیانِ دولت و ارکانِ سلطنت	بادشاہ مرحوم کے اکثر اعیانِ دولت
بادشاہ مرحوم دست گرفتہ و تربیت	و ارکانِ سلطنت اسی کے تربیت یافتہ
کردہ وے اند ہر کہ از ولایت آمدہ	ہیں، جو بھی ولایت سے آتا، انہی کی
بندگی و مصاحبت ایشاں اختیار	نیازمندی و ہم نشینی اختیار کرتا، چنانچہ خواجہ
می نمودہ، چنانچہ خواجہ ثنائی و مرزا	ثنائی، مرزا قلی، عرفی شیرازی و حیاتی
قلی میلی و عرفی شیرازی و حیاتی گیلانی	گیلانی وغیرہ تمام شعراء و سخن سنج انہی
سائر مستعدان در خدمت او بودہ	کی خدمت میں تھے، اس زمانہ کے تمام

---

۵ مآثر رحیمی (عبدالباقی نہاوندی) جلد ۲ ص ۲۹۳،

اند، و معتقدان و شعر سنجان ایں زماں	ارباب سخن کا یہ اعتقاد ہے کہ تازہ گوئی
را اعتقاد آن است کہ تازہ گوئی کہ	جو اس زمانہ میں شعراء میں مستحسن سمجھی
دریں زماں درمیانہ شعراء مستحسن است	جاتی تھی اور جس میں شیخ فیضی،
در شیخ فیضی، مولانا عرفی شیرازی وغیرہ	مولانا عرفی شیرازی وغیرہ نے طبع آزمائی
بآں روش حرف زدہ اند، باشارہ	کی ہے، انہی کا فیض تھا،
و تعلیم وی بودہ"	

شاہی سرپرستی اور فیاضی کے ساتھ دربار سے منسلک امراء اور روٴسا نے فارسی ادب اور شاعری کو جتنا فروغ دیا ہے، اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی، الگ الگ ان امراء کے درباروں میں بھی علم و ادب کی شمعیں جگمگا رہی تھیں، عبدالرحیم خانخاناں، ملک الشعراء فیضی، خان اعظم مرزا عزیز، خان زماں علی قلی خاں اور حکیم ابوالفتح گیلانی کی ادب نوازی اور علم پروری کے ڈنکے دور دور تک بج رہے تھے، ان امراء نے ایرانی شعراء کا دل کھول کر استقبال کیا اور ان پر زر و جواہر کی بارش کی، صرف خانخاناں کے دربار پر اگر نظر ڈالی جائے تو شعر و ادب کا مخزن نظر آئیگا، اس زمانہ کے مشہور شعراء ملا شکیبی، عرفی، نظیری، وغیرہ اسی کے دربار سے وابستہ تھے اور اسی کی سرپرستی کے طفیل گلشن ایران کے یہ پھول ہندوستان میں خوب پھلے اور اپنی خوشبو سے سارے ملک کو معطر کر دیا،

سرزمین ایران سے ہندوستان آکر مہکنے والے پھولوں کے اس گلدستہ میں **غزالی مشہدی** بھی شامل ہے جو شاہ طہماسپ کی تنگدلی اور زیادتی سے تنگ آکر پہلے دکن آیا پھر وہاں سے خان زماں علی قلی خاں کی دعوت پر جونپور آیا اور خان زماں کے قتل کے بعد دربار اکبری سے منسلک ہو گیا، اور بعد میں "ملک الشعراء" کے بلند درجہ تک پہنچا تاریخی شواہد سے یہ واضح ہے کہ

غزالی مشہدی کا نہ صرف دربار اکبری میں پہلی بار ملک الشعراء کے لقب سے نوازا گیا، بلکہ وہ پہلا شاعر ہے، جس سے ہندوستانی شعروادب کی تاریخ میں رسم ملک الشعرائی کی ابتداء ہوتی ہے، اس کے بعد فیضی، طالب آملی، قدسی، اور کلیم وغیرہ اس فہرست میں شامل ہوئے، غزالی مشہدی کی اسی تاریخی اور ادبی اہمیت کے پیش نظر اس مقالے میں اس کی زندگی، شخصیت، اور علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا جارہا ہے

شعروادب کی دنیا جتنی حسین اور رنگارنگ ہے اتنی ہی حوادث سے بریز ہے، یہاں اگر کچھ عناصر ایسے نظر آتے ہیں، جنھوں نے اپنے ہمعصروں کو شہرت ونامورئی کے بام تک پہنچانے کی کوشش کی تو ٹھیک اس کے بالکل برعکس ایسے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے معاصرین کے ساتھ بے انصافی کی،

زیر نظر شاعر غزالی مشہدی بھی انہی شعراء میں شمار کیا جاسکتا ہے جنھیں اس کے ہمعصروں نے نظر انداز کیا، حد یہ ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اس کے حالات بیان کرنے سے بھی دلچسپی نہ لی، لیکن تذکروں کے مبہم اشاروں کی روشنی میں قرائن و آثار کی مدد سے اس کی تصویر کشی کی کوشش کی جارہی ہے،

مختلف تذکروں کی ورق گردانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ غزالی نام کے گیارہ شاعر گزرے ہیں، غزالی ثانی غزالی طوسی، غزالی طوسی دوم، غزالی مازندرانی، غزالی جنیک مشہدی، غزالی سمرقندی غزالی (نظام محمود طاہر) غزالی مروزی، میر اسلام غزالی، غزالی تبریزی اور غزالی مشہدی، اسی آخر الذکر یعنی غزالی مشہدی کے بارہ میں تلاش و تفحص کے بعد جو معلومات فراہم ہوئے ہیں ان کو اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے،

غزالی کے معاصر تذکرہ نگاروں نے اس کے نام کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، متاخرین تذکرہ نگار

بھی سوائے کشن چند اخلاص کے سب اس سلسلے میں خاموش ہیں، اخلاص نے اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار میں غزالی کا نام علی رضائی مشہدی لکھا ہے[1]، گو غزالی کے عہد سے تقریباً ۱۵۰ سال بعد لکھے جانے والے اس تذکرہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اخلاص کو غزالی کے اصل نام کے متعلق معلومات کس ذریعے سے فراہم ہوئیں تاہم ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اخلاص ہی کے بیان پر اعتماد کریں،

غزالی کے عام حالات زندگی کی طرح اس کے سنہ ولادت اور والدین کے بارے میں بھی کسی تذکرہ نگار نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے، مگر خود غزالی نے اپنے کلیات کے دیباچے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس کے والدین کے نام یا ان کی اصلیت کے سلسلے میں مبہم معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ایک مفروضہ سنہ ولادت بھی مل جاتا ہے،

برٹش میوزیم، لندن میں محفوظ قدیم فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب کرتے وقت کلیات غزالی کے ضمن میں غزالی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور یورپی محقق اور مستشرق ڈاکٹر ریو (Rieu) نے غزالی کا سنہ پیدائش بتانے کی کوشش کی ہے، ریو کی عبارت درج ذیل ہے[2]

Molana Ghazali infom us...... That he has completed his 30th year in A.H 966, he must have been born about A.H 936"

مولانا غزالی نے ہم کو بتایا ہے کہ ...... انھوں نے اپنی عمر کے تیس سال ۹۶۶ھ میں پورے کئے، اس طرح ان کا سنہ پیدائش ۹۳۶ھ ہونا چاہیے،

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں ۹۳۶ھ غزالی کا سنہ ولادت تسلیم کیا جا سکتا ہے، چونکہ اس سے زیادہ قرین قیاس اور مستند کوئی اور ذریعہ معلومات نہیں ہے،

غزالی کی جائے پیدائش کے بارے میں خود اس کے دونوں دواوین کے علاوہ دوسرے مستند اور معتبر ذرائع سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ صوبہ خراسان کے شہر مشہد مقدس

---

[1] تذکرہ ہمیشہ بہار، ذکر غزالی مشہدی، کشن چند اخلاص [2] ریو کیٹلاگ Rieu، مخطوطہ لائبریری نمبر ۲۵۰۰۷

میں پیدا ہوا تقی اوحدی نے اپنے تذکرے میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[1]،

"مولانا غزالی از مشہد مقدس مطہر رضویہ است"
مولانا غزالی مشہد مقدس... تعلق رکھتے تھے،

غزالی نے بذات خود مشہد مقدس کی سرزمین پر اپنی پیدائش کی نہ صرف اطلاع دی ہے بلکہ اسے اس بات پر فخر ہے کہ وہ اس پاک اور مقدس سرزمین کا زائیدہ اور پروردہ ہے جس کی عظمت و تقدیس کا سارا عالم معترف ہے، غزالی کا مندرجۂ ذیل مطلع اسکے جذبات کا مظہر ہے[2]،

در کارگاہ چرخ اگر نیک و گر بدم ایں دولتم بس است کہ از خاک مشہدم

میں دنیا میں خواہ نیک ہوں یا بد، میرے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ میں خاک مشہد سے تعلق رکھتا ہوں،

زیر بحث شاعر غزالی مشہدی کی تعلیم کس طرح ہوئی، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، وہ کن مدرسوں میں زیر تعلیم رہا، کتنی تعلیم حاصل کی، اساتذہ کون کون تھے، اس کے طالب علم ساتھیوں میں خاص خاص کون تھے، یہ سارے سوالات تشنۂ معلومات ہیں، لیکن اس کی تعلیمی استعداد کی اس ناواقفیت کے باوجود ہم غزالی کی استعداد سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ اس کے گہرے علم اور فنی پختگی کا مظہر ہے، قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات، مثنویات، ترجیع و ترکیب بند، سب کے سب سنجیدہ اور متین عنوانات پر مشتمل اور علم و حکمت کے نادر نکات سے پر ہیں حتی کہ اس کی ہجویات بھی اس کی مہارت فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں، مثنوی "نقش بدیع" اور "اسرار مکتوم" دونوں تصوف و معرفت کے باب میں ایک بیش قیمت

---

[1] عرفات العاشقین (تقی اوحدی)، ص ۲۰۰ جلد ۲ [2] مشہد مقدس کا قدیم نام "طوس" ہے، شاہنامۂ فردوسی میں بار بار مشہد کے بجائے طوس ہی نظم ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں ایک شعر بھی بہت مشہور ہے، ۵۔

ہر وزیر و شاعر و ملا کہ او طوسی بود چوں نظام الملک، غزالی و فردوسی بود

اضافہ ہیں، اس کے علاوہ اس کے ان نثری کارناموں کو بھی کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جن کے ذریعہ غزالی مشہدی عوام و خواص سے متعارف ہونے سے لیکر ان کے درمیان معروف و مقبول ہونے کی منزل تک پہونچا اس کے ذہن کی رفعت پرواز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مروجہ علوم سے پوری طرح آگاہ تھا، غزالی کی علمی اور فنی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صاحب "ہفت اقلیم" امین احمد رازی نے لکھا ہے[1]

"مولانا غزالی بفضائل و کمالات	مولانا غزالی اپنے صوری و معنوی کمالات
صوری و معنوی محلی بودہ"	اور فضائل سے مزین تھے،

ملا بدایونی[2] کے علاوہ سارے تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ غزالی کا شمار پہلے درجے کے شعراء میں ہوتا ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر تذکروں میں اس کی شاعرانہ عظمت کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کی شاعری کی ابتدا کہاں، کیسے اور کب ہوئی؟ اس سوال کا جواب ذیل کی سطروں میں دیا جاتا ہے،

غزالی کی شاعری کی ابتدا کے بارہ میں صادقی کتابدار کا قول قابل غور ہے اس کی روشنی میں یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے نہ صرف شعر و شاعری سے تعلق رکھتا تھا، بلکہ کم عمری ہی میں باقاعدہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکا تھا، صاحب تذکرہ مجمع الخواص صادقی کتابدار کی تحریر ملاحظہ ہو[4]

"در اوائل عمر شاعر شناختہ شدہ بود	وہ اوائل عمر ہی میں بحیثیت شاعر متعارف
نوری دندانی را ہجو گفت شہرتی	ہو چکا تھا، اور جب اس نے نوری

---

[1] تذکرہ ہفت اقلیم امین احمد رازی ص؟ [2] منتخب التواریخ (ملا بدایونی) ص ۰۰۰، [3] اگرچہ در سخن اور تبۂ عالی دیوان ندارد [4] تذکرہ مجمع الخواص (صادقی کتابدار) ص ۱۳۸،

دندانی کی ہجو کی تو بہت شہرت پائی، مبنزا یافت؟

تذکرہ نگار موصوف نے صاف طور بتایا ہے کہ وہ اوائل عمری ہی میں بحیثیت شاعر متعارف اور مشہور ہو گیا تھا، نوری دندانی کی مذکورہ ہجو بھی اسی جدوجہد کی مثال ہے،

غزالی کے دیباچہ دیوان آثار الشباب میں بھی کوئی واضح اطلاع اس کی ابتدائے شاعری سے متعلق نہیں ملتی البتہ اسکے دیباچۂ دیوان میں نثری تحریر کے ضمن میں ایک قطعہ درج ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنا تخلص غیرشعوری طور پر یا کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ بذات خود نہایت غور و فکر کے بعد منتخب کیا تھا جو اس کے حسن ذوق کا ثبوت ہے[1]،

غزالی شد غزل گوی شمارم بوصف طلعت یوسف جمالاں
چو آہو بودہ ام از خورد سالی سگ آہوی چشم خورد سالاں
غزالی بہر آں کردم تخلص کہ دیدم بوی ہا از غزالاں

مندرجۂ بالا قطعہ سے واضح ہے کہ اس نے اپنا تخلص غزالی صرف اس لیے منتخب کیا کہ اسے انسانوں میں حسن خلوص . اور لطیف احساس جمال کا شائبہ نظر آرہا تھا،

ظاہر ہے کہ غزالی نے جب اوائل عمر سے شاعری کی باقاعدہ ابتدا کردی تھی کچھ ہی عرصہ میں اسے اپنے ہمعصروں میں شہرت بھی حاصل ہو گئی تھی، تو یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس نے اپنا تخلص بھی ابتدا سے شاعری ہی میں منتخب کیا ہوگا، اس لئے کہ اس کے ابتدائی کلام کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان کی روشنی میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ شاعری کے آغاز سے انتہا تک وہ اپنے ایک ہی تخلص کو برابر استعمال کرتا آیا ہے تخلص کے بدلنے کی کوئی روایت نہیں مل سکی،

---

[1] دیوان آثار الشباب (غزالی مشہدی) ص ۱۵،

غزالی کے معاصر اور عہد قریب کے تذکرہ نویسوں نے اسکی ایران کے شاہی دربار سے وابستگی کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، صاحب مجمع الخواص کے بیان سے البتہ یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ شاہ طہماسپ کے دربار سے کسی نہ کسی حیثیت سے متعلق رہا تھا، اور پھر اسی کے خوف سے اُس نے ہجرت اختیار کی، چنانچہ اس سلسلہ میں بھی صادقی کتابدار کی درج ذیل عبارت بڑی اہم ہے[1]،

در زمان شاہ مرحوم تہمت	شاہ مرحوم کے زمانہ میں ان پر الزام
زدہ ای اندیشیدہ و مہاجرت	لگایا گیا، جس کے خوف سے اغول
اختیار کردہ ؟	نے ہجرت اختیار کی،

اس بیان سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ غزالی کا شاہ طہماسپ سے گہرا ربط تھا اور اس کا شمار دربار کے باعزت اور قابل قدر اشخاص میں ہوتا تھا، شاہ طہماسپ کے علاوہ ایران کے کسی امیر، وزیر یا رئیس کے دربار سے غزالی کی وابستگی کا اور کوئی حال نہیں معلوم لیکن طہماسپ کے دربار سے اس کے تعلقات کے بارے میں ایک اور اہم شہادت ملتی ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیام ایران کے دوران وہ خاصے عرصہ تک شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ رہا، غزالی کی پیدائش یعنی ۹۳۰ھ سے لے کر ۹۵۰ھ تک ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی، لیکن ۹۵۰ھ میں شاہ طہماسپ کے حکم کی تعمیل میں خواجہ امیر بیگ کجی معزول و محبوس وزیر کی ہجو اور سر زنش کرنے کے لئے اس نے سفر شیراز اختیار کیا، اس وقت غزالی کی عمر بائیس برس کی رہی ہوگی، اور چونکہ اس واقعہ کے فوراً بعد خود اس پر عتاب نازل ہوا اور مجبوراً اسے ترک وطن کرنا پڑا، اس لئے یہ زمانہ ایران میں اس کے فنی شباب کا زمانہ کہا جا سکتا

---

[1] مجمع الخواص صادقی کتابدار

ہے، اس عمر سے پہلے وہ کسی اور دربار سے وابستہ ہوا نہ ہو، لیکن بائیس برس کی عمر کے بعد ہجرت کے وقت تک وہ شاہ طہماسپ کے دربار سے وابستہ رہا، اور اسی کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر عازم ہندوستان ہوا، آقای سعید نفیسی نے اپنی تالیف میں غزالی مشہدی کے حالاتِ زندگی اور امیر بیگ بجمی کی سرزنش کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کی ہے، آقای نفیسی کے الفاظ ملاحظہ ہوں[1]،

"در سال ۹۵۵ھ غزالی در اردوی	۹۵۵ھ میں غزالی شاہ طہماسپ کے دربار
شاہ طہماسپ بود و شاہ او را بر ردوی	میں تھا، شاہ نے اس کو پیغام بھیجا کہ وہ
فرستاد کہ اشعارے در سرزنش وی	امیر بیگ کی ہجو میں کچھ اشعار کہے، اس
بگوید، پس از آن کہ تہمت بد	کے بعد اس پر لادینیت کا الزام عائد
مذہبی خواستہ اند او را آزار دہند	کر کے اس کو اذیت دی گئی، جس کی وجہ
ہندوستان رفتہ"	سے وہ ہندوستان چلا گیا،

شاہ طہماسپ کے دربار میں غزالی پر کیا گذری اور اس نے ترک وطن کا فیصلہ کیوں کیا، پھر ترک وطن کر کے کن مرحلوں سے گذرتا ہوا وہ اکبر کے دربار میں پہونچا، اور کس طرح "ملک الشعراء" کے درجہ تک ترقی کی، اس کی تفصیلی بحث آیندہ سطور میں ملاحظہ ہو،

جیسا کہ اس مقالہ کے آغاز میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ جس دور سے زیر نظر شاعر غزالی مشہدی کا تعلق ہے، اس دور کے ایرانی حکمرانوں اور خصوصاً شاہ طہماسپ نے مذہب اور علمائے مذہب سے متاثر ہو کر شعرائے ایران کو یہ ترغیب دی تھی کہ وہ امراء و سلاطین کے بجائے صرف ائمہ کرام کی شان میں قصائد لکھا کریں، اس حکم کی خلاف ورزی کرنے

---

[1] نظم و نثر در ایران و در زبان فارسی سعید نفیسی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۴۰۴،

والے معزول و معتوب ہوتے تھے، مذہبی شاعری کے علاوہ اور تمام دروازے بند ہونے کی وجہ سے شعرائے ایران میں گھٹن کا احساس بڑھنے لگا اور وہ ہندوستانی درباروں فیاضیوں کا ذکر سُن کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے،

صاحب تاریخ عالم آرائے عباسی نے اس دور کے ایران کے بدلے ہوئے حالات روشنی ڈالتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے[1]،

مجملاً در زمانِ دولت ہمایوں آں حضرت	مختصر یہ کہ اس عہد میں لوگوں میں تقوی
خلائق و عباد اللہ تقوی و پرہیزگاری	و پرہیزگاری کا اس حد تک غلو تھا کہ قصہ
بہ نوع مبالغہ فرمودند کہ قصہ خوانان	خوانوں کے لئے ایسے امور کا بیان ممنوع
معرکہ گیران از انچہ بوے کہ در و شائبہ	قرار دیدیا گیا جن میں لہو لعب کا شائبہ
لہو و لعب باشد ممنوع گشتہ"	بھی پایا جاتا تھا،

اسکندر بیگ ترکمان کی تحریر سے یہ بات طے ہوگئی کہ ایران کے ادبی حالات متزلزل ہونے کے سبب وہاں کے نامور شعرا بے قدری کا شکار ہوکر عازم ہندوستان ہو رہے انہی نامور شعرا میں زیر بحث غزالی مشہدی بھی شامل ہے، جو اولاً تو شاہ طہماسپ کے لشکر سے وابستہ رہا اور شاہانہ فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتا رہا، لیکن بعد میں شاہ طہماسپ کی نگاہوں سے اتر گیا، اس کے لئے الحاد اور مذہبی بے اعتدالی کے الزام میں قتل کا حکم ہوگیا، مجبوراً عراق سے براہ فارس آبی راستے سے وارد ہند ہوا شروع میں کچھ دن دکن میں پھر شمالی ہند کا رُخ کیا اور بعد میں دربار اکبری میں "ملک الشعرا" کے خطاب سے نوازا گیا ملا بدایونی جو اس واقعہ کے راوی ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں[2]،

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی، اسکندر بیگ ترکمان [2] منتخب التواریخ، بدایونی، نیگور لائبریری لکھنؤ، ص ۱۰۰

چوں بتقریب الحاد و بے اعتدالی	جب عراق میں اسکے الحاد اور مذہبی
در عراق قصد کشتنِ او کردند آنجا	بے اعتدالی کے الزام میں اس کے قتل
بدکن فرار نمود، پس بہند آمد	کا ارادہ کیا گیا تو وہ وہاں سے دکن کو فرار
چند سال پیش خان زماں بود، بعد	ہو گیا اور ہندوستان آیا... چند سال خانزماں
از آں بملازمت بادشاہی رسیدہ	کے حضور میں رہا، اس کے بعد ملازمت شاہی
خطابِ ملک الشعرائی یافت "	میں آکر ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا

علاء الدولہ کامی نے نفائس المآثر میں اسی واقعہ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تحریر کیا ہے[1]،

در فرصتی کہ ملا در دکن بود.....	جس وقت ملا دکن میں تھا.... علی قلی
علی قلی خاں یک ہزار روپیہ خرچ	خاں نے اس کو زادِ راہ کے لئے ایک ہزار
راہ جہت ملا فرستاد ..... بعد از	روپیہ بھیجا..... علی قلی خاں کے قتل کے
قتل علی قلی خاں چنانکہ مذکور شدہ	بعد جیسا کہ مذکور ہوا، درگاہ معلیٰ میں
است باین درگاہ معلی آمدہ بعنایات	آیا، اور عنایات شاہی سے سرفراز ہو کر
بادشاہانہ سرفراز و ارجمند شد و خطاب	ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا،
"ملک الشعرائی" یافت "	

سوال یہ ہے کہ ترک وطن کرتے وقت غزالی نے ہندوستان کی راہ کیوں اختیار کی اور سب سے پہلے دکن کا انتخاب کیوں کیا؟ اس سوال کا قطعی جواب تلاش کرنے کے لئے ہمیں غزالی کے حالات زندگی کی تفصیلات میں جانا ہوگا اور اس عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی حالات کا دقتِ نظر سے جائزہ لینا ہوگا کہ کیا شاعر مذکور کے سامنے کوئی خاص

---

[1] نفائس المآثر، علاء الدولہ کامی، ٹیگور لائبریری، لکھنؤ ص ۳۶ - ۵۲۵؛

مجبوری تھی، جس کے سبب اس نے اکبر اور امرائے اکبر کے درباروں کو چھوڑ کر دکن میں
لی، یا یہ محض اس کی پسند تھی؟

مندرجۂ بالا سوال کو دو حصوں میں بانٹ کر پہلے نصف اوّل حصہ پر بحث کا
کیا جاتا ہے کہ وہ کون سی وجہیں تھیں جن کی بنا پر غزالی نے دکن کا انتخاب کیا،

ایران سے مراجعت کر کے ہندوستان آکر وقت غزالی نے دکن کو اپنی پہلی منز
کیوں بنایا اور دکن سے فوراً ہی شمالی ہند کا رُخ اختیار کیوں کیا؟ اس سوال کا جوا
تلاش کرتے وقت یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ ایران کی ادبی زبوں حالی کی وجہ۔
وہاں کے بیشتر ادبا و شعرا وطن ترک کر کے ہندوستان آرہے تھے، چونکہ اس دور
ایران سے ہندوستان کا سفر کرنے کے لئے سمندر سے زیادہ محفوظ اور کوئی راستہ نہ
نیز ہندوستان کے بندرگاہ صرف دکن ہی میں تھے، اور ان کا فاصلہ بھی جنوبی ایر
سے بہت کم تھا، اس لئے ایران سے یہاں آنے والے لوگ لازمی طور پر پہلے دکن ہی پہ
ہوتے تھے، اور یہاں پہونچ کر دکن ہی کی کسی ریاست یا دربار سے وابستہ ہو جاتے یا
سے شمالی ہند کا رُخ کرتے، اور جہاں بھی ان کی قدر و منزلت ہوتی وہیں کے ہو رہ
غزالی کا دکن آنا اسی لئے ناگزیر ہے، سمندری راستے سے اس کے ہندوستان سفر کر
کی شہادت بھی ملتی ہے، صاحب "عرفات العاشقین" نے تحریر کیا ہے[1]،

گویند چوں از خراساں بعراق و	کہتے ہیں کہ جب وہ خراسان سے عراق و
فارس آمد از آنجا رغبت بہند نمودہ	ایران آیا تو وہاں سے ہندستان کا رُخ
از راہ دریا بدکن افتاد؟	کیا اور سمندری راستے دکن میں وارد ہوگیا

[1] عرفات العاشقین، تقی اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص ۵۰۲، ج ۲،

تذکروں اور تاریخوں میں غزالی کے سفرِ ہند اور دکن میں قیام کا ذکر مختصراً ملتا ہے لیکن دکن کے قیام کے زمانے کے حالات بالکل نہیں ملتے، ممکن ہے وہ دکن میں اپنے قدم نہ جما سکا ہو اور ناقدری سے پریشان ہو کر صوبہ دار جون پور کی دعوت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

علی قلی خاں صوبہ دار جونپور نے غزالی کی دکن میں بیقدری کا حال سن کر اسے ایک ہزار روپیہ اور ایک قطعہ لکھ کر بھیجا تھا[1]

ای غزالی بحق شاہ نجف		که سوی بندگان بیچون آئی
چونکه بیقدر بودهٔ آنجا		سر خود گیر و زود بیرون آئی

چونکہ علی قلی خاں بڑا لائق اور ذی علم شخص تھا اس نے اپنے فنی کمال کا مظاہرہ مندرجۂ بالا قطعہ میں بھی کیا ہے، قطعہ کا آخری مصرع ہے "سر خود گیر و زود بیرون آئی"۔ — سر خود گیرد — غزالی کا سر — یعنی غین — برابر ایک ہزار — جیسا کہ آیندہ تحریر کیا جائیگا اس دعوت کو غزالی نے قبول کر لیا اور دکن سے فوراً شمالی ہند کا سفر کر کے جون پور کو اپنا مسکن بنایا، اور ایک مختصر مدت تک جون پور میں علی قلی خاں اور اس کے بھائی بہادر خاں کے ساتھ رہا، پھر علی قلی خاں کے قتل کے بعد اکبر کے دربار میں اس کی رسائی ہو گئی۔

علی قلی خاں کے یہاں غزالی کی سرپرستی کا یہ واقعہ متعدد تذکروں میں درج ہے کہ اس نے ایک ہزار روپیہ، گھوڑے اور دوسرے تحائف بھیج کر اسے دکن چھوڑ کر جون پور آنے پر آمادہ کیا، اس سلسلہ میں منتخب التواریخ، عرفات عاشقین، ہفت اقلیم، مجمع النفائس، نفائس المآثر، ہفت آسمان، نتائج الافکار اور ید بیضا وغیرہ نے یک زبان یہی بیان کیا ہے، جونپور پہونچنے کے بعد علی قلی خاں کی نوازش کے علاوہ اس کے بھائی بہادر خاں کی نظرِ عنایت بھی غزالی پر رہی، صاحبِ عرفات عاشقین

---

[1] منتخب التواریخ، ملا بدایونی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۱۷۰

تقی اوحدی نے لکھا ہے[1]،

"کتاب نقش بدیع بل گوہر شاہوار و غیرہ اکثر در خدمت ایشاں شدن"

غزالی کی مثنوی "نقش بدیع" (جو کہ نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کے طرز پر اسی وزن میں ہے) کے سلسلے میں تذکروں میں مرقوم ہے کہ یہ ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے، غزالی نے مذکورہ مثنوی اپنے ممدوح اور سرپرست علی قلی خاں کی فرمایش پر لکھی تھی اور اس کے ہر شعر پر اس سے ایک اشرفی فی شعر کے حساب سے ایکہزار طلائی سکے انعام کے طور پر حاصل کئے تھے، صاحب ہفت اقلیم امین احمد رازی نے اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہوئے لکھا ہے[2]،

غزالی سالہا بخانزماں بسر بردہ	غزالی برسوں لخانزماں سے وابستہ رہا، اس
نقش بدیع را در آں زماں منظوم آوردہ	زمانہ میں اس نے نقش بدیع نظم کی اور ہر شعر کے
مثنوی در عوض ہر بیتے یک طلائی صلہ یافتہ	عوض میں ایک اشرفی انعام میں پائی،

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ خزانہ عامرہ میں ہفت اقلیم کے مندرجہ بالا اقتباس کی صداقت پر روشنی ڈالتے ہوئے اصل واقعہ کی تائید بھی کی ہے، اور نقش بدیع کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں جو علی قلی خاں کی مدح میں ہیں[3]،

نقش بدیع کہ ہزار بیت است بر ہر	ترجمہ	نقش بدیع ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے،
بیت یک اشرفی صلہ یافت، در یں		اس نے ہر شعر پر ایک اشرفی انعام پایا
کتاب مدح خانزماں میکند و می گوید		اس کتاب میں وہ خانزماں کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے

خان زماں صاحب امن و اماں   پیش رو مہدی آخر زماں

---

[1] عرفات عاشقین، تقی اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۲۰۵ ج ۲ [2] ہفت اقلیم، امین احمد رازی ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۷۰۱ [3] خزانۂ عامرہ آزاد بلگرامی ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۳۶۲،

آنکہ خرد یافتہ منشور ازو — چشمۂ خورشید سخن نور ازو
نے بسخن از ہمہ کس بیشتر — در ہمہ فن از ہمہ کس بیشتر
داد گرمش تو جاوید باد — ظل تو ہمسایۂ خورشید باد
بخت کہ القاب تو پرزر نوشت — تیغ ترا اسد سکندر نوشت

مثنوی نقشِ بدیع کے مندرجہ بالا اشعار سے اس بیکراں محبت اور غیر معمولی عقیدت کا پتہ چلتا ہے، جو غزالی مشہدی کو اپنے ممدوح اور سرپرست علی قلی خاں کی ذات سے تھی۔ اس ذاتی دلچسپی اور وابستگی کے پیچھے غزالی کے ذہن و دل میں جو جذبہ پوشیدہ ہے، وہ مذکورۂ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے اپنے ممدوح کو نمایاں اور منفرد ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، اور اس کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت سے قریب اور کذب دریا سے بہت دور ہے، وہ علی قلی خاں کی سرپرستی اور نوازش سے مطمئن تھا۔

تذکروں اور تاریخی کتابوں میں اس دور کے حالات کو بہت مختصر اور مبہم ہیں، لیکن اس ہمہ خانزماں کے دربار سے وابستگی پھر اس کے قتل کے بعد آخر عمر تک اکبر کے دربار سے تعلق یقینی ہے۔

آئینِ اکبری مصنفۂ ابو الفضل مرتبہ سرسید احمد خاں میں غزالی کے حالات کے بارہ میں حاشیہ پر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، اس سے مذکورۂ بالا امر کی تصدیق ہوتی ہے، ملاحظہ ہو۔[۵]

بالجملہ مولانا بجونپور آمد، مدتے بخدمت — خلاصہ یہ کہ مولانا جون پور آئے، ایک
خانزماں اند بعد از آں کہ خانزمان — مدت تک خانزماں کے ساتھ رہے پھر ان کے
بقتل رسید او بحضور شاہی رسید، — قتل کے بعد دربار شاہی میں رسائی حاصل کی۔

---

۵ آئینِ اکبری، ابو الفضل، مقدمہ لائبریری لکھنؤ ص ۱۶۲

اس سلسلہ کی سب سے واضح جامع اور مختصر تحریر ملا بدایونی کی ہے، جس کے ذریعہ ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ غزالی اکبر کے دربار میں پہونچنے کے بعد خطاب ملک الشعراء سے نوازا گیا، صاحب منتخب التواریخ کے الفاظ درج ذیل ہیں[1]،

چند سال پیش خان زمان بود بعد از آں	چند سال خان زماں کے حضور میں
بملازمت بادشاہی رسیدہ خطاب	رہا اس کے بعد دربار شاہی میں پہنچکر
ملک الشعرا یافت،	ملک الشعراء کا خطاب پایا،

اسی سلسلے میں تذکروں اور تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزالی تیموری حکومت کے دور میں سب سے پہلے ملک الشعراء کے خطاب سے بہرہ مند ہوا، ابو طالب محمد بن محمد اصفہانی نے تذکرہ "خلاصۃ الافکار" میں ملا غزالی مشہدی کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے، جس کو ہندوستان میں سب سے پہلے خطاب ملک الشعراء سے موسوم کیا گیا، ابو طالب کے الفاظ درج ذیل ہیں[2]،

"او اوّل کسی است کہ در ملک ہند بملک الشعرائی موسوم گردید"

غزالی کی اخیر عمر کا وہ حصہ جو مغل دربار میں گذرا اس کی زندگی کا زرین دور قرار دیا جا سکتا ہے، مغل دربار میں اس کی ایسی قدر و منزلت ہوئی اور اس کی خدمات کا اتنا اعتراف کیا گیا جو کسی صاحب کمال کے لئے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس زمانہ میں غزالی نے پوری توجہ کے ساتھ اپنے ادبی سرمایہ میں اضافہ کی کوشش کی اور بحث و مباحثہ میں شریک ہو کر اپنی ذہانت و فطانت کی بنا پر اپنے ہمعصروں پر فوقیت حاصل کی، دربار اکبری کے ایک

---

[1] منتخب التواریخ، بدایونی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ، ص ۱۷۰،

[2] خلاصۃ الافکار، ابو طالب اصفہانی، خدا بخش لائبریری پٹنہ،

امیر قلیچ خاں المتخلص بہ الفتی[1] سے غزالی کے جو ادبی معرکے ہوئے اور ہجویات کے جو باہمی تبادلے ہوئے، اُن میں غزالی نے اپنے حریف کو شکست دے کر اکبر کی نگاہوں میں اپنا مقام بنا لیا۔ اکبر نے ان مباحث میں غزالی کی حاضر دماغی اور ذہانت کا اعتراف کیا، دراصل اکبر کے دربار میں اس قسم کے ادبی مباحثے اور معرکے برابر ہوتے رہتے تھے، اور ایسے مباحثوں میں حصہ لینے کے لئے بادشاہ کی جانب سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی،

غزالی ان معرکہ آرائیوں میں کامیابی سے سرشار ہو کر لطف و مسرت اور راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا، لیکن کبھی کبھی ماحول میں تنہائی کا احساس بھی ہوتا، بالآخر فرشتۂ اجل نے دستک دی، کہتا ہے[1] ؎

جان دادم و فارغ شدم از محنت ہجراں		یعنی کہ ز شبہائے دگر بہترم امشب

اسی مضمون کے ایک اور شعر میں بھی غزالی نے اپنی خوش حال زندگی اور وفات کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

چراغ عمر نشاندم بیک نفس دم مرگ		کہ بہتر است نشاندن بوقت خواب چراغ

اگرچہ ہندوستان اور ایران کے آسمان ادب پر چوالیس[۴۴] برس سے جھلملانے والا درخشندہ چراغ بجھ گیا اور دنیا کی آنکھیں اس کی شخصیت کی رنگینی اور ذہانت و ذکاوت کے واقعات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئیں، لیکن اس کے کلام کی درخشندگی آج تک دنیائے شعر و ادب کے لیے مشعل راہ بنی ہوئی ہے، تذکرہ نویسوں کی ایک بڑی تعداد اس امر پر متفق ہے کہ غزالی کی موت جمعرات ۲۷ رجب ۹۸۰ھ کو احمد آباد گجرات میں ہوئی، اور بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے حکم سے اس کی تدفین موضع سرکیچ کے اس قبرستان میں

---

[1] عرفات عاشقین، تقی اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۴۴۲ (ج ۲)

ہوئی جہاں شاہی خاندان کے لوگ اور مشایخ کبار کی تدفین عمل میں آتی تھی، متعدد تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کی موت پر فیضی قاسم کاہی اور میر اسیری نے قطعات تاریخ لکھے تھے، صاحب منتخب التواریخ نے غزالی کی وفات اور اس کی تدفین کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان دیا ہے قاسم کاہی کا کہا ہوا قطعہ تاریخ بھی منتخب کی تحریر میں شامل ہے[1]،

وفاتش در شب جمعہ بیست و ہفتم	اس کی وفات اچانک ۲۷ رجب ۹۸۰ھ
ماہ رجب در سنہ نہصد و ہشتاد (۹۸۰)	بروز جمعرات احمد آباد میں ہوئی، شاہ
بجارۂ دفعتہ در احمد آباد واقع شد و بندگان	وقت نے حکم دیا کہ اس کو سرکھیج کے اس
بادشاہی حکم فرمودند تا او را در سرکھیج	قبرستان میں دفن کیا جائے جو مشائخ کبار
کہ مقبرۂ مشائخ کبار و سلاطین سابقہ	اور گذشتہ سلاطین کا مدفن ہے، قاسم
است دفن کردند و قاسم ارسلان	ارسلان نے قاسم کاہی کی زبان سے یہ قطعۂ
از زبان قاسم کاہی این تاریخ گفت	تاریخ کہا

قطعہ

بود گنجی غزالی از معنی — مدفنش خاک پاک سرکھیج است

بعد یک سال سال تاریخش — احمد آباد و خاک سرکھیج است

غزالی کی موت سے متاثر ہو کر اس کے ایک ہمعصر شاعر میر اسیری نے جو قطعہ تاریخ [illegible] لکھا تھا وہ بھی درج ہے، میر اسیری کے قطعۂ تاریخ سے بھی مادہ نو سو اسی (۹۸۰) ہی نکلتا ہے، جس سے تذکرۂ مذکورہ کے گذشتہ بیان کی پوری طرح تصدیق ہو جاتی ہے، اسیری کا قطعہ منقول نفائس المآثر درج ذیل ہے[2]،

۱؎ منتخب التواریخ بدایونی، ٹیگور لائبریری لکھنؤ ص ۱۷۰، ۲؎ نفائس المآثر علاؤ الدولہ کامی ٹیگور لائبریری لکھنؤ ۵۵

غزالی رفت چوں بیروں ز عالم	ز چشم اہل معنی جوی خوں رفت
نشانِ جستم ز تاریخش خرد گفت	زکانِ فضل یک گوہر بدوں رفت

قطعہ تاریخ کے آخری مصرعہ سے مادۂ تاریخ برآمد ہوتا ہے، اسیری نے کہا ہے، ع

زکانِ فضل یک گوہر بدوں رفت

"زکانِ فضل" کے اعداد نو سو اکیاسی (۹۸۱) ہوتے ہیں اور اگر شاعر کی ہدایت کے مطابق صنعت تخرجہ کا استعمال کرکے اس میں سے ایک عدد گھٹا دیا جائے تو مادۂ تاریخ نو سو اسی (۹۸۰) بچتا ہے، اس فیصلہ کی تصدیق کے لئے ذیل میں چند تذکروں کے نثری اقتباسات اور فیضی کا لکھا ہوا وہ قطعہ تاریخ وفات نقل کیا جارہا ہے، جس میں اس نے غزالی کی وفات کا سنہ نو سو اسی (۹۸۰) قرار دیا ہے، غزالی کے دور سے قریب ترین تذکروں میں عرفات العاشقین بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، غزالی کی وفات کے سلسلہ میں اس کی تحریر درج ذیل ہے[1]،

"شیخ فیضی نسبت اعتقاد و ارادت بخدمت وی بسیار داشتہ و تاریخ فوتش گفتہ است"

قدوۂ نظم غزالی کہ سخن	ہمہ از طبع خدا داد نوشت
عقل تاریخ وفاتش بدو طرہ	سنۂ نہصد و ہشتاد نوشت (۹۸۰ھ)

مندرجۂ بالا تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی عقیدت اور ارادت کے پیش نظر فیضی نے غزالی کی وفات سے متاثر ہو کر جو قطعۂ تاریخ لکھا ہے اس کے آخری مصرعہ "سنہ نہصد و ہشتاد" کے ذریعہ غزالی کے سنہ وفات نو سو اسی ہجری (۹۸۰) پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، اور مذکورہ سنہ کو حرف آخر قرار دیدیا ہے،

---

[1] عرفات عاشقین، قلمی، اوحدی، خدا بخش لائبریری پٹنہ ص ۵۲۰ ج ۲۔

عجیب اتفاق ہے کہ مذکورۂ بالا معتبر تاریخی شواہد کے باوجود "ریاض العارفین" اور "آتشکدہ" میں درج ہے کہ غزالی کی وفات آگرے میں ہوئی لیکن گذشتہ صفحات میں متعدد معتبر اور باوثوق ذرائع سے یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ غزالی کی موت اس وقت واقع ہوئی تھی جب وہ شاہی قافلے کے ساتھ گجرات جا رہا تھا، اور اس کی موت کے بعد شہنشاہ اکبر نے یہ حکم دیا تھا کہ اسے سرکیج کے شاہی قبرستان میں دفن کیا جائے، جہاں عام طور پر شاہی خاندان کے لوگ سپرد خاک کئے جاتے تھے، جب غزالی کی موت احمد آباد گجرات کے سفر کے دوران ہوئی تو پھر اس کی جائے وفات آگرہ میں بیان کرنا غلط نگاری نہ سہی سہو قلم تو ہے ہی،

سلسلۂ شعر العجم

فارسی شاعری کی تاریخ، اس کے تدریجی ارتقا، اور عہد بعہد کے ممتاز فارسی شعراء کے حالات اور اُن کے کلام پر تبصرہ پر مولانا شبلی کی مقبول ترین کتاب جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے،

شعر العجم حصہ اوّل :۔ عباس مروزی سے نظامی تک کا تذکرہ اور انکے کلام پر تنقید و تبصرہ قیمت ۱۰-۹۵

" دوم :۔ خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت ۸-۷۵

" " سوم :۔ فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت ۶-۲۵

" " چہارم :۔ شاعری کے تمام انواع و اقسام و اصناف میں مثنوی خصوصاً شاہنامہ فردوسی پر بسیط تبصرہ قیمت ۹-۴۰

" " پنجم :۔ عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ قیمت ۷-۸۰

"منیجر"

حافظ ابوبکر احمد بن علی مروزی اور ان کی مسند

از مولوی بدرالزماں صاحب نیپالی مرکزی دارالعلوم بنارس

علم حدیث کی تاریخ میں دوسری اور تیسری صدی ہجری کا زمانہ بہت اہم ہے، اس دور میں بڑے بڑے محدثین اور ارباب فن پیدا ہوئے، حدیث کی اکثر اہمات کتب اسی زمانہ کی یادگار ہیں، اس دور میں حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں فقہی ابواب کے تحت بھی حدیثیں جمع کی گئیں اور صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر بھی، اس دوسرے طریقہ پر جو کتابیں مرتب کی گئیں ان کو مسند کہا جاتا ہے، مسانید کی ترتیب و تدوین بھی دو طریقوں پر کی گئی ہے، اول یہ کہ بہت سے صحابۂ کرام کی مرویات یکجا مرتب کی گئیں، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کسی خاص صحابی کی حدیثوں کا ایک علٰحدہ مجموعہ مرتب کیا گیا،

تمام صحابۂ کرام میں خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدّیق کی جو اہمیت ہے، ظاہر ہے اس بنا پر ان کی جانب بھی محدثین کرام نے توجہ کی، امام ابو اسحٰق ابراہیم بن سعید جوہری بغدادی (م سنہ ۲۴۴ھ) نے اس کام کو زیادہ بالغ نظری سے انجام دیا تھا، ابن عماد حنبلی متوفی سنہ ۱۰۸۹ھ نے شذرات الذہب میں ان کی اس کتاب کا ذکر کیا ہے[1]، لیکن اب وہ نایاب ہے، مگر ان کے قریب العہد محدث حافظ ابوبکر مروزی نے بھی اسی انداز پر حضرت ابوبکرؓ کی حدیثیں جمع کی تھیں، خوش قسمتی سے چند سال ہوئے اُن کی یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئی،

---

[1] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۱۳ مطبوعہ مصر سنہ ۱۳۵۰ھ،

اس کی اہمیت کی بناپر اس کے مقدمہ اور تذکرہ و تراجم کی بعض کتابوں کی مدد سے اسکی خصوصیات تحریر کی جاتی ہیں، اور شروع میں مصنف کے جو حالات تلاش کے بعد معلوم ہوسکے، ان کو پیش کیا جاتا ہے،

نام ونسب | احمد نام، ابوبکر کنیت اور سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ احمد بن علی بن سعید بن ابراہیم

پیدائش | مورخین اور ارباب سیر نے ان کے سنہ ولادت کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر صحیح قول کے مطابق ان کی وفات ذی الحجہ سنہ ۲۹۲ھ میں ہوئی، ان کے شاگرد ابن المفسر کا بیان ہے کہ وفات کے وقت وہ لگ بھگ نوّے سال کے تھے[1]، اس لحاظ سے وہ سنہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے،

خاندان ووطن | امام ابوبکر مروزی اور اموی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن مرو کا مردم خیز شہر ہے، مگر خطیب بغدادی کا یہ بیان کہ

"مجھ سے ایک قابلِ اعتماد اور واقف کار شخص نے بیان کیا کہ وہ بغداد کے رہنے والے تھے"[2]

تو ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ ابوبکر مروزی کی ابتدائی زندگی مرو میں گذری، لیکن جب وہ سن شعور کو پہونچے اور تحصیل علم وفن کی طرف متوجہ ہوئے تو بغداد میں جو اس زمانہ میں علوم وفنون کا مرکز تھا، بود وباش اختیار کر لی، وہ نسلاً اموی نہیں تھے، ولا کے تعلق سے اموی کہلاتے ہیں،

اساتذہ وشیوخ | انھوں نے اپنے زمانہ کے متعدد اہلِ علم سے استفادہ کیا تھا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وکان مکثرا شیوخا وحدیثا[3] — ان کے شیوخ اور مرویات کی تعداد

۱؎ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۲ ۲؎ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲ ۳؎ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۶۲،

تذکرہ نگاروں نے صرف مشہور اساتذہ کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چند نام حسب ذیل ہیں،

یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، علی بن مدینی، ابو بکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، محمد بن بشار[1]

تلامذہ | چند تلامذہ کے نام یہ ہیں،

ابو عبد الرحمن نسائی، ابو عوانہ، یعقوب بن اسحٰق، سلیمان بن احمد طبرانی، ابو احمد عبد اللہ بن محمد مفسر امام نسائی ان کے خاص تلامذہ میں تھے، ان سے بہت سی روایتیں کی ہیں، اپنی سنن میں انکے واسطے سے امام مالک سے بھی روایت کی ہے[2]،

حدیث میں درجہ و مرتبہ | ان کے حفظ و ضبط اور عدالت و ثقاہت پر علمائے حدیث کا اتفاق ہے، خطیب بغدادی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو خود بھی ثقہ قرار دیا ہے اور امام نسائی کے حوالہ سے بھی ان کی توثیق نقل کی ہے، ذہبی نے انھیں علم و فن کا خزانہ قرار دیا ہے، ابن عماد ان کی ثقاہت کے معترف ہیں[3]،

ان اقوال سے علم حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، احادیث کی روایت اور جمع و تدوین ان کا دل پسند مشغلہ تھا، گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود وہ ہمیشہ حدیث کی خدمت ذوق و شوق سے انجام دیتے تھے، اس اشتغال و انہماک کی بنا پر ان کے پاس حدیثوں کا وافی ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، اوپر حافظ ابن حجر کا یہ بیان نقل ہو چکا ہے کہ اساتذہ کی طرح ان کی حدیثوں کی تعداد بھی زیادہ تھی،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ [2] ایضاً و تہذیب التہذیب ص ۶۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۴۰۵،

[3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۱ اجدید اور شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۰۹،

فقہ: حدیث کی طرح فقہ میں بھی ممتاز تھے، فقہی مسائل پر اچھی نظر رکھتے تھے، اسی لئے حمص پر قاضی مقرر کئے گئے،

دوسرے علوم: حدیث وفقہ کے علاوہ دوسرے اسلامی علوم میں بھی کافی درک رکھتے تھے، لغت میں ان کی مہارت کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے،

درس وتدریس: درس وتدریس سے بھی ہمیشہ دلچسپی رہی، چالیس۴۰ پینتالیس۴۵ سال تک مسند درس پر متمکن رہ کر حدیث کے طلبہ اور علم کے شائقین کی تشنگی بجھاتے رہے،

عہدہ قضا: وہ مدتوں قضا کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، پہلے حمص کے قاضی مقرر کئے گئے اور آخر میں دمشق میں عہدہ قضا پر مامور کئے گئے، انھوں نے قضا کے فرائض ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ انتقال کے وقت تک اس منصب پر فائز رہے،[1]

وفات: مشہور روایت کے مطابق سنہ ۲۹۲ھ میں وفات پائی ان کے مشہور شاگرد ابن المنبہ بیان ہے کہ چہارشنبہ کے روز انتقال کیا، اور ۲۵ر ذی الحجہ کو تجہیز وتکفین کی گئی، بعض مورخین نے سنہ ۲۹۳ھ بھی سنہ وفات تحریر کیا ہے،[2]

تصنیفات: پہلے بتایا جا چکا ہے کہ احادیث کا درس وتدریس اور ان کی جمع وتدوین مرورز کا خاص مشغلہ تھا اس سے خیال ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کی تعداد زیادہ رہی ہوگی لیکن غالباً قدما کی طرح ان کی کتابیں بھی ناپید ہیں، راقم کو جن کتابوں کا پتہ چل سکا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱) کتاب العلم (۲) مسند عثمان (۳) مسند عائشہ (۴) کتاب الجمعہ۔

شعیب ارناؤط نے جن کی کوشش سے مسند ابی بکر صدیق شائع ہوئی ہے، لکھا ہے کہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱ جدید ایڈیشن [2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۶ تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۵۰۴،

"کتاب المعجم کا قلمی نسخہ المکتبۃ الظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے، اس کے راوی کا نام ابو طاہر سلفی ہے، انھوں نے مرشد بن یحییٰ بن القاسم سے اور انھوں نے ابو القاسم علی ابن محمد الفارسی سے اور انھوں نے عبد اللہ بن الناصح سے اور ابو عبد اللہ نے مصنف سے اس کی روایت کی ہے۔"[1]

(۵) **مسند ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ**: جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں صرف خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیان کردہ حدیثیں درج ہیں، مروزی نے ایک سو چالیس حدیثیں نقل کی تھیں، لیکن ان کے خاص شاگرد اور اس مسند کے راوی ابن المفسر نے مزید دو حدیثوں کا اضافہ کیا ہے، اس طرح اس میں منقول حدیثوں کی تعداد ایک سو بیالیس ہو گئی ہے۔ شعیب ارناؤوط کا بیان ہے:

"مسند مروزی کا جو مخطوطہ دمشق کی لائبریری "المکتبۃ الظاہریۃ العامرہ" میں موجود ہے اس میں چوالیس ورق ہیں، ہر صفحہ میں سولہ سطریں ہیں، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں، لیکن غالب گمان ہے کہ اس کو علی بن بقا الوراق المصری [illegible] نے لکھی تھا، کیونکہ جو سماعات مسند کے آخر میں ملحق ہیں وہ علی بن بقا کی قرأت سے ہیں اور سماعات کے آخری صفحہ پر سنہ ۴۴۲ھ تحریر ہے۔"[2]

امام مروزی سے ان کے لائق شاگرد ابن المفسر الدمشقی م ۳۶۵ھ نے اور ابن المفسر سے ابو القاسم علی بن محمد (م [illegible]ھ) نے اس کی روایت کی ہے۔[3]

حافظ احمد بن علی مروزی کا مقصد یہ تھا کہ اس مسند میں حضرت ابو بکرؓ سے روایت کرنے والے تمام بزرگوں کی سب حدیثیں یکجا کر دیں، اس بنا پر بعض کم درجہ کی حدیثیں بھی اس میں شامل ہو گئی ہیں، اور کہیں کہیں معمولی فروگذاشتیں بھی ہیں، جیسے حضرت عثمانؓ حضرت

۱؎ مقدمہ مسند ابی بکر الصدیق ص ۱۷ ۲؎ مقدمہ مسند ۳؎ ایضاً ص ۷،

حضرت انس بن مالکؓ حضرت اسماؓ بنت ابی بکر اور حضرت قبیصہ بن ذویبؓ کی حدیثیں دو دو جگہوں پر ہو گئی ہیں،
حافظ مروزی نے پہلے صحابہ کی روایتیں نقل کی ہیں، اس کے بعد تابعین کی مرویات
جمع کیے ہیں علوئے سند کی جانب بھی پوری توجہ کی ہے، چنانچہ بعض روایتوں میں صرف چار ہی
راوی ہیں، بعض روایتوں کے راوی اگرچہ دوسرے ہیں، لیکن چونکہ ان کے اندر کہیں نہ کہیں
درمیان میں حضرت ابو بکرؓ کا ذکر ہے اسلئے ان کو بھی مسند میں داخل کر لیا گیا ہے، مثلاً اس مجموعہ
کی جو ہترویں روایت یہ ہے،

حدثنا احمد بن علی قال حدثنا	.. ..
بشار قال حدثنا جعفر قال	.. .. .. حضرت انسؓ سے روایت
وقال ثابت عن انس قال النبی صلی اللہ	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
علیہ وسلم لابی بکر یا ابا بکر ما ظنک	ابو بکرؓ سے فرمایا اے ابو بکرؓ تمہارا ان دو
باثنین اللہ ثالثھما	شخصوں کی بابت کیا خیال ہے، جن کا

اس حدیث میں مروزی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف چار واسطے ہیں
اس لئے یہ رباعی حدیث ہوئی،

ابن المنیر نے جن دو روایتوں کا اضافہ کیا ہے، ان میں سے پہلی کو مسند میں داخل کرنے کی کوئی
وجہ نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ یہ روایت اس طرح ہے۔

عن سلمۃ بن نبیط عن ابیہ	حضرت نبیطؓ سے روایت ہے کہ وہ بیان
رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب	کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرفہ میں
بعرفۃ علی جمل احمر،	ایک سرخ اونٹ پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا

نہ اس حدیث کی سند میں حضرت ابو بکر کا نام آیا ہے، اور نہ اس کے متن ہی میں کہیں

ان کا ذکر ہے، ممکن ہے یہ کسی اور سند سے مروی ہو، اور اس میں حضرت ابو بکرؓ کا ذکر ہو یا یہ کسی دوسری جگہ اسی سند سے حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہو، لیکن ابن المفسر نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے، اور نہ مسند کے فاضل مرتب ہی نے اس کی کوئی نشان دہی کی ہے،

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا تعلق نفس مسند سے تھا، آخر میں اس کے مطبوعہ اڈیشن کے متعلق بھی بعض باتیں قابلِ ذکر ہیں،

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ "المکتب الاسلامی" دمشق کے فاضل رفیق علامہ شعیب ارناووط نے جو کئی اور قدیم قلمی کتابوں کو ترتیب و تحشیہ کے ساتھ شائع کر چکے ہیں، مسند ابی بکرؓ کو جدید طرز پر مرتب کر کے شائع کیا ہے، ان کے پیش نظر دمشق کی لائبریری "المکتبۃ الظاہریہ" کا قلمی نسخہ تھا، شروع میں ان کے قلم سے ستائیس صفحہ کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے، جو مصنف کے حالات و سوانح اور مسند کے راویوں ابن المفسر اور ابو القاسم فارسی کے مختصر حالات پر مشتمل ہے، آخر کے تیرہ ۱۳ صفحوں میں "سماعات" میں مذکور بعض ناموں کا بھی مختصر تذکرہ ہے قلمی نسخہ کے چار صفحوں کا عکس بھی دیا گیا ہے، پوری کتاب ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے، مرتب کا خود بیان ہے کہ :-

"مجھے مسند ابی بکر صدیقؓ کی نشر و اشاعت اور اس کو موجودہ علمی و تحقیقی انداز کے مطابق پیش کرنے کی ذمہ داری سپرد کی گئی تھی، چنانچہ میں نے اس کی عبارتوں کے ضبط و تصحیح کا کام کیا اور حدیثوں پر نمبر لگائے، اور تعلیقات کے اندر ہر حدیث کی صحت و سقم سے بحث کی، اس مسند کی حدیثوں کی تخریج اس طرح کی گئی ہے، کہ کتب حدیث کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ کے اندر جہاں کہیں یہ آئی ہیں، ان کے حوالے دیئے ہیں، حسب ضرورت رواۃ پر بھی کلام کیا گیا ہے اور جو حدیثیں ضعیف سندوں سے مروی ہیں، ان کے شواہد و متابعات نقل کر دیئے گئے ہیں، اس سے ان کی صحت و قوت

ظاہر ہو گئی ہے، متعلق اور عسیر الفہم مباحث اور مشکل الفاظ کی تشریح اور تضاد کو بھی رفع کیا گیا ہے۔ حدیثوں اور راویوں کی حروف تہجی کے اعتبار سے ایک فہرست بھی دیدی گئی ہے، تاکہ مراجعت اور استفادہ میں آسانی ہو۔ مقدمہ مسند ابی بکر الصدیق پ گو فاضل مرتب نے مسند کی ترتیب و تحشیہ میں بڑی کدوکاوش سے کام لیا ہے، تاہم بعض امور سے انھوں نے صرف نظر کر لیا ہے، جیسے بعض توضیح طلب راویوں کے متعلق کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے اور حدیثوں کی تخریج میں محض ایک یا چند کتب حدیث کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے، اگر وہ تمام مصادر کا ذکر کر دیتے تو حدیث کی قوت و ضعف کا معاملہ زیادہ صاف ہو جاتا، الفاظ و لغات کی تشریح کے ضمن میں مستند ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، حواشی میں بڑے اختصار سے کام لیا گیا ہے، اگر کسی قدر مزید تفصیل و توضیح سے کام لیا جاتا تو یہ تعلیقات و حواشی مسند ابی بکر کی جامع شرح بن جاتے، ان کوتاہیوں کے باوجود فاضل مرتب اس نادر مسند کی اشاعت پر اہل علم خصوصاً حدیث کے طلبہ و اساتذہ کے شکریے مستحق ہیں۔

تذکرۃ المحدثین

اس میں صحاح ستہ کے ائمہ احادیث کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام دارمی، امام ابن جارود، امام ابوبکر بزار، امام ابن خزیمہ، امام ابو جعفر طحاوی کے حالات و سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے، شروع میں مولانا شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے قلم سے مقدمہ ہے، ضخامت ۴۸۸ قیمت ۱۳۰ روپے

مرتبہ:۔ ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ   منیجر

وفیات

مفتی سید محمد مہدی حسن شاہجہانپوری

از

محمد نعیم صدیقی ندوی، ایم اے علیگ

افسوس کہ گذشتہ اپریل کی ۲۹ تاریخ کو علم و عمل اور فضل و کمال کی ایک اور شمع فروزاں گل ہو گئی، مولانا مفتی سید محمد مہدی حسن شاہجہانپوری نے ۹۰ سال کی عمر میں بعارضۂ فالج داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مرحوم اس صدی میں اگلی صحبتوں کی چند بقیۃ السلف یادگاروں میں سے تھے، وہ اتباعِ سنت، تبحرِ علم و وسعتِ نظر، طہارت و تقویٰ، زہد و ورع اور کتاب و سنت کی تفسیر و تعبیر میں یگانۂ عہد تھے، دار العلوم دیوبند کی مسند درس و افتا ان کے فیضانِ کمال سے ایک عرصہ تک بارونق رہی ہے اور سیکڑوں تشنگانِ علم ان کے منبع فیض سے سیراب ہوئے، وہ بلاشبہ معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعتِ علم کی ایک نادر مثال تھے، ہر مجلس و محفل میں یکساں ان کی قدر و منزلت تھی، حدیث کے ساتھ فقہ کے جزئیات پر ان کی وسعتِ نظر مسلّم خیال کی جاتی تھی،

مفتی مہدی حسن مرحوم سنہ ۱۳۰۱ھ میں شاہجہاں پور کے ایک محلہ ملا خیل میں پیدا ہوئے، عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سید کاظم حسن اور بڑے بھائی سے حاصل

کی، بارہ۱۲ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوگئے، پھر وطن ہی کے مدرسہ عین العلم میں شیخ عبد الحق (خلیفہ مجاز مولانا رشید احمد گنگوہی) اور مفتی کفایت اللہ دہلوی جیسے اکابر اساتذۂ فن سے صرف و نحو اور فقہ کی تحصیل کی، پھر جب مفتی کفایت اللہ صاحب مدرسہ امینیہ دہلی چلے گئے تو مرحوم کے والد نے ان کو بھی وہیں بھیج دیا، جہاں انھوں نے ملک کے منتخب اصحاب کمال کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرکے فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، اصول فقہ اور حدیث وغیرہ علوم میں دسترس اور کمال بہم پہونچایا، ۱۳۲۶ھ میں کتب درسیات سے فراغت پائی اور مدرسہ امینیہ ہی میں تدریسی خدمت انجام دینے لگے، جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بھی لیا، پھر مدرسہ اشرفیہ راندیر (سورت) میں صدر مدرس مقرر ہوئے، اور وہاں سات سال تک حدیث کی امہات کتب کے علاوہ معقولات کا درس دیا، اس کے بعد راندیر ہی کے مدرسہ محمدیہ میں چار۴ سال تک شیخ الحدیث کے منصب پر مامور ہوکر صحاح ستہ کی تدریس اور کامل تیس سال تک افتا کی خدمت انجام دی، یہاں تک کہ ۱۳۶۷ھ میں ارباب دار العلوم دیوبند کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور وہ وہاں تادم واپسیں صدر المفتیین کے اعلیٰ منصب پر فائز رہے، اس طرح تقریباً چالیس۴۰ سال تک انھوں نے ایک جید مفتی کی حیثیت سے بے شمار لوگوں کو مستفیض کیا، وہ فتاوی کے جوابات مختصر لیکن ماقل ودل دیتے تھے،

مرحوم پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، اور انھوں نے حرمین میں علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر شیوخ سے استفادہ کرکے سند و خرقہ اجازہ حاصل کیا تھا، یہ اسی طویل ریاض اور محنت کا نتیجہ تھا کہ مرحوم کا پایۂ فقہ و حدیث اور رجال

وانساب میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اس کی نظیر بہت مشکل ہے، ایک مشاق مدرس اور ماہر مفتی ہونے کے ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی امتیاز حاصل تھا، چنانچہ انھوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں بکثرت کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن میں اللآلی المصنوعۃ فی الروایات المرجوعۃ شرح کتاب الآثار (۳ جلد) کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ (۳ جلد) الدر الثمین، رجال کتاب الآثار، الاحتفاء فی رد البدعۃ شرح بلاغات محمد فی کتاب الآثار خصوصیت کے ساتھ مفتی صاحب کے تبحر علمی، وسعت نظر، دقیقہ رسی اور بلند ذوق تحقیق و تفحص کی آئینہ دار ہیں، ان کتابوں کے مطالعہ سے پورا اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کا علم کتنا حاضر و مستحضر اور جزئیات فقہ و حدیث و اسماء الرجال پر ان کو کیسا عبور کامل حاصل تھا، کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ کی تصحیح و تعلیق کی خدمت انھوں نے کامل میں سال تک نہایت جانکاہی اور عرق ریزی کے ساتھ مشغول رہکر انجام دی تھی اور غالباً اسی باعث بقول مولانا ابو الوفا افغانی "یہ ایک بہترین تعلیق بن گئی ہے"،

فضل و کمال کے ساتھ مرحوم کی شخصیت گوناگوں محاسن اخلاق کی حامل تھی علم اور عمل بہت کم یکجا ہوتے ہیں، لیکن مفتی صاحب کی ذات ان دونوں کی جامع تھی، وہ نہایت نیک طینت متواضع ملنسار، سادہ مزاج، کشادہ دست، خندہ جبیں، کریم النفس، مہمان نواز، سارے کے ضبط اور کام کے دھنی تھے، تقویٰ اور دینداری ان کے چہرۂ کمال کے نمایاں خط و خال تھے، وہ باہمہ وقار علم بذلہ سنج بھی تھے اردو شعر و سخن کا بڑا اچھا اور ستھرا ذوق رکھتے تھے، ان کے عربی اسلوب نگارش میں بہت سادگی، دلکشی اور رعنائی ملتی ہے، واقعہ یہ ہو کہ ایسے نادرۂ عہد صاحب کمال صدیوں کی گردش میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ جل شانہ اس مجموعۂ کمالات و اخلاق کی مرقد کو پر نور فرمائے اور اسپر ابر رحمت برسائے،

مطبوعات جدیدہ

پنچاکیانہ، مرتبہ ڈاکٹر تارا چند و ڈاکٹر امیر حسن عابدی صاحبان، **تقطیع کلاں، کاغذ** عمدہ، ٹائپ **صفحات ۸۰۰ مجلد قیمت تحریر نہیں، ناشر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔**

سنسکرت کی مشہور کتاب پنچ تنتر (کلیلہ و دمنہ) دنیا کی ان چند کتابوں میں ہے جس کو اس کے اچھوتے موضوع اور دلچسپ طرز بیان کی وجہ سے لازوال شہرت ملی اور دنیا کی بیشمار زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے، فارسی ترجمے ایران کے علاوہ ہندوستان میں بھی کئے گئے، مشہور مغل حکمراں اکبر نے جو ہندوؤں کے علوم و فنون کا بڑا قدرداں تھا اس کے فارسی زبان میں دو ترجمے کرائے تھے، پہلا اس کے دربار کے نامور انشا پرداز ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے کیا تھا، اور دوسرا خالق داد عباسی نے پنچاکیانہ کے نام سے کیا، اس دوسرے ترجمے کا علم کم لوگوں کو ہے، اکبری عہد کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا، حسن اتفاق سے دہلی میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا، جس کی مدد سے چند سال ہوئے ملک کے مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے پنچاکیانہ کا متن شائع کیا ہے، فاضل مرتبین کے قلم سے اردو و انگریزی میں ایک پر مغز مقدمہ بھی ہے، اس میں پنچ تنتر کی غیر معمولی اہمیت و مقبولیت،

اس کے متعدد زبانوں میں ترجمہ کئے جانے، زیر نظر ترجمے کے متن، زمانہ تحریر اور دوسرے ترجموں سے اس کا مقابلہ کرکے اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں اور پنچ تنتر کے مشمولات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، مگر مترجم کے حالات دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے نہیں دیئے جا سکے، شروع میں اصل نسخہ کے دو صفحوں کا عکس اور آخر میں سنسکرت و ہندی الفاظ کا فرہنگ دیا گیا ہے، یہ کتاب شہنشاہ ایران کے عطیہ سے چھپی ہے، اور اس پر ایران کے سابق ہندوستانی سفیر آقائے محمد رضا کا ایک دیباچہ بھی شامل ہے،

تحفۂ خدمت - از جناب شورش کاشمیری مرحوم، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۰، مجلد، قیمت تحریر نہیں، ناشر: مطبوعات چٹان لاہور پاکستان

پاکستان کی ڈاک کھلتے ہی شورش کاشمیری مرحوم نے اپنی کئی کتابیں بھیجی تھیں، ان میں سے بعض پر ان کی زندگی ہی میں ریویو ہو گیا تھا، مگر بعض رہ گئی تھیں، ان کا تعارف بھی جلد کرانے کی کوشش کی جائے گی زیر نظر کتاب ایوب خاں مرحوم کے دور حکومت میں مصنف کے زمانۂ اسیری کا روزنامچہ ہے، ان کو ۱۹۶۸ء میں مغربی پاکستان کی حکومت نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ۶ ماہ کے لئے گرفتار کیا تھا، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ ساڑھے تین ماہ بعد ہی رہا کر دیئے گئے، اس طرح ۸۰ روز منٹگمری جیل میں اور ۲۴ دن میو ہسپتال لاہور میں نظر بند رہے، اپنے روزنامچہ میں انھوں نے جیل و ہسپتال کے روز مرہ کے واقعات، جیل کے حکام اور ڈاکٹروں کے طرز عمل اور مجرم قیدیوں کی ذہنیت اور پر مشقت زندگی کی تصویر بھی کھینچی ہے، اور اپنی بے گناہی اور حکومت کی زیادتیاں بھی بیان کی ہیں نیز ایوب خاں اور مغربی پاکستان

کے اس زمانہ کے ڈوگورنروں ملک امیر محمد خاں نواب کالا باغ اور جنرل موسیٰ خاں کی شخصیتوں پر تبصرہ بھی کیا ہے، شورش مرحوم کے ذہن اور حافظہ میں ماضی کے نہ جانے کتنے واقعات محفوظ تھے، سلسلۂ بیان میں ان کا اور بعض مشہور قومی و سیاسی رہنماؤں کا ذکر بھی آگیا ہے، یہ روزنامچہ ان کے پُر زور قلم اور دلچسپ انشا کی خصوصیات سے معمور ہے،

کسب معاش کا اسلامی نظریہ مرتبہ جناب حامد علی خاں صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۰، قیمت تحریر نہیں، ناشر ڈاکٹر عبدالحق شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی،

اس مختصر کتاب میں کسب معاش کا اسلامی نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس غرض سے وہ آیتیں اور حدیثیں مع ترجمہ و تشریح نقل کی گئی ہیں جن میں کسب معاش کی ضرورت و اہمیت، حلال و حرام میں امتیاز، جائز پیشے اختیار کرنے اور کاروبار میں دیانت داری، راست بازی اور خوش معاملگی کی ترغیب دی گئی ہے، اور ناپ تول میں کمی، ذخیرہ اندوزی اور خیانت وغیرہ کی مذمت بیان کی گئی ہے، آخر میں نمبروار ان احکام و ہدایات کا خلاصہ بھی تحریر کر دیا گیا ہے، جو کتاب میں درج آیتوں اور حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں اور شروع میں اسلام کے فلاح انسانیت کے ضامن ہونے کا ذکر کر کے دکھایا گیا ہے، کہ اس نے عبادات کی طرح معیشت، معاشرت اور اخلاق و سیاست کے متعلق بھی ہدایات دی ہیں، اور وہ حلال روزی کی طلب اور کسب معاش کو غیر ضروری قرار نہیں دیتا،

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی و تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے
علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم
کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے،

۱۔ مہاجرین جلد دوم قیمت: ۹-۱۲

۲۔ سیر الصحابہ جلد ۶ ” ۴-۹
امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں
واقعۂ محزنۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳۔ سیر الصحابہ جلد ۷

۴۔ تابعین: ۹۹ اکابر تابعین کے سوانح،
قیمت: ۵۰-۱۲

۵۔ تاریخ اسلام اوّل (عہد رسالت و خلافت راشدہ)
قیمت: ۵۰-۱۲

۶۔ تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰-۱۱

۷۔ تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اوّل)
قیمت: ۰-۱۴

۸۔ تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)
قیمت: ۰-۱۵

۹۔ اسلام اور عربی تمدن قیمت: ۶۵-۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،
قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دین رحمت قیمت ۰۰-۱۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر ۷۵-۴
زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان
ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی
ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا
دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا، اور تحقیق
کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ، قابل مطالعہ
اس میں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی
آگئی ہے، قیمت: ۵۰-۲۷

کے اس زمانہ کے ڈوگورنروں ملک امیر محمد خاں نواب کالا باغ اور جنرل موسیٰ خاں کی شخصیتوں پر تبصرہ بھی کیا ہے، شورش مرحوم کے ذہن اور حافظہ میں ماضی کے نہ جانے کتنے واقعات محفوظ تھے، سلسلۂ بیان میں ان کا اور بعض مشہور قومی و سیاسی رہنماؤں کا ذکر بھی آتا گیا ہے، یہ روزنامچہ ان کے پُرزور قلم اور دلچسپ انشا کی خصوصیات سے معمور ہے،

کسب معاش کا اسلامی نظریہ مرتبہ جناب حامد علی خاں صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۱۰ قیمت ؎ ناشر ڈاکٹر عبدالحق شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی،

اس مختصر کتاب میں کسب معاش کا اسلامی نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس غرض سے وہ آیتیں اور حدیثیں مع ترجمہ و تشریح نقل کی گئی ہیں جن میں کسب معاش کی ضرورت و اہمیت، حلال و حرام میں امتیاز، جائز پیشے اختیار کرنے اور کاروبار میں دیانت داری، راست بازی اور خوش معاملگی کی ترغیب کی گئی ہے، اور ناپ تول میں کمی، ذخیرہ اندوزی اور خیانت وغیرہ کی مذمت بیان کی گئی ہے، آخر میں نمبروار ان احکام و ہدایات کا خلاصہ بھی تحریر کر دیا گیا ہے، جو کتاب میں درج آیتوں اور حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں اور شروع میں اسلام کے فلاح انسانیت کے ضامن ہونے کا ذکر کرکے دکھایا گیا ہے، کہ اس نے عبادات کی طرح معیشت، معاشرت اور اخلاق و سیاست کے متعلق بھی ہدایات دی ہیں اور روا حلال روزی کی طلب اور کسب معاش کو غیر ضروری قرار نہیں دیتا،

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی و تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے،

۱۔ مہاجرین جلد دوم قیمت: ۱۲-۹

۲۔ سیر الصحابہ جلد ۶ " ۹-۴

امام حسین کے حالات زندگی کے ضمن میں واقعۂ حزینۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳۔ سیر الصحابہ جلد ۷

۴۔ تابعین: ۹۹، اکابر تابعین کے سوانح،
قیمت: ۱۲-۵۰

۵۔ تاریخ اسلام اوّل (عہد رسالت و خلافت راشدہ)
قیمت: ۱۲-۵۰

۶۔ تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۱۱-۰۰

۷۔ تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اوّل)
قیمت: ۱۴-۰۰

۸۔ تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)
قیمت: ۱۵-۰۰

۹۔ اسلام اور عربی تمدن قیمت: ۱۵-۶۵

۱۰۔ عرب کی موجودہ حکومتیں،
قیمت

۱۱۔ ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲۔ دین رحمت قیمت ۱۰-۰۰

۱۳۔ خریطۂ جواہر ۴-۷۵
زندگی کی آخری کتاب

۱۴۔ حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشاء اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ، قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۲۷-۵۰

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین، اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بناپر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا ہے، مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بناپر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دارالمصنفین کے رفقاء محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دئے ہیں متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

۱۹۲۹ء - ۱۹۳۴ء - ۱۹۳۶ء - ۱۹۳۷ - ۱۹۳۸ - ۱۹۳۹ء

۱۹۴۱ء - ۱۹۵۴ء - ۱۹۵۵ء - مع سلیمان نمبر، ۱۹۷۱ء -

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،

منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

بڑو نمبر ۵۲۰ ۱۱۸ (۲) اگست سنہ ۱۹۷۶ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن ۔ عبدالسلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

ماہ اگست ۱۹۷۶ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ عدد ۲

مضامین

مقالات

آثار علمیہ

وفیات

ادبیات

شذرات

ایک بار ایک عرب دوست سے باتیں ہو رہی تھیں، گفتگو کے دوران فلسفۂ سیاست، سیاسی افکار و خیالات اور نظامِ سلطنت پر بحث چھڑ گئی، کہنے لگے کہ اقوامِ عالم کے مصائب و مشکلات کا صرف یہی حل ہے کہ دنیا کی سربراہی عربوں کے ہاتھ میں ہو، تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ عربوں کی فرمانروائی خدا کے بندوں کے لئے رحمت تھی، ہر عقیدہ و خیال اور ہر ملت و مذہب کے لوگ اُن کے دورِ حکومت میں امن و امان اور راحت و اطمینان کے ساتھ رہتے تھے، آج اگر پھر نظامِ عالم اُن کے ہاتھ میں آجائے اور وہ دنیا کی امامت کا منصب سنبھال لیں تو شر و فتنہ، قتل و غارت اور ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے، اور مخلوق عدل و انصاف، اخوت و مساوات اور صداقت و امانت کے سایہ میں آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے، اپنے ان خیالات کی تائید میں وہ تاریخِ اسلام کے حوالے دینے لگے، اور مسلم فرمانرواؤں کی بے تعصبی اور رعایا پروری کے واقعات سنانے لگے، میں نے کہا ذرا دوسرے پہلو کا بھی خیال کیجئے، حالات کا ایک افسوسناک رُخ بھی ہے۔

ان عرب دوست نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ صرف انھیں کے نہیں ہیں، بلکہ بہت سے عربوں کا یہی خیال ہے، اسلام سے پہلے نسلی برتری اور لسانی تفوق کا تصور عربوں میں عام تھا، اگرچہ وہ اقوامِ عالم کے درمیان کوئی وزن نہیں رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھتے تھے، اسلام نے یکسر اُن کے غرور کا خاتمہ کر دیا کہ تم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہو، اب عزت و شرف کا معیار نسل و وطن کے بجائے اعمال ہیں، جو شخص زیادہ خدا ترس اور نیکوکار ہوگا، وہ زیادہ معزز سمجھا جائیگا، رومی و حبشی اگر ایمان و عمل صالح کی صفات سے متصف ہوں گے تو انھیں عربی و قریشی پر فوقیت حاصل ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں انسانی شرف کا یہی معیار رہا، اور بلال و صہیب و سلمان رضی اللہ عنہم قریش کے سرداروں اور طائف کے رئیسوں سے بدرجہا زیادہ عزت و اکرام کے مستحق سمجھے گئے، انسانی مساوات کا

یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسانی حکمران جبلہ کے مقابلہ میں ایک بدو کا خیال کیا، اور صاف کہہ دیا کہ تم نے اس غریب کو مکا لگایا ہے تمھیں اپنی دست درازی کی سزا برداشت کرنی پڑے گی، جبلہ نے کہا میں بادشاہ ہوں، اور یہ ایک بازاری ہے میرا اس کا کیا مقابلہ، حضرت عمر نے فرمایا، جاہلی غرور و نخوت کا زمانہ ختم ہو گیا، اسلام کی نظر میں امیر غریب سب برابر ہیں

عدل و مساوات کے اس تصور نے عرب کے منتشر اور متحارب قبیلوں کو ایک متحد قوم بنا دیا، جس کی بدولت گلہ بان جہاں بان بن گئے، اور مفلس و کمزور بدوؤں نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیے لیکن آگے چل کر عرب بھی نسل و وطن کے طلسم میں گرفتار ہو گئے، اس غیر اسلامی تخیل نے وحدت ملی کو پارہ پارہ کر دیا، دبی ہوئی قبائلی عصبیتیں ابھر آئیں، اور شہنشاہوں کی قباؤں کو چاک کرنے والے خود اپنے گریبان پھاڑنے لگے، اموی عہد کے آغاز ہی میں قبائلی اختلافات شروع ہو گئے تھے لیکن عام مسلمانوں کے دینی جذبات اور اسلامی مزاج میں بہت فرق نہیں آیا تھا، اس لئے بادشاہوں کی لڑائیوں میں بھی وہ جہاد کے جذبہ سے شریک ہوتے تھے، اور کلمۃ الہٰی کی سربلندی کی خاطر اپنی جانیں قربان کرتے تھے، مگر رفتہ رفتہ بادشاہت کا رنگ نمایاں ہونے لگا، اس انداز ملوکانہ نے انکے جذبات سرد کر دیئے، قبائلی عصبیت بڑھتی رہی، اور بھائی بھائی کا گلا کاٹتا رہا، اس تعصب اور خانہ جنگی کا انجام یہ ہوا کہ اقتدار عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور ایسا نکلا کہ آج تک واپس نہ آیا،

عربوں کے باہمی اختلاف نے اُن کو حکومت و فرمانروائی سے محروم کر دیا، ایک زمانہ میں بحر و بر ان کے زیر نگیں تھے، اور وہ سیاہ و سفید سب کے مالک تھے، تاریخ کے اوراق میں اُن کے عروج و زوال کی داستان درج ہے، مورخین نے اس کے علل و اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں، چاہئے تھا کہ ان واقعات سے عبرت لیتے اپنے دلوں کا غبار صاف کرتے، اور اپنی صفوں کا انتشار دور کر کے ایک متحد اور منظم قوم کی طرح دنیا کے سامنے آتے، دنیا طلبی اور جاہ پسندی کے بجائے ایثار و قربانی سے کام لیتے اور رشک و حسد اور عناد و دشمنی کے بجائے باہمی خلوص و محبت اور ہمدردی و خیرسگالی کے جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کی

مدد کرتے، ایسا ہوتا تو پانسہ پلٹ جاتا، اور ہاری ہوئی بازی جیت لیتے، لیکن اس تباہی و بربادی اور بدحالی و زبون حالی کے باوجود اب بھی ان کے درمیان اتحاد و اتفاق مفقود ہے، دشمن کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے، اُن کے بہترین علاقے اس کے قبضہ میں ہیں، آئے دن اُن کی عزت و ناموس پر حملے ہوتے ہیں، اور جان و مال کا نقصان ہوتا رہتا ہے، مگر پھر بھی اُن کی بےحسی کا یہ عالم ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے بجائے اپنے ہی بھائیوں کو توپ و تفنگ کا نشانہ بنا رہے ہیں، لبنان کے دردناک واقعات اُن کی بےحمیتی کی افسوسناک مثال ہیں، کیا غضب ہے کہ اسرائیل نے جو کچھ کیا اس سے بڑھ کر آج عرب عربوں کے ساتھ کر رہے ہیں،

اس موقع پر تقسیم فلسطین کا زمانہ یاد آرہا ہے اس زمانہ میں میں اخبار خلافت کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھا، تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا، اور چند دن میں اس پر عمل درآمد ہونے والا تھا، برطانیہ اپنا تسلط اٹھا رہا تھا اور اسرائیل اس کی جگہ حکومت سنبھالنے کی تیاری میں مصروف تھا، آیندہ برطانوی افواج کے بجائے اسرائیل کو اپنے علاقہ کی حفاظت کرنی تھی، خبریں آرہی تھیں کہ اسرائیلی سرحد سے متصل عراق، شام، اُردن، مصر اور لبنان کی مسلح فوجیں کھڑی ہیں، اور منتظر ہیں کہ جیسے ہی برطانوی پرچم اتر کر اسرائیلی جھنڈا نصب ہو، اسرائیل کے علاقہ میں داخل ہو جائیں، یہ خبریں پڑھ پڑھ کر لوگ تعجب کر رہے تھے، کہ اسرائیل کس بل بوتے پر عربوں کی متحدہ فوجی طاقت کا مقابلہ کرے گا، عام خیال یہ تھا کہ شاید دنوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں اسرائیل کا قلع قمع ہو جائیگا، لیکن آج چالیس برس سے زیادہ ہو گئے، اسرائیلی سلطنت نہ صرف قائم ہے، بلکہ اُس نے اپنی حدود اور وسیع کر لی ہیں، اور مزید پیش قدمی کے لئے تیار ہے، عرب چار لڑائیاں لڑ چکے ہیں، مگر کچھ پانے کے بجائے ہر بار ان کو مزید علاقے اسرائیل کے حوالے کرنے پڑے، اور یہ سب آپس کی نااتفاقی کی وجہ سے ہوا، افسوس ہے کہ اس مسلسل شکست اور جان و مال اور عزت و ناموس کے غیر معمولی نقصان کے بعد بھی اُنکی آنکھیں نہیں کھلیں، اور دشمن سے مقابلہ کے بجائے اپنے بھائیوں کی تاخت و تاراج میں مصروف ہیں،

مقالات

مغرب اقصیٰ (مراکش)

ماضی و حال کے آئینہ میں

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ابھی کچھ عرصہ پہلے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مراکش تشریف لے گئے تھے یہاں پہونچکر ان کی چشم تصور کے سامنے تاریخ کے اد۔ ق کھل گئے، اور عزم و حوصلہ فتح و ظفر، جہاں بانی و جہاں آرائی، تہذیب و تمدن، علم و فن اور ایمان و عمل کے جو مناظر انھیں نظر آئے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر ان کی مرقع کشی کی کوشش کی ہے، انھوں نے اپنے خیالات عربی میں لکھے تھے، ان کے برادر زادہ مولوی محمد حسنی نے انھیں اردو کا جامہ پہنایا ہے، امید ہے کہ قارئین معارف کے حلقہ میں اسے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ (معارف)

مجھے مشرق اسلامی کے اکثر ممالک کے سفر کا نوجوانی یا اس دور میں موقع ملا ہے جس کو ہم زندگی کی صبح یا ظہر سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالےٰ کی حکمت و مشیت کہ اس دلنواز سرزمین کی زیارت کا موقع مجھے اس وقت ملا جب زندگی کا آفتاب مائل بہ غروب ہے۔

کاش نذر اسلام میں مغرب اقصیٰ کا حصہ | مغرب اقصیٰ (مراکش) کا یہ سفر جسمانی طور پر اور مہینوں اور

سالوں کے حساب سے ضرور تاخیر کے ساتھ ہوا، لیکن اس سفر روحانی میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی جو علم وتحقیق اور اسلام کے اُس وسیع اور عالمگیر کتب خانہ کے سایہ میں ہوا جس میں مغرب اقصیٰ کا بڑا حصہ ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس میں اس کا ایک پورا شعبہ اور (corner) ہے، جس کا شمار اس کتب خانہ کے بہت اہم حصوں اور شعبوں میں ہے، میں نے اس کے حسین تصورات اور اس کی عظیم المرتبت ہستیوں اور سرآمد روزگار شخصیتوں کے ساتھ ایک زمانہ گزارا ہے، میں اس کے اہم شہروں، تاریخی مقامات، تاریخ ساز جامعات، سادہ و دلنواز مساجد، اس کی حکومتوں اور تہذیبوں، اس کی مہم جوئیوں اور سرفروشیوں، اس کے عروج واقبال اور اس کی ناکامیوں وکامرانیوں کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں، میں نے اس کی طویل تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا ہے، جو مختلف رنگوں اور اہم واقعات وانقلابات سے بھری ہوئی ہے، اور جس سے بر وزندہ، باعزت، غیور اور خوددار قوم گزرتی ہے، جس کا قوموں کی برادری میں کوئی مقام ہوتا ہے، جس کو اپنی دعوت اور اپنی شخصیت عزیز ہوتی ہے، جو ہر وقت دشمنوں اور مخالفوں کے نرغہ میں رہتی ہے، اور ہمت بلند رکھتی ہے،

فتح وکامرانی کا رباط یورپ کے قرب اور عالم اسلام کے مغربی حدود کے آخری کنارہ پر واقع ہونے کی وجہ سے مغرب اقصیٰ کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمیشہ حالت تیاری میں اور ہمہ وقت چاق وچوبند رہے "رباط" جس کے معنی ہی سرحدوں کی پاسبانی اور ایثار وقربانی کے ہیں، دراصل مغرب اقصیٰ کے صرف ایک شہر کا نام نہیں جو آج اس کا پایۂ تخت ہے، بلکہ پورا مغرب اس لحاظ سے رباط ہے، اور تاریخ گواہی دے رہی ہے، کہ یہ ناکامی وہزیمت کا "رباط" نہیں، فتح وکامرانی کا "رباط" ہے۔

اندلس کی یاد | مغرب ہی وہ اصل دروازہ تھا، جہاں سے طارق بن زیاد کی قیادت میں مجاہدین کا پہلا دستہ اندلس میں وارد ہوا، اور اسلام کے عروج واقبال اور یورپ میں علم وعقل کی شعاعیں پھیلنے کا ذریعہ اور نقطۂ آغاز بنا، یہاں حکومت بھی تھی، تہذیب بھی، علم بھی، اور عقل بھی، یہ اندلس فاتحین اسلام کے خواب شیریں، شعراء متغزلین کی جنت نگاہ وفردوس گوش اور مورخوں اور جغرافیہ دانوں کے محبوب موضوع کی حیثیت سے ابھر کر دنیا کے نقشہ میں آیا، یہ ایک جنت ارضی تھی، جہاں علم کی گرم بازاری بلکہ حکمرانی و فرمانروائی تھی، جس کو علماء وشعراء نے اپنا نشیمن اور گلشن علم بنا یا تھا، فقہ، شعر وادب فلسفہ، اور فن تعمیر میں اس کا ایک علحدہ اور مستقل مدرسۂ فکر اور مکتبِ خیال تھا، جہاں مرسیہ، بلنسیہ، جیانؔ، شاطبہ، قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، مدینۃ الزہرا اور قصر الحمرا، جیسے زندہ اور بولتے ہوئے شہر آباد تھے،

اندلس اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں مغرب اقصیٰ کا ممنون کرم رہ چکا ہے، اُس نے اندلس کو بار بار مدد اور کمک پہنچائی ہے، اور اس کی تاریخ کے تاریک ترین دنوں میں مجاہدین وفاتحین اس کو عطا کیے ہیں جنھوں نے اس کو موت کے منہ سے بچایا اور اس کے ڈوبتے ہوئے سفینہ کو بھنور سے نکالا ہے، اور زندگی وقوت کی ایک نئی قسط اس کو بخشی ہے، ان میں خصوصیت کے ساتھ ہم سلطان یوسف بن تاشفین (معرکۂ زلاقہ ۴۷۹ھ کے خاص ہیرو اور فاتح) کا نام لے سکتے ہیں، یہ وہی سلطان ہے جس نے مراکش کا شہر تعمیر کیا، اس کے بعد معرکۂ مرج الحدید ۵۹۱ھ کے فاتح مجاہد جلیل ابو یوسف المنصور الموحدی کا نام آتا ہے، جنھوں نے اس فتح مبین کی خوشی میں رباط الفتح کے نام سے یہ شہر آباد کیا، اس کے بعد ہم مجاہد عظیم علی الشریف الحسنی (۱۰۶۲ھ ۱۰۷۵ھ) کا نام لے سکتے ہیں، جو

علوی سجلماسی سلاطین کے جدِ اکبر اور موجودہ حکمراں خاندان کے جدِ امجد ہیں جنھوں نے اندلس کی سرحدوں کو جہاد کرتے ہوئے کئی بار عبور کیا، لیکن جب تختِ سلطنت ان کو پیش کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں اپنے اس عمل کو کسی دنیوی منفعت سے آلودہ کرنا نہیں چاہتا۔

فردوسِ گم شدہ کا ایک جھونکا

مغربِ اقصیٰ سے اندلس کی طرف اتنی جلد منتقلی کی میں معافی چاہتا ہوں یہ نسیمِ جانفزا کا ایک جھونکا تھا جو اس فردوسِ گم شدہ سے جہاں کی خاک پاک میں مسلمانوں کے خون اور آنسو جذب ہیں، اور جس سرزمین پر اُن کی ذہانت، عبقریت، انسانیت و شرافت اپنی اعلیٰ ترین شکل میں ظاہر ہوئی، اچانک یہاں آگیا، اور کچھ اس لیے بھی کہ اگر کوئی شخص تنگنائے جبل الطارق پر کھڑا ہو تو اندلس اس کو بالکل قریب نظر آئیگا اور ظاہر ہے کہ قربِ مکانی میں جو بات اور اثر ہے وہ بعدِ مکانی میں کیسے ہو سکتا ہے۔

اسلام کی آفاقیت

مغربِ اقصیٰ (یا مغربِ اسلامی و عربی) جو قرنِ اول میں وجود میں آیا، اور برگ و بار لایا، اسلام کے پیغام کی جہاں گیری کا روشن ثبوت ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اقوامِ عالم کو ان کے تنگ دائرہ اور اس گوشۂ گمنامی سے (جہاں وہ برسوں سے یا صدیوں سے زندگی گزار رہی تھیں) ایک نئی اور کشادہ دنیا میں لے آتا ہے، اور انہیں خانہ جنگیوں اور قبائلی لڑائیوں نیز زندگی و کائنات کے محدود تصور سے نکال کر قافلہ انسانی کی ہمرکابی بلکہ اس کی قیادت و رہنمائی اور تہذیبِ انسانی کی تعمیر و تشکیل، علم کی ترقی اور انسانیت کے پیچیدہ مسائل سے دلچسپی کے وسیع میدان میں داخل کرتا ہے، یہ شمالی مغربی پٹی جو لیبیا سے بحرِ اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی ہے، متمدن اور ترقی پذیر دنیا سے جو مختلف تحریکوں، تنظیموں، مذہبی اداروں، مدارسِ فکر سے معمور و آباد ہے بالکل جدا تھی، بیرونی دنیا سے

اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اس کا اگر روم شہنشاہی سے کوئی متعلق تھا، تو وہ صرف محدود عسکری بنیاد پر، نہ اس کی کوئی شخصیت تھی نہ اس کے پاس کوئی پیغام تھا، یہ ممالک جو طرابلس سے مراکش تک پھیلے ہوئے تھے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں سخت جانی وسخت کوشی، سنگدلی اور سفاکی اور فاتحین کے خلاف مسلسل شورش وبغاوت میں مشہور تھے، یہاں تک کہ وہاں کے اصلی باشندے (ان اصحاب سے معافی چاہتے ہوئے جن کا ان نسلوں سے نسبی تعلق ہی فخر وغرور اور وحشیانہ سلوک میں ضرب المثل ہو گئے، اور بربر اور بربریت دنیا کی تمام زبانوں میں اس کے ہم معنی قرار پائی، ان قوموں میں ہمیں سوائے قبائلی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں، قدیم عادتوں سے وابستگی یا مخصوص قبائلی روایات کے کوئی اور صحیح تعمیری وعلمی سرگرمی مطلق نظر نہیں آتی، نہ ان کے پاس کوئی ترقی یافتہ زبان تھی، نہ اعلیٰ ونفیس تہذیب، نہ کوئی معقول مذہب، نہ مشہور شہر اور آبادیاں، عصر قدیم کا ان کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا، وہ بھی کھنڈرات اور شہروں کے ملبہ کے نیچے دفن تھا، یہ اس بات کی دلیل تھی کہ خوابیدہ اہلیتوں اور صلاحیتوں، مخفی طاقتوں اور سوئے ہوئے جذبات کی تحریک اور اعلیٰ مقاصد، تعمیری کوششوں، انسانیت کے وسیع نقطۂ نظر اور نسل آدم کے لیے مادی وسائل اور قوتوں کے صحیح استعمال میں اسلام کا کیا حصہ ہے، اور اس کا رخ شر سے خیر کی طرف پھیر دینے کی کیسی صلاحیت اور قدرت اسکو حاصل ہے،

مغرب اقصیٰ کی بازیافت جب اس دور دراز، گمنام اور مؤرخوں، جغرافیہ دانوں اور مصنفوں کی نظر سے مخفی ومستور گوشہ پر اسلام کی باد بہاری کا جھونکا آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے، ایک نئی دنیا وجود میں آگئی جس میں ہر چیز نئی تھی،

یہاں، قیروان، فاس، مکناس، مراکش، رباط، سوسہ، سرقسطہ، بجایہ، تلمسان،

تونس جیسے شہر وجود میں آئے، جہاں حدیث وتفسیر، فقہ وتصوف، شعر وادب، نقد وتاریخ فلسفہ، وحکمت کے ائمہ اور نادرۂ روزگار محقق ومفکر پیدا ہوئے، جن کا شمار کرنا مشکل ہے، یہاں جامع القرویین اور جامع الزیتونہ جیسے مدارس قائم ہوئے اور ان سے علوم وفنون کے ایسے ائمہ تیار ہوکر نکلے جن کے نقوش عربی زبان اور علوم اسلامیہ کے میدان میں ابھی تک باقی ہیں۔

مغرب اسلامی کو اپنی تاریخ میں متعدد سخت معرکے پیش آئے، کئی حکومتیں آئی گئیں، کئی خاندان بدلے، اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ اور ایک گھرانہ کو دوسرے گھرانہ تک منتقل ہوتا رہا، اور سلطنت کو سخت نشیب وفراز سے دوچار ہونا پڑا، لیکن اس ملک نے اپنی اسلامی شخصیت، مخصوص عربی طرز، اور علم وثقافت کے اعلیٰ ذوق کی ہمیشہ حفاظت کی، وہاں علم کی گرم بازاری مختصر وقفہ کے لیے بھی سرد نہیں پڑی، مساجد ومدارس برابر اپنا پیغام پہونچاتے اور اپنا کردار ادا کرتے رہے علماء ربانی، اہل حق اور مردان خدا کلمۂ حق کہتے، اور صراط مستقیم کی دعوت دیتے رہے، اس لحاظ سے یہ انقلابات اور تبدیلیاں سطحی اور وقتی تھیں، عرب قوم کے جوہر اصلی کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچا اور اس کی شخصیت اور ایمانی وعقیدہ پر کوئی اثر نہ پڑا، مذہب وہی مذہب رہا ثقافت وہی ثقافت، ذوق وہی ذوق۔

نئے معرکے اور نئی تحمندیاں آخر میں اسکو ایک ایسے سامراج یا زیادہ صحیح الفاظ میں فوج کشی سے سابقہ پڑا جو اس طرح کے بیرونی حملوں میں شاید سب سے زیادہ سنگین تھا، زیادہ ذہانت ودقت نظر اور منصوبہ بندی کے ساتھ بنایا گیا تھا، اور بہت دوررس اثرات کا حامل تھا یہ فرانسیسی اقتدار تھا جس کے ساتھ بعض موقعوں پر اسپینی سامراج بھی شامل ہوگیا تھا

اس نو وارد سامراجیت میں عزم و ارادہ بھی تھا، اور وضاحت وتعیین بھی، وہ جدید ترین اسلحہ سے لیس تھا، اور مکمل فکری ثقافتی، علمی وتہذیبی تباہ کاری کے درپے، جن وسائل اور جن طریقوں کو اس نے استعمال کیا اس میں نسلی امتیاز عرب اور بربر کی تفریق، اور قدیم تہذیب وثقافت کے احیاء کا جذبہ شامل تھا، جو لوگ عمر رسیدہ ہیں وہ الظہیر البربری[1] کو کبھی بھول نہیں سکتے جس نے ماقبل اسلام کے عہد کی طرف واپس جانے کی کھلم کھلا دعوت دی اور بربری زبان کے احیاء وترویج کا نعرہ لگایا یہ ایک گہری اور دوررس سازش تھی جو اسلامی وحدت بلکہ اسلامی وجود اور شخصیت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کی گئی،

لیکن مغرب اسلامی نے ان تمام ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا پوری استقامت اور شعور وہوشمندی کے ساتھ مقابلہ کیا، ان بربر مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا ایمان عربوں کے ایمان سے اور دین اسلام پر ان کا فخر عربوں کے فخر ومسرت سے کسی طرح کم نہیں، مغرب اپنے دونوں بازوؤں (عرب اور بربر) کے ساتھ اس معرکہ سے کامیاب وبامراد ہو کر نکلا اپنی اسلامی عربی شخصیت اور اپنے عقیدہ اور زبان اپنی غیرت وخودداری کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے اجنبی استعمار کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیا، فرانسیسی اور اسپینی ملک چھوڑ کر چلے گئے، اس طرح اس قوم نے پھر اس کا ثبوت دیا کہ وہ ہر قسم کے چیلنج اور وقت کے تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے یہ اس بات کی بھی دلیل تھی کہ اسلام اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا ہے، اور اس کے خون اور روح میں پیوست ہے، اور یہ اسلام کے اولین قافلہ سالاروں، اور شہسواروں کے اخلاص کی برکت تھی جنھوں نے سب سے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھا، جنھوں نے پہلی بار بربر قوم کو عربوں کے اس خوانِ نعمت اور

---

[1] مغرب نے شاہی فرمان کے لیے "ظہیر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

برکت وسعادت میں شریک کیا، اور انسانیت کی دولت مشترکہ میں اُن کو پورا حصہ دیا اور یہ موقع اُن کو حاصل ہوا کہ وہ قوت ایمانی، اسلام پر فخروعزت کے احساس، اس کے محاسن وفضائل سے آراستگی اور اللہ تعالےٰ سے تقرب میں خود عربوں سے بھی آگے نکل جائیں

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم	اے لوگو، ہمنے تم کو ایک مرد اور
من ذکرٍ و انثیٰ وجعلناکم	ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو
شعوباً وقبائل لتعارفوا	قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ
ان اکرمکم عند اللہ	ایک دوسرے کی پہچان حاصل کرو
اتقاکم۔	بیشک تم میں سب سے معزز ومحترم
	اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اس سے
	سب سے زیادہ ڈرنے والا اور لحاظ
	وادب کرنے والا ہے،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بڑی تعداد میں علماء وزہاد داعی الی اللہ اور صاحب دل درویش، باکمال علماء اور اہل درس اور مصنف اور صاحب قلم پیدا ہوئے اور وہ سب اسلام کے خوبصورت سانچے میں اس طرح ڈھل گئے، جس طرح بلاد عجم کی بعض اور قومیں اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی تھیں۔

عصرِ جدید کا نیا چیلنج آج مغرب اسلامی کو جو معرکہ درپیش ہے وہ اس کی تاریخ کے جنگی معرکوں سے زیادہ سخت اور سنگین ہے، وہ عہد آخر کے غیر ملکی سامراج اور بیرونی تسلط سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک ہے، اس لئے کہ گذشتہ معرکے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے

میدان جنگ کی کھلی ہوئی لڑائیاں تھیں، جن میں صرف اسلحہ کا استعمال ہوتا تھا، اور شجاعت و جوانمردی اور جان و مال کی قربانی فیصلہ کن طاقت تھی۔ اس کے مقابلہ کے لیے پوری قوم ایک فرد واحد کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی تھی، اور اس کو کفر و اسلام اور ملکیوں اور سامراجیوں کی جنگ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن آج کی لڑائی ایک خاموش اور ٹھنڈی لڑائی ہے، بہت عمیق اور پس پردہ یہ اسلامی طرزِ فکر اور مغربی طرزِ فکر کی (اپنے وسیع تر مفہوم میں) لڑائی ہے، یہ ذہنی و فکری معرکہ آرائی ہے، جس کا خلاصہ ہم ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ کیا یہ مسلم اقوام یا اسلامی ممالک اسلام کو ایک ایسے دین و مذہب کی حیثیت دینے پر تیار ہوں گے، جس کے اندر بنی نوع انسان کی فلاح و کامرانی کا پورا سامان موجود ہے، اور جو زندگی کے ہر شعبے میں واضح ہدایات دیتا ہے، ایک ایسا کامل دین جو انفرادی و اجتماعی زندگی، تہذیب و تمدن نسل جدید کی تشکیل و تعمیر، اور تعلیم و سیاست میں اپنا مستقل بالذات اور علیحدہ منصوبہ رکھتا ہے، اور ہر اس مسئلہ میں جس سے اس کی روح مجروح ہوتی ہو، اور زندگی میں اس کے متعین کردہ مقاصد پورے نہ ہوتے ہوں مداخلت کرنے کا حق رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر احتساب کائنات، قافلۂ انسانی کی رہنمائی و قیادت اور تمدن انسانی کی نگرانی، اور روح انسانیت کی حفاظت و پاسبانی اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے، کیا مسلم اقوام یا مسلم ممالک اسلام کو ایک ابدی اور عالمگیر دین کی حیثیت سے اختیار کریں گے جو زندگی و قوت سے بھرپور زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ بلکہ زمانہ پر حکمران ہو، ہر مسئلہ حل کرتا ہو بلکہ اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کا سدباب کرتا ہو اور اس کی پیش بندی اور انتظام کر دیتا ہو کہ اس کے معاشرہ میں اس قسم کے مسائل ہی پیدا نہ ہوں اور بالادستی ہمیشہ اس کی رہے،

یا وہ اسلام کو مجرد عقیدہ یا ایمان کی حیثیت دینے لگے اور مذہب کو انسان کا پرائیویٹ معاملہ تصور کریں گے جس کا معاشرۂ انسانی، زندگی کی تشکیل، نظام تعلیم و تربیت اور نئی نسل کی نشو ونما اور ذہنی ساخت و پرداخت سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ قانون سازی اور زندگی کے کسی معاملہ میں مداخلت کا اس کو کوئی حق ہے، ایک مسلمان اگر عقائد، عبادات نام ونسب قومیت، رسم و رواج، خاندانی ونسلی روایات اور پیدائش وموت کے مراسم کے لحاظ سے مسلمان رہنا چاہے، تو رہ سکتا ہے، پلاننگ (منصوبہ بندی) اسی طرح مغربی رہے گی جیسے پہلے تھی، تہذیب اپنے تمام خارجی و داخلی اور شخصی واجتماعی مظاہر میں مغربی ہوگی، اقدار و معیار وہی رہیں گے جن پر مغرب کے فلاسفہ و مفکرین نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہو، اور جن کو مغرب میں تقدیس وعظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو، اخلاق و معاملات وہی قابل قبول ہوں گے جو مغرب کے مادہ پرستانہ ماحول میں برتے جاتے ہیں اور جن پر مسیحیت کا برائے نام اثر ہے اور ٹکنالوجی اور اقتصادی رسہ کشی اور زور آزمائی کی مضبوط گرفت ہے۔

مغرب کی نئی ٹکنیک ہر باخبر و دیدہ ور شخص محسوس کر سکتا ہے کہ مغرب نے اپنے طویل تجربوں سے جو اسلامی عقیدہ کی بیخ کنی اور مسلمانوں کو تبدیلِ مذہب پر مجبور کرنے کے سلسلہ میں (جس طرح اسپین میں ہوا) اس کو حاصل ہوئے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور اب اس نے ترویج عیسائیت کے محدود و تنگ خیال اور پرانے طریقۂ کار کو جو نئی مشکلات کھڑی کرتا تھا، اور بعض وقت شدید ردعمل کا باعث بن جاتا تھا، بالکل خیرباد کہہ دیا ہے، اس کو چھوڑ کر اس نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ کہ مسلمانوں کو ان کی جداگانہ اسلامی شخصیت اور اس تہذیب سے محروم کر دیا جائے جو ان کے عقیدہ قرآنی تعلیمات، او

سلامی اخلاق کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے، اور اس میں دینی شعائر و فرائض کی ادائگی
لی ہر ممکن سہولت کا خیال رکھا گیا ہے، اور جو طہارت کے خاص اسلامی مفہوم کی حامل ہے

سلامی تمدن کے خلاف سازش

تمدن کی جڑیں نفس انسانی اور قوم کے جذبات اور احساسات
یں بڑی گہری ہوتی ہیں، اور کسی ایسی قوم کو اس کی مخصوص تہذیب و تمدن سے جدا کرنے یا محروم
رنے کی کوشش (جو اس کے دین و شریعت کے سایہ میں پروان چڑھے ہوں، اور برگ
و بار لائے ہوں اور جن کی تشکیل و تکمیل میں دینی ذوق، دینی مزاج، اور دینی رنگ کا بڑا
حصّہ ہو) اس کو سرچشمۂ حیات سے محروم کر دینے کے مرادف ہے، اور اس کا مطلب اس
اس قوم کو عقائد و خیالات اور دینی مراسم کے محدود دائرہ میں بند کر دینا اور اس کا رشتہ
ماضی سے کاٹ دینا ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ اس تغیر و انقلاب کا اثر اقوام عالم اور انسانی
سوسائٹیوں کی زندگی پر ہمیشہ بہت گہرا پڑا اور وہ آہستہ آہستہ ان قوموں کے تہذیبی سانچہ
یں ڈھل گئی یا اُن کی تہذیب کے تیز دھارے میں مل گئیں جن کی تہذیب و ثقافت سے
(اس کے وسیع مفہوم میں) انھوں نے استفادہ کیا تھا، اور بالآخر وہ اس عقیدہ سے بھی
دست بردار ہو گئیں جسکو ابھی تک وہ اپنے سینہ سے لگائے ہوئے تھیں، اور اس میں ان کو زیادہ دشواری
پیش نہ آئی۔

نئے سوالات نئے مسائل

تہذیب مغرب کے خطرہ پر اس قدر زور دینے اور اسلامی شخصیت اور
ملت مسلم کے وجود، مغرب سے استفادہ و اقتباس کے مضر اثرات کے
بار بار ذکر سے مقصود یہ نہیں ہے کہ زندگی کی وہ سہولتیں، مفید و صالح وسائل، اور راحت
رسانی و رفاہ عام کے وہ سامان و اسباب جو تہذیب مغرب نے فراہم کئے ہیں، قابل
اجتناب ہیں، اور یہ دروازہ بالکل بند کر دینا چاہئے، اس لئے کہ یہ بات کوئی سمجھ دار آدمی

(اور خاص طور پر وہ شخص جو دین کی روح اور دینی تعلیمات سے واقف ہے، اور جانتا ہے،
کہ اسلام اس معاملہ میں ہمیشہ سے بہت روادار کشادہ قلب اور وسیع النظر ہے) کبھی
نہیں کہہ سکتا، لیکن اس موقع پر مغربی تہذیب کا مفہوم و موضوع، اسباب و وسائل ایجادات
و آلات اور روزمرہ زندگی کے مفید اور کارآمد تجربوں سے زیادہ وسیع و عمیق ہے، اس سے
مراد وہ تمام افکار و اقدار، معیار و پیمانۂ زندگی کو مغربی رنگ میں رنگنا، شہروں کی ہمہ گیر اور
از سرِ نو منصوبہ بندی، نیز زندگی کے وہ آداب اور انداز و اطوار ہیں، جو اسلام کی تعلیمات
اور طہارت و نظافت، اعتدال و توازن، میانہ روی و توسط کے اس کے اپنے معیار
کے منافی ہیں، اور شریعت کی مقرر کردہ حدود کی پابندی پر پورے نہیں اترتے، اس
مغربی طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت کے ساتھ ایک مسلمان کے لئے آداب شریعت کا
لحاظ اور بہت سی سنتوں پر عمل نہایت دشوار ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اس صحیح اسلامی
زندگی سے (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام اور تابعین عظام
نے گزاری تھی) بہت دور ہوتا جاتا ہے، اس مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کرنے کے بعد
پوری قوم ایک نئی شخصیت کی حامل ہو جاتی ہے، اور اس کی شناخت صرف اسلامی
ناموں اور قومی و مقامی لباسوں سے ہو سکتی ہے، (جن کا رواج بعض مشرقی ممالک میں
ابھی تک باقی ہے) یا اس وقت اس کے مسلمان ہونے کا احساس ہوتا ہے، جب وہاں
مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے، یا جب آپ وہاں کسی مسجد میں داخل ہوتے
ہیں، اور اس ملک کے حالات کے مطابق آپ کو نمازی نظر آتے ہیں کہیں کم اور کہیں زیادہ
ان ملکوں کا اسلام سے رشتہ عقائد و مراسم کے ایک کمزور دھاگہ سے بندھا ہوا ہوتا ہے
جو خدانخواستہ کبھی ٹوٹ جائے تو ہر چیز کا خاتمہ ہے۔

مکمل اسلامی تہذیب کی طرف | مجھے یقین ہے، کہ ایک طرف عصر جدید کی فراہم کردہ سہولتوں اور علم جدید کی بخشے ہوئے عطیوں اور دوسری طرف تہذیب اسلامی کے حسن، سادگی، سنجیدگی، طہارت و نظافت خصوصی اعتنا، اسراف و تبذیر، ظاہری مظاہر اور غیر ضروری زیبائش و آرائش سے اجتناب دونوں چیزوں کو بآسانی جمع کرنا ممکن ہے، لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اسلامی حکومتیں یا اسلامی معاشرہ ایک جدید، خود کفیل، اور مستقل بالذات پلاننگ و منصوبہ بندی کے لیے اپنے کو آمادہ کرے جو اندھی تقلید، بلا سوچے سمجھے عجلت کے ساتھ اقدام اور احساس کمتری سے آزاد اور پاک ہو اور اُس کے پاس ذہانت آزادانہ فکر و بصیرت خودنگری و خود اعتمادی، اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب کی بالادستی اور برتری پر یقین کامل کا سرمایہ ہو، اس شکل میں یہ منصوبہ بندی اور معاشرہ کی تعمیر نو کا خاکہ اپنے سابق اور مستعار نقشہ سے زیادہ جاذب نظر دلآویز اور زیادہ لایق احترام ہوگا اور یہ منصوبہ بند اسلامی شہر نہ صرف سیاحوں کا مرکز ہوں گے بلکہ اس سے بڑی تعداد میں اہل علم ان کو دیکھنے کے لیے آئیں گے، اور شاید تہذیب کا یہ حسین دلچسپ نمونہ یا طرز نو متعدد مغربی ممالک کو اس پر آمادہ کر سکے گا، کہ وہ اس کے بعض پہلوؤں کی اپنے ہاں نقل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں یا کم از کم اس پر غور کرنے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوں جیسا کہ ایک زمانہ میں اندلس کی اسلامی تہذیب کے ساتھ پیش آیا تھا اور مغربی تہذیب کے فلسفہ و ادب پر اس نے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔

تہذیب مغرب کا ناقص ایڈیشن | لیکن افسوس کی بات ہے کہ کسی مشرقی مسلم ملک اور کسی مسلم حکومت کو اس کی بھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ محض تجربہ کے طور پر اس کی کوشش کرتا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ممالک آج مغربی تہذیب کا ایک ناقص و ناتمام ایڈیشن یا اس کی

ایک ایسی دھندلی اور مٹی ہوئی تصویر ہیں، جو مغربیوں کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی، اور اُن کے اندر اُسے دیکھ کر احترام کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا جب وہ ان شہروں میں سیاحت وتفریح کی غرض سے وارد ہوتے ہیں، تو اس نقالی یا حسنِ مستعار کو دیکھ کر کہتے ہیں، (بضاعتنا رُدت الینا) یہ تو ہمارا ہی سامان ہے جو ہمیں لوٹا دیا گیا ہے۔

تعلیم و ثقافت کی نئی قومی پالیسی اس سے زیادہ خطرہ کی بات تعلیم وثقافت اور اعلام (اطلاع و ابلاغ و قومی رہنمائی) کی نئی قومی پالیسی ہے، جس سے زیادہ طاقتور، موثر اور زود اثر نسخہ (بالخصوص نئی نسل کی تشکیلِ جدید میں) اب تک دریافت نہیں ہوا، وہ ایک ہی وقت میں دایہ بھی ہے، مکتب کا استاد بھی، معلم و مربی بھی، اور زعیم و رہنما بھی وہ ایک مخصوص ایمان وعقیدہ، اور افکار و اقدار پر ایمان رکھنے والی قوم کو آسانی کے ساتھ تراش خراش کے ایک نئی قوم بنا سکتا ہے، جو اپنے آباء و اجداد سے صرف خون و نسل کا یا زبان کا تعلق رکھتی ہے، بلکہ اس کو ایک ایسی باغی قوم بنا دیتا ہے جو ان عقائد، مسلمات و مبادی اور ان اخلاقی اقدار سے جنگ کرنا، اُس کو تباہ و برباد کرنا اس کے ملبہ کو راستہ سے ہٹانا، اور باقی ماندہ آثار کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، خواہ اس تخریبی اور سلبی عمل پر اس کی ساری توانائیاں، ذہانتیں اور صلاحیتیں صرف ہو جائیں اور پورا ملک اور معاشرہ ایک خونریز خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائے جو بعض اوقات بیرونی حملہ اور غیر ملکی اقتدار سے کہیں بدتر اور کہیں زیادہ طویل ہوتی ہے، یہ معنوی اور اخلاقی نسل کشی کسی قوم و ملت کے لیے جسمانی نسل کشی (Genocide) سے زیادہ خطرناک ہے، "نسلی قتل عام" کے وہ قدیم ترین علمبردار جو اپنے وحشیانہ سلوک اور درندگی و سفاکی میں ضرب المثل ہیں، اگر اس راز کو سمجھتے اور

یہ جدید وسائل استعمال کرتے تو اس قدر، ہرگز بدنام نہ ہوتے بلکہ شاید تاریخ ان کو بہت اچھے الفاظ سے یاد کرتی، اور ان کو خلق پرور، علم نواز اور انسانیت دوست کہا جاتا۔

عالم اسلام کی موجودہ قیادت

عالم اسلام کی قیادتوں کی کہانی، ادھر نصف صدی کے اندر در اصل مسلم اقوام کے اسلامی و دینی مزاج سے گلو خلاصی کی اور ہر ممکن ذریعہ سے اس کی سرکوبی و بیخ کنی کی کہانی یا تاریخ ہے، یہ خون آشام جنگ اکثر اسلامی ممالک میں ناکامی و نامرادی پر ختم ہوئی، لیکن اس مدت میں اس نے ان قائدین کے بہترین قوائے ذہنی و عملی اور ان اقوام کی ساری توانائیوں اور صلاحیتوں کو بے دردی کے ساتھ نچوڑ لیا اور اس کا کوئی فائدہ ان کو نہ پہونچا، اگر حقیقت کے اعتراف اور قوم کی نبض شناسی کی بنیاد پر اس سے بہت تھوڑی کوشش کی جاتی تو قوم و ملک کو اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہونچتا، اور ان قائدین کے وقت اور صلاحیت کا بڑا حصہ ضائع ہونے سے محفوظ رہتا

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

الجزائر کی جنگ آزادی (جس میں جوش ایمانی اور غیرت ملی کا پورا پورا استعمال ہوا) نیز فرماں روائے مغرب کا امن مارچ (Gren march) (جو نومبر ۷۵ء میں بڑی حکمت و قابلیت کے ساتھ شروع ہوا، اور اس کی کامیابی کی صدائے بازگشت ساری دنیا میں سنی گئی) اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ امت صرف اس بات پر لبیک کہتی ہے، اور اس تحریک کے لیے سرفروشی و جان سپاری کے لیے آمادہ ہوتی ہے، جو دینی رنگ کی حامل ہو، جو اس کے دل کے مضراب کو چھیڑ دے، اور اس کے سوئے ہوئے ایمانی جذبات کو بیدار کر دے، وہ صرف ایمان و عقیدہ اور شوق و محبت کی زبان سمجھتی ہے، جس کو عقل سے پہلے اس کا دل سنتا ہے یہ تجربہ عالم اسلام کے مشرق و مغرب میں دسیوں بار کیا

کیا جا چکا ہے، اس لیے عقلِ عملی اور فطرتِ سلیمہ بلکہ عاقلانہ سیاست اور حکیمانہ قیادت کا بھی تقاضا ہے کہ یہ قیادتیں ان اقوام سے استفادہ کا یہ مختصر اور آسان طریقہ چھوڑ کر دو پیچیدہ راستے اختیار نہ کریں جن کا ساتھ یہ قومیں بددلی سے اور مجبوری کی وجہ سے دیتی ہیں، اور ان کے مزاج کے ساتھ طاقت آزمائی اور اُس کو بدلنے کی سعیِ لاحاصل میں ان قیادتوں اور خود ان اقوام کا بڑا قیمتی وقت برباد ہوتا ہے، اور وہ کوششیں کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مرادف ثابت ہوتی ہیں، اس لیے کہ ؎

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اور جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

ومکلف الایام ضد طباعہا ؎ متطلب فی الماء جذوة نار[1]

مجرمانہ سستی، اور غیر ضروری رواداری

ان قیادتوں میں وہ قیادتیں بھی ہیں، جن کے دل میں اسلام کا احترام ہے، اور وہ اپنے دائرہ اختیار اور دائرہ اثر میں اسلامی احکام نافذ کرنا چاہتی ہیں، اور ان کو اپنے عوام کا اعتماد اور احترام بھی حاصل ہے، لیکن وہ سستی و غفلت، کاموں کو ملتوی کرنے کی عادت، ارادہ اور فیصلہ کی کمزوری، اور اسلام دشمن عنصر کے ساتھ غیر ضروری رواداری کا شکار ہیں، وہ ان عناصر کو اپنے تعلیمی نظام، اعلام (Information) صحافت اور پریس میں کام کرنے کا موقع دیتی ہیں اور اس کا نتیجہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عناصر ان کمزور قیادتوں کو راستے سے ہٹا کر اقتدار پر پہلی فرصت میں قابض ہونا چاہتے ہیں اور رفتہ رفتہ ملک کے پورے انتظامی ڈھانچے پر اپنی گرفت مستحکم کر لیتے ہیں، مسلم اقوام ان بے دین، لامذہب اور کمیونسٹ طالع آزماؤں کے

---

[1] لہٰذا اس کو اس کے مزاج اور رفتار کے خلاف کسی چیز پر مجبور کرنا ایسا ہے جیسے کوئی پانی میں آگ کا شعلہ تلاش کرے۔

رحم و کرم پر چھوڑتی ہے، اور ان مقاصد اور اُس طرز زندگی کی طرف اس کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے، جن سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا، وہ سب کچھ دیکھتی ہیں، لیکن کچھ کر نہیں سکتی ہیں۔

یہ صرف ان مسلم قائدین کی سستی و سہل انگاری، مواقع ضائع کرنے کی عادت، اور اپنے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں کو بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرنے کا مزاج ہے، جس کا خمیازہ بھی خود اُن ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ مغرب اسلامی ان تلخ و سنگین تجربوں سے جو ممالک اسلامیہ کی تاریخ میں بار بار کئے گئے، اور خاص طور پر ماضی قریب کے ان واقعات سے جو روز روشن کی طرح عیاں ہیں، پورا فائدہ اٹھائے گا، اور وہ مہلک غلطی نہ کرے گا، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے:۔

السعید من وعظ بغیرہ — خوش نصیب وہ ہے، جو دوسروں سے سبق حاصل کرے۔

دگر دانائے راز آید کہ ناید | آج مسلم ممالک اور مسلم اقوام کو ان سر پر منڈلاتے ہوئے مہیب خطروں سے اگر کوئی بچا سکتا ہے تو وہ باہمت، عالی حوصلہ اور ارجمند و اقبال مند قائد و رہنما ہے، جو اپنے عقیدہ اور اصول کی خاطر اپنی لذت و راحت کو قربان کر سکے اور نفس کے تمام مرغوبات (مثلاً آرام و آسایش، مدح و توصیف، ملک و مال اور جاہ و اقتدار) پر غالب آسکے اور واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور اللہ کے مظلوم و مغلوب بندوں کی انسان نما درندوں سے گلو خلاصی اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی پاسبانی، اُن کے مستقبل کی ضمانت، خدا کی خوشنودی اور رضا، اور جماعتِ مجاہدین و مجددین میں شمولیت سے بڑھ کر

کیا جا چکا ہے، اس لیے عقلِ عملی اور فطرتِ سلیمہ بلکہ عاقلانہ سیاست اور حکیمانہ قیادت کا بھی تقاضا ہے کہ یہ قیادتیں ان اقوام سے استفادہ کا یہ مختصر اور آسان طریقہ چھوڑ کر وہ پیچیدہ راستے اختیار نہ کریں جن کا ساتھ یہ قومیں بددلی سے اور مجبوری کی وجہ سے دیتی ہیں، اور ان کے مزاج کے ساتھ طاقت آزمائی اور اس کو بدلنے کی سعی لاحاصل میں ان قیادتوں اور خود ان اقوام کا بڑا قیمتی وقت برباد ہوتا ہے، اور وہ کوششیں کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مرادف ثابت ہوتی ہیں، اس لیے کہ۔ ع

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

ومكلف الأيام ضد طباعها متطلب في الماء جذوة نار[۱]

مجرمانہ سستی، اور غیر ضروری رواداری

ان قیادتوں میں وہ قیادتیں بھی ہیں، جن کے دل میں اسلام کا احترام ہے، اور وہ اپنے دائرہ اختیار اور دائرہ اثر میں اسلامی احکام نافذ کرنا چاہتی ہیں، اور ان کو اپنے عوام کا اعتماد اور احترام بھی حاصل ہے لیکن وہ سستی و غفلت، کاموں کو ملتوی کرنے کی عادت، ارادہ اور فیصلہ کی کمزوری، اور اسلام دشمن عنصر کے ساتھ غیر ضروری رواداری کا شکار ہیں، وہ ان عناصر کو اپنے تعلیمی نظام، اعلام (Information) صحافت اور پریس میں کام کرنے کا موقع دیتی ہیں اور اس کا نتیجہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عناصر ان کمزور قیادتوں کو راستے سے ہٹا کر اقتدار پر پہلی فرصت میں قابض ہونا چاہتے ہیں اور رفتہ رفتہ ملک کے پورے انتظامی ڈھانچہ پر اپنی گرفت مستحکم کر لیتے ہیں، مسلم اقوام ان بے دین، لامذہب اور کمیونسٹ طالع آزماؤں کے

۱؎ زمانہ کو اسکے مزاج اور رفتار کے خلاف کسی چیز پر مجبور کرنا ایسا ہے جیسے کوئی پانی میں آگ کا شعلہ تلاش کرے۔

ہم دکرم پر چھوڑتی ہے، اور ان مقاصد اور اس طرز زندگی کی طرف اس کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے، جن سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا، وہ سب کچھ دیکھتی ہیں، لیکن کچھ کر نہیں سکتی ہیں۔

یہ صرف ان مسلم قائدین کی سستی و سہل انگاری، مواقع ضائع کرنے کی عادت اور اپنے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں کو بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرنے کا مزاج ہے جس کا خمیازہ بھی خود اُن ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ مغرب اسلامی ان تلخ و سنگین تجربوں سے جو ممالک اسلامیہ کی تاریخ میں بار بار کئے گئے، اور خاص طور پر ماضی قریب کے ان واقعات سے جو روز روشن کی طرح عیاں ہیں، پورا فائدہ اٹھائے گا، اور وہ مہلک غلطی نہ کرے گا، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے:۔

السعید من وعظ بغیرہ   خوش نصیب وہ ہے، جو دوسروں سے سبق حاصل کرے۔

دگر دانائے راز آید کہ ناید | آج مسلم ممالک اور مسلم اقوام کو ان سر پر منڈلاتے ہوئے مہیب خطروں سے اگر کوئی بچا سکتا ہے تو وہ باہمت، عالی حوصلہ اور ارجمند و اقبال مند قائد و رہنما ہے، جو اپنے عقیدہ اور اصول کی خاطر اپنی لذت و راحت کو قربان کر سکے اور نفس کے تمام مرغوبات (مثلاً آرام و آسایش، مدح و توصیف، ملک و مال اور جاہ و اقتدار) پر غالب آسکے اور واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور اللہ کے مظلوم و مغلوب بندوں کی انسان نما درندوں سے گلو خلاصی اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی پاسبانی، اُن کے مستقبل کی ضمانت، خدا کی خوشنودی اور رضا، اور جماعتِ مجاہدین و مجددین میں شمولیت سے بڑھ کر

عزت اور ذلت کسی اور چیز میں نہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، کہ اس طرح کے گنہگار و وفاشعار بندوں کو جو کسی آڑے وقت میں اسلام اور مسلمانوں کے پشت پناہ ہوتے ہیں، عزت و سرخروئی، قبولیت و مقبولیت، فیض عام اور نقش دوام، دلوں پر حکمرانی اور محبوبیت و نیکنامی کا وہ انعام عظیم اور حیات جاودانی عطا فرماتا ہے، جس کے سامنے دولت دنیا کے پجاریوں بھوٹی اور وقتی شہرت کے طلب گاروں اور مصنوعی عزت کے خریداروں کی یہ "متاع فانی" کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

مغرب اسلامی کے ان تمام بھائیوں کو جنھوں نے انتہائی خلوص و گرم جوشی کے ساتھ ہمارا ہر جگہ استقبال کیا اور اپنی اسلامی اخوت اور روایتی عربی مہمان نوازی کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کیا، ہمارا سلام شوق پہونچے اس لیے کہ یہ چند دن جو ہم نے ان کے جوار میں اور اُن کے خوبصورت سر سبز و شاداب ملک میں گزارے، عمر کے ان حسین و خوشگوار دنوں میں ہیں جو انسان کے حافظہ سے کبھی محو نہیں ہوتے۔

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ کرد علی کی کتاب "الاسلام والحضارۃ العربیہ" کا آزادانہ اردو ترجمہ مولانا شاہ معین الدین ندوی کے قلم سے جس میں یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی علمی اور تہذیبی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور اسلامی تمدن تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

قیمت - ۱۳-۷۵

دیارِ پورب کا چوتھا علمی دور

(از جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ، بمبئی)

دیارِ پورب کا چوتھا علمی دور نوابی اودھ کے قیام (۱۱۳۰ھ) سے اس کے خاتمہ (۱۲۷۳ھ) تک کل ۱۴۳ سال کا ہے، اس زمانہ میں ملک میں بے حد انتشار تھا، دہلی کی مرکزی حکومت بہت کمزور ہو گئی تھی، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے تخت پر محمد شاہ اور شاہ عالم جیسے نااہل اور عیش پسند بادشاہ بیٹھے تھے، جن کی حیثیت امراء اور وزراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی، نادر شاہ کے ہاتھوں بادشاہ اور پایۂ تخت کی جو درگت ہوئی اس سے مغل حکومت کی کمزوری و بے بسی بالکل عیاں ہو گئی، نادر شاہ کی واپسی کے بعد تورانی امراء کے مقابلہ میں ایرانی امراء کا دخل حکومت میں بڑھ گیا، اور سعادت علی برہان الملک وزیر الممالک ہو گئے، آگے چل کر اسی خاندان نے اودھ میں ایک نئی حکومت قائم کی، اس دور میں ان اطراف کی ساری علمی رونق سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محدود ہو کر رہ گئی، قدیم علمی و دینی خانوادے تباہ و برباد ہو گئے، ان کی جاگیریں اور معافیاں ضبط کر لی گئیں، وظائف بند کر دیئے گئے، اور مختلف طریقوں سے ان کو شیعہ بنایا گیا جس کے نتیجہ میں نیا علمی ماحول اور نئی مذہبی فضا قائم ہوئی،

نوابی اودھ میں حسبِ ذیل گیارہ حکمران گذرے ہیں:

۱۔ نواب برہان الملک وزیر الممالک سعادت علی خان نیشاپوری متوفی ۱۹ ذوالحجہ سنہ ۱۱۵۱ھ

۲۔ نواب ابوالمنصور صفدر جنگ، داماد نواب سعادت علی خان متوفی ۱۷ ذوالحجہ سنہ ۱۱۶۷ھ

۳۔ نواب شجاع الدولہ پسر صفدر جنگ متوفی ۲۳ ربیع الاول سنہ ۱۱۸۹ھ

۴۔ نواب آصف الدولہ پسر شجاع الدولہ متوفی سنہ ۱۲۱۰ھ

۵۔ نواب مرزا علی خاں پسر آصف الدولہ، معزول و اسیر بنارس سنہ ۱۲۱۲ھ

۶۔ نواب سعادت علی خاں متوفی رجب سنہ ۱۲۲۹ھ

۷۔ نواب غازی الدین حیدر پسر سعادت علی خان متوفی ۲۷ ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ

۸۔ نواب نصیر الدین حیدر پسر غازی الدین حیدر متوفی سنہ ۱۲۵۳ھ

۹۔ نواب نصیر الدولہ محمد علی شاہ برادر سعادت علی خان متوفی سنہ ۱۲۵۸ھ،

۱۰۔ نواب امجد علی شاہ پسر محمد علی شاہ، متوفی سنہ ۱۲۶۳ھ

۱۱۔ نواب واجد علی شاہ، معزول سنہ ۱۲۷۲ھ

یہ لوگ مذہباً شیعہ تھے، اور ان کے اثر سے اودھ میں شیعیت کو بڑا فروغ ہوا۔

ابتدا میں نوابی اودھ کا طول گورکھپور سے قنوج تک ۲۳۰ کوس اور عرض شمال میں ہمالیہ پہاڑ سے الہ آباد تک ۲۱۵ کوس تھا، اس کی مشرقی حد صوبہ بہار، مغربی حد قنوج شمالی حد کوہستان، اور جنوبی حد مانک پور تک تھی، اس میں چار سرکاریں تھیں، (۱) سرکار گورکھپور، (۲) سرکار بہرائچ (۳)، سرکار خیرآباد (۴) سرکار لکھنؤ، پوری مملکت میں ۱۹۰ محال تھے، اور سالانہ آمدنی ۲۲ کروڑ روپیہ تھی[۱] مگر اس کی وسعت بعد میں سمٹتی گئی، تیسرا حکمران نواب شجاع الدولہ پسر صفدر جنگ سنہ ۱۱۶۳ھ میں اودھ اور الہ آباد کا حاکم ہوا، اسی زمانہ میں محمد شاہ عالم نے بکسر کی جنگ میں شرائط

---

[۱] [illegible] مطبوعہ نولکشور

صلح کی رو سے شہر غازی پور کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا، اور چوتھے حکمران نواب آصف الدولہ نے اپنے دورِ حکومت میں قرضہ کی ادائیگی میں غازی پور کے علاوہ جونپور، بنارس کے علاقے بھی انگریزوں کی تحویل میں دے دیے، اور چھٹے حکمران نواب سعادت علی کے دور میں لارڈ ولزلی سے صلحنامہ کی رو سے ۲۷ رجب سنہ ۱۲۱۶ھ (۱۰ نومبر سنہ ۱۸۰۱ء) میں چکلہ اعظم گڈھ، پرگنہ ماہل، پرگنہ مئوناتھ بھنجن کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں شامل کر کے ضلع گورکھپور میں داخل کر دیا گیا[1]، مذکورہ بالا معاہدہ سے انگریزوں نے یہ فائدہ اٹھانا چاہا کہ نواب سعادت علی خاں ۷۶ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرے، نیز یہ کہ قلعہ انگریزوں کے حوالہ کیا جائے جس میں دس ہزار انگریزی فوج رہے گی، نواب مذکور نے ان شرائط سے انکار کر کے تخت چھوڑنا چاہا، مگر لارڈ ولزلی اپنی ضد پر اڑا رہا، یہاں تک کہ مذکورہ بالا علاقے انگریزوں کے حوالہ کرنے پڑے، ان علاقوں سے اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ ۵۳ لاکھ ۸۳۰،۹۷۶ روپیہ ۱۲ آنے ۳ پائی تھی، جس میں اعظم گڈھ وغیرہ سے ۴۲۲۶۹۵ روپیہ ۸ آنے ۶ پائی حاصل ہوئے تھے[2]،

اس قسم کی تفصیلات ہمارے موضوع سے باہر ہیں، البتہ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نوابانِ اودھ کا دور سیاسی اور ملکی حوادث و فتن سے پُر تھا، انگریزوں کے ایسے ہوشیار حریف کی ریشہ دوانیوں کے باوجود یہ عیش و عشرت میں مدہوش تھے، کبھی خوابِ غفلت سے بیدار ہوتے تو شراب و کباب کے دماغ مذہبی دلچسپیوں سے دھونے کی کوشش کرتے، مگر مذہب کی حقیقی تعلیمات پر عمل کے بجائے مذہبی مراسم کی نمائش سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے، طاقتور حریف سر پر تھا، مگر اس ملت کو متحد رکھنے کے بجائے شیعیت کی تبلیغ سے سنیوں کو بیزار کر رہے تھے اور اس میں بھی حکیمانہ طرزِ دعوت کے بجائے ترغیب و ترہیب سے کام لیتے تھے، ان کی اس روش نے

۱؎ اعظم گڈھ گزیٹیر ص ۱۲۲، سنہ ۱۹۲۲ء ۲؎ تاریخ اودھ مولوی نجم الغنی ج ۴ ص ۵۱۴

اودھ کی علمی زندگی کو تہس نہس کر دیا اور علماء و مشائخ کے پرانے خاندان تباہ ہو گئے۔

علم وعلماء کی تباہی

دیار پورب کی صبح بہار کی رنگین و حسین داستان مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مزے لے لے کر سنائی ہے، اب ان ہی کی زبانی شام اودھ کی بے کیف کہانی بھی سنی چاہئے، جو اس کے عینی شاہد بھی ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

وتا حدود سنہ ۱۱۳۰ھ ثلاثین ومائۃ والف ہنگامۂ علم وعلماء درین گل زمین گرمی داشت، تا آنکہ برہان الملک سعادت علی خان نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، واکثر بلاد عمدۂ صوبۂ الٰہ آباد، نیز مثل دارالخیر جونپور وبنارس وغازی پور، وکڑہ مانک پور، وکوڑہ جہان آباد، وغیرہا ضمیمۂ حکومت گردید، ووظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید یکقلم ضبط شد، وکار شرفاء ونجباء بہ پریشانی کشید، واضطراب واضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ دریشۂ سپاہگری انداخت و رواج تدریس وتحصیل بان درجہ نماند، ومدارسے از عہد قدیم

سنہ ۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین رنگ وبو کی مٹی میں علم وعلماء کی گرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ عالم کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت علی خان نیشاپوری صوبۂ اودھ کا حاکم ہوا تو اس نے صوبۂ الٰہ آباد کے اکثر بڑے بڑے شہروں کو بھی جیسے دارالخیر جونپور، بنارس، غازیپور، کڑا مانک پور، کوڑا جہان آباد، وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے قدیم وجدید خاندانوں کے وظائف اور جاگیریں اور معافیاں یکقلم ضبط کر لیں، جس کی وجہ سے شرفاء ونجباء نے بڑی پریشانی اٹھائی اور معاشی تنگی وپریشانی نے اس دیار کے لوگوں کو حصول علم سے ہٹا کر پیشۂ سپہ گری میں ڈال دیا،

معدن علم و فضل بود یکقلم خراب افتاد،
انجمن ہاے ارباب کمال پیشتر برہم خورد
انا للہ و انا الیہ راجعون،
و بعد ارتحال برہان الملک نوبت
خواہرزادۂ او ابوالمنصور صفدر جنگ
رسید، و وظائف و اقطاعات بدستور
زیر ضبط ماند، و در آخر عہد محمد شاہ سنہ ۱۱۵۹ھ
سنہ تسع و خمسین و مایۃ و الف صوبہ داری
الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد
و تتمۂ وظائف آن صوبہ کہ تا حال از
آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط درآمد
و در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ
وزارت اعلیٰ صعود نمود، و نائب صوبہ
کار بر ارباب وظائف تنگ تر گرفت
تا حین تحریر کتاب این دیار پامال حوادث
روزگار است لعل اللہ یحدث بعد
ذلک امراً [1]

اور تعلیم و تدریس کا رواج یوں ختم ہو گیا کہ جو
عہد قدیم سے معدن علم و فضل تھا بالکل ویران ہو گیا اور
اکثر باکمال کی محفلیں اجڑ گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون
برہان الملک کے مرنے پر اس کے بھانجے
ابوالمنصور صفدر جنگ کو یہاں کی حکومت ملی
اس کے دور میں بھی وظائف اور جاگیریں
بدستور سابق ضبط رہیں، سنہ ۱۱۵۹ھ میں محمد شاہ
عالم کے آخری عہد میں الہ آباد کی صوبہ داری
بھی صفدر جنگ کے حوالہ کر دی گئی تو جو
وظائف اب تک باقی تھے، وہ بھی نہ رہ
سکے بلکہ سب ضبط کر لئے گئے، اور احمد شاہ
کے دور میں صفدر جنگ وزیر اعلیٰ بنا تو نائب
صوبہ دار نے وظیفہ یاب خاندانوں پر سختی
کی۔ اور اس کتاب مآثر الکرام کی تصنیف
کے وقت (سنہ ۱۱۶۸ھ) تک یہ دیار حوادث زمانہ
سے پامال و برباد اور تباہ حال ہے لعل اللہ
یحدث بعد ذالک امراً،

اس فن کی لئے دوسرے یعنی شاہ اور اس تباہی و بربادی سے گذرنے والے مولوی

---

[1] مآثر الکرام ج ا ص ۲۲۲

خیر الدین محمد شیعی الہ آبادی جون پوری کا بیان کافی ہے، وہ اس دور کے سرد و گرم حالات سے دوچار ہوئے ہیں، جہاندار شاہ کی خدمت میں رہے ہیں، ایسٹ انڈیا کی ملازمت کی ہے، نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ جا چکے ہیں، الہ آباد اور جون پور میں تعلیمی خدمت انجام دی ہے، انھوں نے اپنی کتاب تذکرۃ العلماء (تالیف ۱۲۱۶ھ) میں جون پور وغیرہ کے اہلِ علم و فضل کی تباہی و بربادی کا حال درج کیا ہے، ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، لکھتے ہیں، کہ محمد شاہ کے عہد سلطنت میں نواب برہان الملک سعادت علی خاں نیشاپوری صوبہ اودھ اور سرکاراتِ بنارس و جون پور کا حاکم ہوا، نواب مذکور صوبہ اودھ کا انتظام کرنے کے بعد ۱۱۴۷ھ میں جون پور آیا، چونکہ اس شہر کے مشائخ، امرار و حکام کی حاشیہ نشینی کے عادی نہیں تھے، اس لئے ان میں سے کوئی اس کے درِ دولت پر حاضر نہیں ہوا، ایک دن نواب مخدوم الملک شیخ غلام غوث کی ملاقات کے لئے نکلا، اس وقت وہ ہاتھی پر سوار تھا، مخدوم الملک کی خانقاہ کے قریب ایک درخت تھا، جس کی شاخیں ہاتھی کے گذرنے میں حائل تھیں، شاخ کٹنے تک نواب وہیں پڑا رہا، اسے امید تھی کہ خود مخدوم الملک یا ان کا کوئی آدمی استقبال کے لئے آئے گا اور وہ اس کی معیت میں خانقاہ میں حاضری دے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، اور نواب نے غیظ و غضب میں واپس آکر اپنے مصاحبوں سے کہا کہ اس شہر کے علماء اور مشائخ مالداری کے نشہ میں خود کو بلکہ خدا کو فراموش کر چکے ہیں، پھر خیمہ میں جا کر حکم دیا کہ یہاں جتنے قدیم و جدید خانوادے ہیں، ان سب کی جاگیریں ضبط کر لی جائیں، چنانچہ اس کے بعد مشائخ اور مدرسین کی جاگیریں، مراعات اور طلبہ و فقراء کے سب وظیفے روزینے یک قلم موقوف کر دیئے گئے اور معاشی تنگی نے شہر کے باشندوں کو تحصیل

سے روک دیا، دور دراز سے آئے ہوئے طالب علم در بدر دست نگر ہوکر پھرنے لگے، مشایخ اور مدرسین طلب معاش میں خانقاہوں اور مدرسوں سے باہر نکل گئے، مدرسے ویران ہوگئے، اور خانقاہیں بوم و شغال کا خرابہ بن گئیں،

اس تباہی و بربادی کے بعد مخدوم الملک شیخ غلام غوث بادشاہ کی خدمت میں دہلی گئے، اور اسے تمام حالات سے آگاہ کیا، بادشاہ نے مستحقین کی جاگیروں کی واگذاری کے لیے شاہی فرمان جاری کیا، مگر نواب برہان الملک نے جونپور کے علما و مشایخ کے کبر و غرور کی داستان بادشاہ کو لکھ بھیجی اور لکھا کہ اس صورت میں سرکار جونپور کی مال گذاری میں سوا لاکھ کا نقصان ہو جائیگا، اور بادشاہ نواب کی ناراضگی کے خیال سے اس کام سے باز آگیا، البتہ صرف مخدوم الملک کی جاگیر واگذار کرنی چاہی، مگر انھوں نے تنہا خوری پسند نہیں کی، اور ان کی غیرت و حمیت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے شہر کے علماء و مشائخ اور دیگر لوگوں کو نظر انداز کر کے صرف اپنا معاملہ درست کریں، کچھ دنوں کے بعد دہلی ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا،

نواب برہان الملک سعادت علی خاں کے مرنے پر ابو المنصور خاں حاکم ہوا، اس نے بھی ضلع جونپور کے غریبوں کے ساتھ وہی شیوۂ بیداد جاری رکھا بلکہ بقول شخصے" ہر کہ آمد بر آں مزید نمود" والی بات ہوئی، اور اُس کے نائب تمکین خاں خواجہ سرا نے اکثر منصب داروں کی جاگیریں ضبط کر لیں، نواب شجاع الدولہ کے دور حکومت میں ضبطی کی یہ بلا بہت زیادہ پھیل گئی، اور پورے ممالک محروسہ میں ہر خاص و عام یکساں طور سے اس کی زد میں آگیا، جب نواب شجاع الدولہ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست و

فرار کا منھ دیکھنا پڑا اور مسٹر مارتھ نوازی اودھ کی چاروں سرکاروں کے
انتظام پر مامور ہوا تو اس نے تمام لوگوں کی جاگیریں اور وظیفے واپس کر دیئے
مگر اسی سال لارڈ کلیف نے صلح و مصالحت کے بعد ان سرکاروں کو
پھر نواب شجاع الدولہ کے حوالہ کر دیا، اور اس کے کارپردازوں نے پھ
وہی بیداد شروع کر دی، منصب دار بیچارے اپنی جاگیروں اور جائدادوں
پر ابھی پوری طرح قبضہ بھی نہیں کر سکے تھے کہ پھر چھین لی گئیں، ۱۱۸۸ھ میں نواب
شجاع الدولہ کے انتقال پر نواب آصف الدولہ حاکم ہوا تو اس نے مختار
کی وساطت سے ممالک محروسہ کے تمام اضلاع کے حکام کو عزبا کی جاگیروں کی
واگذاری کا فرمان جاری کیا، مگر ایلچ خاں اس کار خیر سے مانع ہوا، اور طرح
طرح کے حیلے بہانے سے آصف الدولہ کو باز رکھا اسی زمانہ میں مسٹر جان
برسٹو کلکتہ سے لکھنؤ آیا، اور نواب کے کارپردازوں کا تماشا دیکھ کر چاروں
سرکاروں کو ان کے عمل و دخل سے نکال لیا،

بنارس میں بھی اسی قسم کی صورت پیدا ہوئی وہاں کے حکام نے راجہ
اجیت سنگھ کو خوش کرنے کے لئے مظلوموں پر توجہ نہیں دی، جس سے یہ جماعت
مصیبت میں مبتلا رہی، آخر ۱۱۹۶ھ میں گورنر ہیسٹنگز نے کلکتہ سے بنارس آکر راجہ
اجیت سنگھ کو اس کی بدکرداری کے سبب ضلع بدر کیا، اور علی ابراہیم خاں کو حاکم
عدالت مقرر کر کے کچھ لوگوں کی جاگیریں واپس کرائیں[1]،

شیعیت کی تبلیغ واشاعت | نوابانِ اودھ صرف شیعہ ہی نہیں تھے، بلکہ اس مذہب

---

[1] تذکرۃ العلماء از صفحہ ۵ تا صفحہ ۸،

کے سرگرم داعی و مبلغ بھی تھے، جاگیروں کی ضبطی اور وظیفوں کی بندش میں ان کی اس تنگ نظری کو دخل ہے، جو خانوادے شیعہ ہو جاتے اُن کی جاگیریں بحال آتی تھیں، عزاداری کے لئے بڑی بڑی جاگیریں اور معافیاں دی جاتی تھیں، مولانا عبد الحئی صاحب نے گل رعنا میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے لہو و لعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں دل سے کوشش کی۔ ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے، وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے، ان کی کوشش سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے، اور ان کو جاگیریں ملیں، اور جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کر لی گئیں، شاہ علی اکبر چشتی مودودی کے مشورے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتداء میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی، یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کر لیا، اور نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمام مذہب دی،[1]

مولوی عبد الحق، بابائے اردو، نے بھی بڑے محتاط انداز میں مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے، وہ یہ کہ ان علماء و فضلائے بلگرام میں جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہلِ تشیع میں سے نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے

---

[1] گل رعنا ص ۱۵۳،

وہاں بعد کے زمانہ میں رواج پایا، اگر ان علماء میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور وہ مذہب شیعہ پر ہے، یا ان کے نسب ناموں میں ان علما کے نام نکلیں تو ہمارا خیال اور بھی قوی ہو جائے گا، یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع و قصبات پر اور بعض اوقات دور ودراز کے مقامات پر بھی مذہبی طور سے خاص اثر ڈالا ہے، چنانچہ جون پور و دیگر مضافات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقن کو پہنچ جاتا ہے، جب مذہب کی پشت پر حکومت ہوتی ہے، تو حالت اندیشہ ناک ہو جاتی ہے، میرا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں، کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام لیا بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو جو اعتقاد کے کچے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے، ایسا ہر جگہ ہوا ہے، اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا، اور قصبۂ بلگرام بھی اس اثر سے نہ بچا، معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانہ میں اہلِ تشیع وہاں نہ تھے، اور اگر تھے تو خال خال، لیکن بعد کے زمانہ میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہونچا[1]،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے نامی گرامی سُنی خانوادے جو کئی صدیوں سے علما، فضلا، اور مشایخ کے مرکز تھے، نوابی اودھ کے دور میں شیعہ ہو گئے اور جاگیر و جائداد کی ضبطی کے خوف یا لالچ کی وجہ سے ان کے اخلاف نے اپنے اسلاف کا مذہب ترک کر کے شیعیت اختیار کر لی، چنانچہ میر علی عاشقان سرائیری کے خاندان والے اسی دور میں شیعہ ہوئے، نواب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی کے بعد

---

[1] مقدمہ مآثر الکرام ص ۱۴،

صوبۂ اودھ کی تمام معافیوں کی ضبطی کا حکم صادر کیا تو سیّد امیر ماہ بہرائچی کی اولاد میں دو بھائی غلام محمد اور غلام رسول معافی کی بحالی کے لالچ میں آبائی مذہب کے بجائے شیعہ ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف معافی بحال اور نصف ضبط ہو گئی اُس وقت سے بجائے اعراس کے تعزیہ داری کرنے لگے، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں نصف معافی بھی ضبط ہو گئی، راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کا خاندان سلاطین شرقیہ کے زمانہ سے جاگیردار تھا، گونڈہ میں چار پرگنے اور سلون میں دو پرگنے اُن کی جاگیریں تھے، فرخ سیر کے زمانہ سے خوب ترقی کرتے رہے، مگر نوابی اودھ کے آتے ہی اُن پر زوال آیا، اس خاندان میں راجہ سیّد احمد ثانی بخوف ضبطی معافی تبدیل مذہب کرکے امامیہ ہو گئے، نیز ان کے تین لڑکوں میں سے دو شیعہ ہو گئے[1]، حافظ امان اللہ بنارسی نواب برہان الملک سعادت خاں کا نشانہ بنے، اور ان کو جو مراعات اور جاگیریں عالمگیر سے ملی تھیں سب ضبط کر لی گئیں، اس سلسلہ میں ان کو آخری عمر میں محمد شاہ کے پاس دلی جانا پڑا، اُن کی اولاد بھی بعد میں شیعہ ہو گئی، شاہ ابو الغوث گرم دیوان پھیردی لہادی نواب صفدر جنگ کے دور میں ۱۱۶۲ھ میں جبکہ عظیم گڈھ کے حاکم کے ظلم و زیادتی سے تنگ آکر نواب فضل علی خاں حاکم غازی پور کے پاس چلے گئے تھے، اسی طرح بہت سے سنی خاندان نوابی اودھ کے دور میں شیعہ بنے یا بنائے گئے، اور جو اپنے مسلک پر اڑے رہے، طرح طرح سے پریشان ہوئے اور دوسرے دیار میں جا کر نوابوں، رئیسوں، راجوں زمینداروں کے علاوہ انگریزوں کے قائم کردہ مدرسوں اور سرکاری

---

[1] آئینہ اودھ؛

عدالتوں میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، یا پھر اپنے وطن میں غربت و افلاس کی زندگی پر قناعت کرکے اپنی سخت جانی سے علمی اور دینی مشاغل میں منہمک رہے، بلکہ حتی الامکان حالات کا مقابلہ کرتے رہے، مگر شیعیت کی تبلیغ و اشاعت کا کام بہت منظم تھا، ہمدردی اور دلداری کے علاوہ مبلغین بھیجے گئے، مدرسے امام باڑے اور چوک تعمیر ہوئے، تعزیہ داری کے لئے معافیاں دی گئیں، قصبہ مبارکپور میں اس سلسلہ کی کوششوں کے اجمالی بیان سے اس کا اندازہ ہو جائے گا مولوی رمضان علی نے یہاں آکر ایک شاندار امام باڑہ نواب شجاع الدولہ کے دور ۱۲۰۹ھ میں تعمیر کیا، اور اس کے اندر چبوترہ اور پنجہ نواب سعادت علی خاں ہی کے دور میں ۱۲۱۶ھ میں بنوایا، اس زمانہ میں ایسی شاندار عمارت اس دیار میں نہیں تھی طغرے اشعار اور نقش و نگار سے مزین تھی، اسی میں ایک بڑا مدرسہ بھی جاری تھا، اسے مکان رمضان شاہ کہتے ہیں، اسی زمانہ میں شیخ سیف علی باہر سے یہاں آئے اور انھوں نے بھی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ امام باڑہ رمضان علی کے بالمقابل بجانب جنوب ایک امام باڑہ تعمیر کیا جو بعد میں منہدم ہوگیا، شیخ چراغ علی بھی اسی دور میں شیعیت کی تبلیغ کے سلسلے میں اس قصبہ میں آئے، جنھوں نے قصبہ کے مغرب میں ایک پرفضا باغ میں شاہ پنجہ کے نام سے ایک عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کیا، بازار میں قدم رسول نامی عمارت بھی اسی دور کی ہے، ان کے علاوہ اور کئی اور امام باڑے اس دور کے بنے ہوئے اب تک موجود ہیں،

نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں یہاں سب سے پہلا شیعہ سنی فساد ہوا، جس میں ایک شخص جان سے مارا گیا، اس وقت چکلہ اعظم گڈھ کا حاکم

کاظم علی خاں پسر زین الدین خاں کوڑے والا تھا، اس نے مقدمہ میں شیعوں کی طرفداری کی، اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے پاس فیض آباد میں مرافعہ ہوا مگر یہاں بھی انصاف کے بجائے طرفداری نے کام کیا، اور یہ معاملہ کسی طرح درہم برہم ہوا، اس کی تفصیل مولوی حسن علی فاروقی نے واقعات و حادثات مبارکپور میں درج کی ہے،

عام مسلمانوں میں بے چینی | مغل سلطنت کا آخری دور سخت اضطراب اور بے چینی میں گذرا، جس میں مسلمانوں کو مختلف مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا، مرکز دہلی کی کمزوری، اندرونی و بیرونی یلغار، انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار ملک میں خودمختاریوں کا زور، یہ سب ایسے حالات تھے جن میں مسلمانوں کی ملکی، سیاسی، علمی، اور دینی قدریں بری طرح مجروح ہو رہی تھیں، خاص طور سے اہل علم اور ارباب دین و دیانت شدید ترین مشکلات میں مبتلا تھے، اور پورے ملک میں سخت بے چینی پائی جا رہی تھی، مرکز اور صوبے اپنی بے دست و پائی کی وجہ سے کچھ کرنا بھی چاہتے تو نہیں کرسکتے تھے، ان ہی حالات میں حضرت سید احمد بریلوی (ولادت ۱۲۰۱ھ شہادت ۱۲۴۶ھ) کی امارت و امامت میں مشہور دینی تحریک اٹھی جس کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں بنگال سے لے کر سرحد تک کے علماء اور ارباب دین جان و مال سے شریک تھے، اس زمانہ میں نواب غازی الدین حیدر اور نواب نصیر الدین حیدر کی حکومت تھی، ایک مرتبہ جب کہ سید صاحب ٹیلہ پیر محمد شاہ لکھنؤ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ فروکش تھے، وزیر معتمد الدولہ نے ان سے ملاقات کرکے پانچ ہزار کی رقم نذر کی، خود نواب غازی الدین حیدر اس موقع پر سید صاحب سے ملنا چاہتے تھے، مگر بعض مجتہدوں

نے حیلہ بہانہ کر کے ایسا نہیں کرنے دیا،

نواب سعادت علی خاں کے دور میں چوک اور امام باڑہ کے جھگڑے میں ۱۶ اپریل ۱۸۱۳ء (۱۲۲۹ھ) کو مبارک پور (اعظم گڈھ) پر باہر کے کئی ہزار بلوائیوں اور فسادیوں نے حملہ کیا اور ہندؤوں اور مسلمانوں میں شدید ترین جنگ ہوئی، جس میں ۲۵-۲۶ مسلمان شہید ہوئے، اور تقریباً تین سو عیسائی مارے گئے اور آخر میں فوراً تا نون تک مبارکپور کے مسلمان لوٹے، جلائے گئے، مگر ان مظلوموں کی دادرسی نہ ہو سکی، اس جنگ کی تفصیل "واقعات و حادثاتِ مبارک پور" میں موجود ہے،

اس کے بعد نواب واجد علی شاہ کے آخری دور میں اجودھیا کی بابری مسجد اور ہنومان گڑھی کا جھگڑا اٹھا، مسجد پر مہنتوں اور بیراگیوں نے قبضہ کر لیا تھا اس کے خلاف علماء کی قیادت میں صدائے احتجاج بلند ہوئی اور نواب واجد علی شاہ اور ان کے حکام مسجد کی واگذاری کا وعدہ کرتے رہے، مگر مان سنگھ کمانڈر بارلو، اور بیراگیوں کے دباؤ کی وجہ سے آخر تک کچھ نہ کر سکے، مجبوراً شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح نے عزم جہاد کر کے علم محمدی قائم کیا اور ایک معرکہ میں مولوی محمد صالح سمیت ۱۹ مسلمان شہید ہوئے، اس حادثہ فاجعہ کے بعد مولانا امیر علی امیٹھوی کی امارت و قیادت میں مسجد کی واگذاری کے لئے جہاد کی تیاری ہوئی، آخر کار ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ میں ۱۴۰ مسلمان اپنے امیر مولانا امیر علی صاحب کے ساتھ مقام شجاع گنج میں شہید ہوئے، اور انگریزی فوج نے ان سب کو بھون کر رکھدیا، اس حادثہ فاجعہ کے دوسرے ہی سال ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں نے واجد علی شاہ

۱؎ موجودہ بھلسر،

کو گرفتار کرکے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا اور ۷ فروری ۱۸۵۶ء (۱۲۷۳ھ) میں کرنل اوٹرم نے پورے اودھ پر قبضہ کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیدیا،

علمی قدردانی اور علماء نوازی ان نامساعد حالات کے باوجود نوابانِ اودھ کے دور میں دیارِ پورب علم و علماء کی رونق سے محروم نہیں رہا، مذہب شیعہ کے علماء اور ادارے پورے نشاط و انبساط کے ساتھ علمی اور مذہبی مشاغل میں مصروف رہے، اور نوابانِ اودھ کی طرف سے ان کی پوری مدد ہوتی رہی، اس دور میں اس مذہب کے بڑے بڑے علماءٔ و فضلاء اور مجتہدین پیدا ہوئے، جن کی علمی شہرت ایران و عراق اور قم و کاشان تک پہونچی، نیز دیگر ممالک کے شیعی علماء و فضلاء نے حکومت اودھ میں رہ کر نہایت قدر و منزلت پائی، بہت سے سنی علماء بھی تنگ حالی کے باوجود اپنے کام میں صبر و قناعت کے ساتھ مصروف رہے، اور جرأت سے کام لے کر مدارس قائم کئے، اور عام مسلمانوں کے تعاون سے علمی و دینی فضا بحال رکھی، اس دور میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ قدیم خانوادوں کی جاگیروں اور معافیوں کی ضبطی کے نتیجہ میں قدرتی طور سے علم و فن انکے حلقۂ اثر اور دائرۂ اقتدار سے نکل کر پس ماندہ اور پیشہ ور طبقوں میں داخل ہوگیا، ان لوگوں نے اپنے زیر اہتمام مدرسے جاری کئے، اپنے طور پر پڑھنے پڑھانے کا انتظام کیا اور اپنے تعاون سے عمومی مدرسوں میں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ قائم کیا ورنہ اس سے پہلے عام طور پر شرفاء و نجباء کے مکانوں پر یہ کام ہوتا تھا، اور کمزور اور پس ماندہ طبقوں کیلئے تحصیل علم کے مواقع بہت محدود تھے، ہمارے دیار میں عوامی مدرسوں کی موجودہ رونق اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے

"مصائبُ قومٍ عند قومٍ فوائدُ"

اس دور میں دوسری خاص بات یہ ہوئی کہ شیعہ سنی مسائل و مباحث پر جانبین سے کثرت سے کتابیں لکھی گئیں اور دونوں کے اختلافات نکھر کر سامنے آگئے، بڑے بڑے مناظرے اور مباحثے ہوئے اور عام مسلمانوں کو ان کی وجہ سے معلومات حاصل ہوئے، مولانا غلام علی آزاد نے اس دور کے بارے میں بجا طور سے لکھا ہے:۔

باوجود ایں خرابی ہا رواج علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ اینجا است در قلمرو ہندوستان ہیچ جا نیست، ہنوز علمائے فحول جلوہ طراز اند و بہ اصول اقصیٰ مراتب کمال ممتاز،

(ترجمہ)

باوجود اس خرابی بسیار کے اس علاقہ میں علم خصوصاً معقولات کا رواج اس طرح ہے کہ پورے ہندوستان میں کسی اور جگہ نہیں ہے، ابھی تک علمائے فحول مسند علم پر جلوہ طراز رہ کر مراتب کمال کی انتہا تک

"با صد جہاں کدورت باز ایں خرابہ جائے است"[1]

شیعہ مذہب قبول کرنے والوں کے لئے نئے نئے مدرسے جاری کئے گئے، اور جگہ جگہ معلمین و مدرسین بھیجے گئے، چنانچہ مبارک پور میں مولوی رمضان علی کے مدرسہ کا ذکر آچکا ہے، یہ بہت بڑا مدرسہ تھا، جہاں کئی عالم و فاضل درس دیتے تھے، مولوی علی حسن فاروقی نے "واقعات و حادثات مبارک پور" میں ۱۸۱۳ء کی جنگ کے بیان میں لکھا ہے کہ اس امام باڑہ کے تین طرف بہت خوش قطع سائبان تھے، اور ان میں ایک بڑے متبحر عالم فاضل بے مثل بنام مولوی نثار علی مرحوم ساکن قصبہ سرائے میر اور چچا زاد شیخ جان علی صاحب مرحوم خوشنویس علوم عربی و فارسی کا درس دیتے تھے

---

[1] مآثر الکلام ج ۱ ص ۲۲۳،

اسی امام باڑے میں قیام پذیر تھے، مولوی نثار علی بعد میں اسمٰعیلی مذہب قبول کرکے اس فرقہ کے داعی و مبلغ بن گئے تھے، ۱۸۱۳ء کی جنگ میں یہ اور مولوی محمد نشان اور معظم حسین بھی مقتول ہوئے، قصبہ میں شیعہ مذہب کا ایک اور مدرسہ لالن مہتر کے امام باڑے میں تھا، جس میں مولوی بشارت علی ساکن فیض آباد درس دیتے تھے[1] ان مدارس کے علاوہ بہت سے نئے مدارس وجود میں آگئے، جن میں ہر فرقہ کے طلبہ پڑھتے تھے؛ اس زمانہ میں سنی طلبہ شیعہ علما اور شیعہ طلبہ سنی علما سے ادب اور معقولات کی کتابیں پڑھا کرتے تھے،

خود دارالسلطنت لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسہ قدیم زمانہ سے اہلِ سنت کی مرکزی درس گاہ تھا جس کا فیض پورے ہندوستان میں جاری تھا، سنیوں کی طرح شیعہ طلبہ بھی اس سے فیضیاب ہوتے تھے، مگر افسوس کہ نوابی اودھ میں اس کی علمی و دینی مرکزیت کو زوال و انتشار نے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور اس کی عظمت خاک میں مل گئی، ملک العلما، بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی متوفی ۱۲۲۵ھ کو تعزیہ داری کے جھگڑے میں جان کے خوف سے خرابی بسیار کے بعد وطن کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ شاہجہاں پور، رام پور، اور بہار (بردوان) کی خاک چھانتے ہوئے ارکاٹ اور مدراس میں نواب والا جاہ محمد علی خاں کے یہاں پہونچے اور عزت و احترام کے ساتھ وہیں پوری زندگی درس و افادہ میں بسر کی، اسی طرح اس خانوادہ کے دوسرے عالم ملا محمد حسن فرنگی محلی متوفی ۱۱۹۹ھ کو شجاع الدولہ ہی کے دور میں وطن چھوڑ کر رام پور میں سکونت پذیر ہونا پڑا، ان کی درس گاہ کے دو طالبعلموں کو شیعہ سنی کے نام پر لڑا کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا، اور ملا محمد حسن کو جان کے خوف سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا،

[1] واقعات و حادثات مبارک پور قلمی ص ۱۷ و ۲۳،

ان واقعات و حقائق کے باوجود نوابان اودھ نے علم و علماء کی قدر و منزلت اور سرپرستی بھی کی، اور شیعہ علماء کی طرح بہت سے سنی علماء کو بھی نوازا، ان کے عیب کے ساتھ ان کے ہنر کا تذکرہ بھی ضروری ہے، ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں، مولانا حمداللہ شیخ سندیلوی متوفی ۱۱۶۰ھ کو نواب ابو المنصور صفدر جنگ کی قدر دانی اور سفارش سے احمد شاہ بادشاہ نے فضل اللہ خاں کا خطاب دیکر کئی گاؤں کی جاگیر دی، اور انھوں نے سندیلہ میں بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، اسی طرح ان کے صاحبزادے مولوی عسکر علی سندیلوی کو نواب مذکور نے احمد شاہ کے مقربین میں داخل کیا، اور بادشاہ نے ان کو خیر اللہ خان کا خطاب دیکر کئی گاؤں جاگیر میں عطا کئے، انھوں نے بھی سندیلہ میں مدرسہ منصوریہ کے نام سے مدرسہ قائم کیا،

مشہور شیعی عالم اور مجتہد سید دلدار حسین نصیر آبادی متوفی ۱۲۳۵ھ نے نواب آصف الدولہ اور وزیر حسن رضا خاں کے یہاں بے پناہ مقبولیت اور وجاہت پائی، وزیر نے ان کو اپنے لڑکوں کا معلم بنا کر گراں قدر مشاہرہ سے نوازا، اور جب وزیر مذکور نے شیخ علی اکبر صوفی فیض آبادی کے مشورہ سے نواب آصف الدولہ کو جمعہ و جماعت کے قیام پر راضی کیا تو سید دلدار حسین کو امامت کے لئے منتخب کیا، ان کے صاحبزادے مولوی باقر کو نواب امجد علی شاہ نے منصف الدولہ کا خطاب دے کر عدالت کا افسر اعلیٰ بنایا، اور وہ آخر تک اسی عہدہ پر قائم رہے، مہاراجہ رتن سنگھ متوفی ۱۲۶۷ھ کا باپ بالک رام نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ میں افسر توپخانہ تھا، رتن سنگھ نے اپنے آبائی مذہب پر رہتے ہوئے عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت زبانوں کے ساتھ ریاضی، ہیئت، انشاء اور شاعری میں مہارت حاصل کی، نواب

غازی الدین حیدر نے ان کو منشی الملک کا خطاب دے کر اپنے دیوان کا میر منشی بنایا،
وہ نواب محمد علی شاہ کے دور تک اسی عہدہ پر رہے، اور نواب مذکور نے ان کو فخر الدولہ،
دبیر الملک، مہاراجہ رتن سنگھ بہادر، ہوشیار جنگ کے خطابات سے نوازا، اس کے
بعد رتن سنگھ ۱۲۶۲ھ میں مسلمان ہوگئے، اور تین سال کے بعد انتقال کیا،

مولانا علی اکبر شاہ فیض آبادی متوفی ۱۲۱۴ھ شیخ قطب الدین مودودی چشتی
کی نسل سے اپنے زمانہ کے مشہور چشتی صوفی تھے، اور تفضیلی مذہب رکھتے تھے، یعنی سنی
ہونے کے باوجود حضرت علیؓ کو حضرات شیخینؓ سے افضل مانتے تھے، وہ اودھ کے حکمرانوں
اور امیروں کے یہاں بے پناہ مقبولیت رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ اور وزیر
حسن رضا خاں اُن کے خاص معتقدوں میں سے تھے، دونوں ان کی خدمت میں حاضری دیتے
تھے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے، حکیم گونگے مرزا محمد علی لکھنوی متوفی ۱۲۶۲ھ
اس دور کے مشہور طبیب و حکیم تھے، اصول کے ایسے پابند تھے کہ علاج و معالجہ میں
کسی چھوٹے بڑے کی پروا نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ نواب نصیر الدین حیدر سخت بیمار
پڑا اور حکیم صاحب کا علاج شروع کیا، مگر پرہیز میں لاپروائی کرتا تھا، حکیم صاحب کو
اس کی خبر ملی تو علاج بند کر دیا، نواب نے دوسرے اطباء کی طرف رجوع کیا مگر کچھ فائدہ
نہ ہوا، آخر کار نواب نے حکیم صاحب کے پاس آدمی بھیج کر معذرت کی، حکیم صاحب
نے علاج کرنے سے انکار کر دیا، نواب نے ایک شاہی افسر کو بھیجا، مگر کام نہیں چلا، حتیٰ
کہ وزیر حاضر ہوا، مگر حکیم صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے، نواب نے مجبور ہو کر کہلا بھیجا کہ اگر
اب بھی آپ علاج سے انکار کریں گے تو شدید مرض کے باوجود کسی طرح سے خود مجھے آپ
کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا، اس کے بعد حکیم صاحب نے یہ کہہ کر دوبارہ علاج

شروع کیا کہ بادشاہ کی حکومت عوام کے جسم پر ہوتی ہے اور میری حکومت دل پر ہے، میں اگر جنگل میں چلا جاؤں تو لوگ میرے گرد جمع ہو جائیں گے،

مولانا سید مرتضیٰ حسینی لکھنوی متوفی ۱۲۵۰ھ انگریزی حکومت کے ملازم تھے، اسی سلسلہ میں کچھ دنوں لکھنؤ سے جا کر کلکتہ میں مقیم رہے، وہاں سے واپس ہو کر نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں لکھنؤ کے مفتی بنائے گئے، اس سے پہلے نواب غازی الدین حیدر کے دور میں انھوں نے حضرت سید احمد بریلویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی،

مولانا جعفر حنفی بریلوی متوفی ۱۲۳۲ھ نہایت دیندار، عبادت گذار اور بزرگ عالم تھے، نواب سعادت علی خاں نے ان کو رائے بریلی سے لکھنؤ کے عہدہ قضا کے لئے طلب کیا، مگر مولانا نے صاف انکار کر دیا،

مفتی ابراہیم حنفی بنارسی متوفی ۱۲۵۲ھ نوابانِ اودھ کے دور میں شہر لکھنؤ کے مفتی تھے، ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھتے تھے،

مولانا احمد بن یعقوب انصاری سہالوی مشہور عالم و فقیہ تھے، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں لکھنؤ میں عہدہ قضا پر فائز ہوئے، اور نواب مذکور کی زندگی بھر اس عہدہ پر رہے،

مولانا جعفر علی کسمنڈوی متوفی ۱۲۸۰ھ نے لکھنؤ میں مفتی ظہور اللہ انصاری فرنگی محلی سے پڑھ کر دہلی میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدثؒ سے تعلیم حاصل کی، پھر لکھنؤ آکر امراء و حکام سے منسلک رہے، اور ایک مقام کے حاکم بنائے گئے،

مولانا حکیم حیدر حسین بریلوی متوفی ۱۲۸۵ھ مخدوم عادل الملک جونپوری کی نسل سے تھے، وہ نوابانِ اودھ کے مقربین میں سے تھے، اور رائے بریلی کے حاکم

بنائے گئے،

مفتی خلیل الدین کاکوروی متوفی ۱۲۷۵ھ ریاضی کے مشہور عالم تھے، ابتدا میں کان پور کے مفتی بنے، اس کے بعد نواب سعادت علی خاں نے ان کو رصدگاہ بنانے کا کام سپرد کیا، مگر نواب کے انتقال کی وجہ سے یہ کام رُک گیا، نواب غازی الدین حیدر نے اپنے زمانہ میں ان کو کلکتہ کی سفارت پر مقرر کر کے پانچ سو روپیہ مشاہرہ دیا،

مفتی علی کبیر مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۹ھ نے فنون عقلیہ و ریاضیہ حاصل کرنے کے بعد دہلی جا کر حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے حدیث پڑھی، بعد میں امراء و حکام سے منسلک ہو کر بڑی مقبولیت پائی، اور اپنے خاندان والوں کی سفارش کر کے ان کو بڑے بڑے عہدے دلوائے، اسی طرح اور بہت سے اہل علم و فضل کو نوابان اودھ کے دور میں قدر و منزلت ملی،

حیات شبلی

نو سو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع کمالات بزرگ کی سوانح عمری نہیں، بلکہ مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ملی اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں متن و حاشیہ دونوں میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی آگئے ہیں جن کا اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک دیباچہ ہے، اسکے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں دیار مشرق میں مشہور اکابر علماء کے حالات آگئے ہیں، یہ بہت عرصہ سے ختم تھی، اب اس کا نیا اڈیشن بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے اور پچھلے اڈیشن کی ہو بہو نقل ہے۔ مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی

قیمت ۵۵ - ۲۶، "منیجر"

اسلامی مسیحی تبادلۂ خیالات

از جناب خلیل حامدی صاحب پاکستان

الحاد و بے دینی کو جو عالمگیر فروغ ہو رہا ہے اس نے اہل مذاہب کو اپنی صفوں کے انتشار کو دور کرنے کی جانب متوجہ کر دیا ہے، دنیا کے بڑے بڑے مذاہب باہمی اختلافات کو نظر انداز کرکے الحاد کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ بنانا چاہتے ہیں، مانٹریال کا انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز عرصہ سے بین المذاہب افہام و تفہیم کے لئے کوشاں ہے، امریکہ اور یورپ کی متعدد یونیورسٹیوں میں مذاہب کے مطالعہ کے شعبے قائم کئے گئے ہیں، دو تین سال ہوئے بیروت میں مختلف مذاہب کے نمایندوں کی کانفرنس اسی غرض سے ہوئی تھی، ہندوستان میں بھی اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی نے اس قسم کے کئی بین الاقوامی اجتماع کئے ہیں جن میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے خوشگوار ماحول میں مختلف مسائل پر بحث کی اور تعاون و یکجہتی کے امکانات کا جائزہ لیا، چند مہینے ہوئے لیبیا میں بھی اس قسم کا ایک سمینار ہوا جس میں بہت سے ملکوں کے عیسائی اور مسلمان نمایندے شریک ہوئے اور اسلام و مسیحیت کے درمیان سینکڑوں برس کے اختلافات دور کرکے اتحاد و تعاون کا نیا دور شروع کرنے کی دعوت دی، ان مباحث کی اہمیت کی بنا پر ہم ترجمان القرآن سے خلیل حامدی صاحب کی مرتب کردہ یہ روداد معارف میں درج کی جا رہی ہے تاکہ ہمارے قارئین دنیا کے حالات اور موجودہ رجحانات کا اندازہ کریں، عیسائی نمایندوں کی استعداد، صلاحیت اور انداز بحث و گفتگو خاص طور پر ہمارے مذہبی حلقہ کے لئے قابل غور ہے، راقم الحروف کو خود بھی ...

...بین المذاہب کانفرنسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا، اور ہر مرتبہ یہی احساس ہوا کہ ہمارے مذہبی رہنما دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کے مقابلہ میں نہ صرف عصر حاضر کے علوم و فلسفہ سے کم واقف ہیں، بلکہ تحقیق کے جدید معیار اور تعبیر کے نئے انداز سے بھی زیادہ باخبر نہیں ہیں، اسی لئے اکثر مواقع پر علماء کے بجائے اسلام کی وکالت یونیورسٹیوں کے پروفیسروں ہی کو کرنی پڑی، یہ صورت حال مذہبی مدارس کے لئے قابل غور ہے، نصاب و نظام تعلیم میں دوررس تبدیلیوں کے بغیر عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ناممکن ہے،

عبد السلام قدوائی

اسلامی مسیحی ڈائیلاگ سیمینار یکم فروری تا ۶ فروری ۱۹۷۶ء طرابلس (لیبیا) میں منعقد ہوا، اس میں ساٹھ ممالک کے تقریباً تین سو نمایندے شریک ہوئے مسلمان نمایندوں میں علماء کم اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور ریسرچ اسکالر زیادہ تھے، عیسائیوں میں کیتھولک پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈوکس سبھی تھے، یورپ اور امریکہ کے نمایندوں کے علاوہ افریقہ کے مختلف حصوں سے بھی عیسائی پادری اور اسکالر کافی تعداد میں شریک ہوئے، افریقہ کی عیسائی ریاستوں مثلاً سینیگال، حبشہ، تنزانیا، اور کینیا وغیرہ کے عیسائی مندوبین نے نمایاں حصہ لیا، اشتراکی ممالک مثلاً روس، یوگوسلاویہ، رومانیہ وغیرہ سے بھی دونوں مذاہب کے نمایندے بھیجے گئے تھے، افریقی نمایندوں کے ناموں سے یہ نہ پتہ چلتا تھا کہ عیسائی ہیں، یا مسلمان، راقم نے جب استقبالیہ کمیٹی کے ایک ذمہ دار شخص سے دریافت کیا کہ مجھے عیسائیوں اور مسلمانوں کی الگ الگ تعداد بتائی جائے تو وہ کہنے لگے کہ میرے رجسٹر میں جو نام درج ہیں، ان میں سے متعدد ایسے ہیں کہ میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون عیسائی ہیں اور کون مسلمان، ہر مہمان کی شہریت کے ساتھ دین کا اندراج نہیں ہے،

سمینار میں اسلامی فریق کے لیڈر لیبیا کے وزیر تعلیم محمد احمد الشریف تھے، اور مسیحی فریق کے لیڈر ویٹیکن کے کارڈینل سرگیو پگنیوڈلی تھے، کارڈینل صاحب نے خود تو صرف افتتاحی تقریر پر اکتفا کیا، مگر ان کی بھاری بھرکم پارٹی نے جو ویٹیکن سے وہ اپنے ساتھ لائے تھے، بحث و مباحثہ میں خوب حصہ لیا، ان میں مونسیپور، پیٹرو روسانو چیرمین کمیٹی اسلامی مسیحی تعلقات، اور ڈاکٹر فرانسس ابوکی سکریٹری کمیٹی اور ڈاکٹر انتھونی شو لیکال ایڈوائزر کمیٹی جسٹس اینڈ پیس خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عیسائی فرقوں میں تناسب نمایندگی کے لحاظ سے کیتھولک درجہ اوّل پر تھے اور پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈوکس درجہ دوم پر، بحث و مباحثہ میں عیسائیوں کے تینوں گروپ ہم آواز تھے، بلجیم سے بھی ایک بڑا وفد آیا ہوا تھا، جن میں سے چند نام یہ ہیں، فادر ویان، یہ بلجیم کے سب سے بڑے اخبار "لبرل بلجیکا" کے اڈیٹر ہیں، جان ڈیلوس یہ بلجیم کے مجلہ "یونیو میگزین" کے اڈیٹر اور بلجیم فلسطین تعاون کمیٹی کے چیرمین ہیں، جیرالڈ فودے، یہ صاحب بلجیم کی مختلف یونیورسٹیوں میں مذہب اور طبعیات کے استاد ہیں، پال پولیٹور، یہ بلجیم میں لووان یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے استاد ہیں، ڈاکٹر بشارت خضرا، یہ بلجیم کے عیسائی وفد کے ہمراہ آئے مگر اصلاً فلسطینی عرب ہیں اور اب موزان یونیورسٹی میں عرب اسٹڈیز کے انچارج ہیں، ان کے علاوہ جو عیسائی لیڈر شامل محفل تھے ان میں رومانیہ کے لارڈ بشپ، لبنان میں رومن کیتھولک کے لارڈ بشپ گریگوا حداد، لبنان میں یونانی آرتھوڈوکس کے نمایندے بشپ ایتھنس ابراہام، اسکندریہ یونیورسٹی (مصر) کے قبطی رہنما ڈاکٹر رسیس نصام، حبشہ کے چرچ آف قدیسہ مریم کے پادری شحاتہ قنوانی، مالٹا کے فادر منتوف، طرابلس کے بشپ بریفنیال اور مشہور عیسائی محقق ڈاکٹر آرنلڈ کپس، ڈاکٹر مورس مورمانی قابل ذکر ہیں، صحافیوں اور اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے نمایندوں میں بھی عیسائیوں (بلکہ یہودیوں) کی اچھی خاصی تعداد تھی،

مسلمان فریق کے لیڈر، لیبیا کے وزیر تعلیم محمد احمد الشریف تھے اور ڈپٹی لیڈر لیبیا کی عرب سوشلسٹ پارٹی کے شعبہ امور خارجہ کے سربراہ احمد شحاتی تھے، عالمی پیمانے پر جن مسلمان اہلِ علم و فکر نے سیمنار میں حصہ لیا، ان میں سے نمایاں اصحاب یہ ہیں:۔ شیخ محمود صبحی، سکریٹری جنرل جمعیت دعوت اسلامیہ لیبیا، شیخ صبحی صالح، نائب صدر مجلس اعلیٰ برائے امور اسلامیہ لبنان، ابراہیم الغویل، یہ لیبیا کے ایک نامور وکیل ہیں، جنرل محمود شیت خطاب، یہ عرب دنیا کے مشہور اسلامی مورخ ہیں، عراق کے رہنے والے ہیں، متعدد حکومتوں میں وزیر رہ چکے ہیں، آج کل مصر میں اس کمیٹی کے سربراہ ہیں جو قرآن حکیم کی ایک جامع لغت تیار کر رہی ہے، پروفیسر خورشید احمد رکن مسلم کونسل آف یورپ ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی، فلاڈلفیا امریکہ، یہ اصلاً فلسطین کے رہنے والے ہیں، پاکستان میں بھی حکومت پاکستان کی ریسرچ اکیڈیمی میں کچھ عرصہ رہ چکے ہیں آج کل امریکہ میں ہیں اور ایم ایس۔اے (مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن) سے وابستہ ہیں، مصر کے ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ، شیخ احمد عبد العزیز ابوظبی کی عدالت شرعیہ کے قاضی القضاۃ، ڈاکٹر عز الدین ابراہیم حاکم ابوظبی کے ثقافتی مشیر، عبد الرحمٰن عطیہ، استاد ٹریننگ کالج طرابلس یونیورسٹی لیبیا، احمد القبیس، پرنسپل، دراسات اسلامیہ کالج، بغداد یونیورسٹی، عبد الرزاق شبیب سکریٹری جنرل، عرب بار ایسوسی ایشن، عراق، امریکہ میں مسلمان طلبہ کی مشہور تنظیم ایم ایس اے کی طرف سے ڈاکٹر جمال برزنجی اور اقبال یونس بھی شریک ہوئے، اسلامی پارٹی کے یوسف مظفر الدین بھی تشریف لائے نیز عبد اللہ صابر نیشنل یونیورسٹی آف کینیا مصر، علامہ محمد اسد مصنف دی روڈ ٹو مکہ اور اسلام اٹ دی کراس روڈز (مراکش) ڈاکٹر مصطفیٰ محمود، مصر، شیخ عمران جمعہ امام الحاج نعیم شیخ العطار (یوگوسلاویہ) مولانا وحید الدین خاں (انڈیا) شیخ علی احمد حسن ڈپٹی اٹارنی جنرل صومالیہ وغیرہ شریک ہوئے،

سیمینار میں بحث کے لئے ذیل کے چار موضوع منتخب کرلئے گئے تھے۔

(۱) کیا مذہب، انسانی زندگی کی آئیڈیالوجی بن سکتا ہے؟

(۲) مختلف مذاہب کے اندر کون سی بنیادیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں؟ نیز انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے اندر کہاں کہاں افہام باہم متحد ہو سکتے ہیں؟

(۳) عدل اجتماعی خدا پر ایمان کے نتیجہ میں بروئے کار آسکتا ہے؟

(۴) ان سابقہ غلط تصورات و خیالات کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے، جو دونوں مذاہب (اسلام اور مسیحیت) کے مابین قائم ہو چکے ہیں، نیز اس عدم اعتماد کی فضا جس نے دونوں میں تفریق برپا کر رکھی ہے، کیسے ختم کی جا سکتی ہے؟

ان چاروں موضوعات پر پہلے دونوں فریقوں کی طرف سے ایک ایک مقالہ پیش کیا جاتا تھا، پھر اس پر دونوں طرف کے اہلِ علم بحث و مباحثہ کرتے تھے، پہلے موضوع پر مسلمانوں کی طرف سے طرابلس یونیورسٹی لیبیا کے پروفیسر عبد الرحمٰن عطیہ اور عیسائیوں کی طرف سے ویٹی کن کے نمائندے ڈاکٹر انتھونی شو نیکال نے مقالے پیش کئے، دوسرے موضوع پر مسلم فریق کی طرف سے امریکہ کے ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی اور مسیحی فریق کی جانب سے پادری مورس مور انس آف رومانیہ نے مقالے پڑھے، تیسرا موضوع بڑا ہنگامہ خیز رہا، اس پر مسلم فریق کی طرف سے لیبیا کے قانون داں ابراہیم الغویل اور عیسائی فریق کی طرف سے ڈاکٹر پادری کانٹ نے اپنا اپنا مقالہ پڑھا، چوتھا موضوع مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین پیدا شدہ غلط فہیموں کو دور کرنے کے سلسلہ میں تھا، اس پر مسلمانوں کی طرف سے ڈاکٹر عز الدین ابراہیم (ابوظبی) اور عیسائیوں کی طرف سے ویٹی کن کے نمائندے ڈاکٹر فنٹر جیبر الله (جو بلجیم سے آئے تھے) نے مقالات پیش کئے،

یہ دلچسپ مناظرہ طرابلس کے نہایت پُر فضا علاقے میں واقع میدان التحریر ہال میں منعقد ہوا، عربی، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے فوری ترجمہ کا بھی انتظام تھا، سمینار کی صدارت عیسائی فریق اور مسلم فریق کے مابین باری باری منتقل ہوتی رہی، ویٹی کن اپنے روایتی لباس اور راہبانہ طور طریق کے ساتھ تھا کارڈینل لارڈ بشپ، بشپ اور فادر اپنے مخصوص یونیفارم میں تھے، مسلمان بجز چند پر عمامہ پوش دو ہی چار تھے باقی سب کوٹ اور پتلون میں ملبوس تھے، یہاں نہ صرف دنیا کے ساٹھ بڑے بڑے ممالک کے اہل علم و نظر تشریف فرما تھے، بلکہ دنیا کے دو بڑے مذاہب کا ہر پہلو سے مقابلہ اور موازنہ تھا یہاں کی ہر چیز گفتار و کردار، ظاہر و باطن اور اپنے اصول و عقیدہ سے وابستگی ایک دوسرے پر گہرا اثر ڈال رہی تھی، اگر مسیحیت آزمائش میں تھی تو اسلام اس سے بھی بڑھی آزمائش میں تھا،

مہمانوں کو طرابلس کے جدید ترین ہوٹل فندق الشاطی میں ٹھہرایا گیا تھا جو چند سال ہوئے بحر متوسط کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے،

کارڈینل سرگیو پگنوڈلی کی یہاں بڑی تعریف ہوتی رہی، یہ اب موجودہ پاپائے روم کے بعد ویٹی کن کی گدی کے امیدوار ہیں، ۱۹۵۱ء میں انھیں لارڈ بشپ کا منصب ملا، ویٹی کن کی طرف سے مختلف اوقات میں یہ بولیویا، کینیڈا اور نائجیریا میں سفیر رہ چکے ہیں، ۱۹۷۴ء میں انھوں نے سعودی عرب کا دورہ کیا تھا، اور شاہ فیصل شہید سے ملے تھے، اسی سال کے آخر میں جب سعودی عرب کے علماء کا وفد شیخ محمد الحرکان، وزیر عدل کی قیادت میں ویٹی کن میں پوپ سے ملنے کیلئے گیا تو کارڈینل سرگیو نے اس وفد کا استقبال کیا تھا، یہ مسلمانوں کی تمام زبانیں روانی سے

بولتے ہیں، قرآنی آیات کثرت سے تلاوت کرتے ہیں، مسلمان مفکرین کے ساتھ ان کی گفتگو میں جس خوش اسلوبی اور وسعتِ نظر سے ہوئیں اس پر لوگوں نے بہت داد دی لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، ۵ رفروری ۱۹۷۶ء کے اجلاس میں کارڈینل نے ایک ایسا جملہ کہا جس پر حاضرین نے بڑی تالیاں بجائیں، انھوں نے کہا،"مسیحیت کے نام پر ہم ان الفاظ پر اظہار معذرت کرتے ہیں اور طالب عفو ہیں جو رسول صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ کی ذات کے بارے میں کہے جاتے رہے ہیں"

اس جملہ پر لیبیا کے نمائندے جناب حمیدہ الزلیطی نے کہا "میری نظر میں یہ جملہ تاریخ کے اندر پہلا اور بہت بڑا فیصلہ ہے، اور دونوں مذاہب کے مابین تاریخ کا ایک نیا باب کھول رہا ہے" ڈاکٹر عزالدین ابراہیم (ابوظہبی) نے مزید آگے بڑھ کر ویٹی کن سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ "خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کریں اور مسلمان اساتذہ کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں اور الٰہیات کی فیکلٹیوں کے دروازے کھول دیئے جائیں" اس پر ایک اخبار نویس کے جواب میں کارڈینل نے کہا۔"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرنا بےشک نہایت اہم مسئلہ ہے لیکن یہ موضوع الٰہیات سے تعلق رکھتا ہے، اور گہرے مطالعہ کا متقاضی ہے، ہمارے سکریٹریٹ کی طرف سے بڑے بڑے ماہرین الٰہیات کو چند ماہ پیشتر یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ اس مسئلے کا مطالعہ کریں، ہمیں امید ہے کہ اس مطالعہ کے نتیجہ میں جلد ہی ہمیں وہ حل دستیاب ہو جائے گا جو ہمارے ضمیر کو بھی مطمئن کرے گا اور ہمارے مسلمان بھائیوں کو بھی" لبنان کے لارڈ بشپ گریگوار حداد نے تو اختتامی اجلاس میں عیسائیوں کو خود ہی یہ دعوت پیش کر دی کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم کر لی جائے، اس موقع پر گریگوار نے یہ الفاظ بطور تجویز دہرائے، (ترجمہ) ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد اللہ

کے رسول اور تمام انسانیت کے لئے اللہ کے نبی ہیں)

مسلمان نمایندے دو طرح کے نظر آئے، ایک وہ جو عیسائی مفکرین سے مرعوب تھے، اور ان کی ہر ممکن خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اسلام اور مسیحیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے، اور قرآن کی وہ آیت پڑھ پڑھ کر سنا رہے تھے جس میں عیسائی قسیسوں اور راہبوں کی تعریف کی گئی ہے، یہ گروہ اپنے اس موقف کی تاویل یہ کرتا تھا کہ یہودیوں نے عیسائیوں کو اپنا ہمنوا بنا کر انھیں دنیا کے اندر مسلمانوں کے خلاف کر رکھا ہے لہذا اب ہم انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں، یہ آیت بھی اس گروہ کی طرف سے بار بار تلاوت کی جاتی رہی کہ "تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم" مگر دوسرا گروہ مسلمانوں کی نمایندگی کر رہا تھا اور نہایت صحت مندانہ بنیادوں پر ڈائیلاگ کا حامی تھا، اس کے اندر اپنے دین پر پورا اعتماد پایا جاتا تھا، اور وہ ہر بات کرتے وقت حسن اسلوب اور لطافت بیان کا دامن ترک کئے بغیر دلیل و حجت سے کام لیتا تھا، اور یہ سمجھتا تھا کہ لن ترضی عنک الیہود ولا النصاری حتی تتبع ملتھم (جب تک تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرو یہود و نصاری تم سے ہرگز راضی نہیں ہو سکتے) ایک اور بات عجب یہ نظر آئی کہ مغرب کے سفید فام عیسائی نمایندوں اور افریقہ کے سیاہ فام عیسائیوں کے درمیان میل بہت کم ہے، افریقی عیسائی، مسلمانوں سے قریب تر ہیں، خصوصاً جب تاریخ میں استعمار اور مسیحیت کی ملی بھگت کا ذکر چھڑ جاتا تو افریقی نمایندے مسلمانوں کا ساتھ دیتے تھے

صدر لیبیا، اسلامی موضوعات پر بحث و مباحثہ کرنے میں خوب حصہ لیتے ہیں، عیدین کی نمازوں میں دو دو گھنٹے کی تقریریں ہوتی ہیں اور اسلام، اسلامی فلسفہ اور اسلامی تاریخ پر اپنے مخصوص نقطہ نظر کے مطابق روشنی ڈالتے ہیں، اس سمینار

میں بھی انھوں نے عملاً حصہ لیا، پہلے ہی دن جب یہ موضوع زیر بحث تھا کہ کیا مذہب زندگی کی آئیڈیالوجی بن سکتا ہے، قذافی صاحب اجلاس میں پہنچ گئے، اور مسلم گروپ کی نشستوں کے درمیان بیٹھ گئے، اور اسلامی مفکر کی حیثیت سے بحث میں پورا حصہ لیا، اختتامی اجلاس کے بعد ۶ فروری ۱۹۷۶ء کو قذافی صاحب نے تمام وفود سے ملاقات کی اور بڑی بے تکلفی سے باتیں کیں۔

شہر کی عام فضا بھی یہ اشارہ کر رہی تھی کہ اسلام اور مسیحیت کا طرابلس میں مقابلہ ہو رہا ہے، سمینار کے اندر مقامی باشندوں کی بہت محدود تعداد شریک تھی، مگر عام شہریوں کے لئے لیبیا کا الاذاعۃ المرئیہ (ٹیلیویژن) اس کی ضروری تفصیلات نشر کرتا رہتا تھا، جب راقم نیروبی سے ادیس ابابا اور قاہرہ ہوتا ہوا طرابلس کے ہوائی اڈے پر اترا تو ہوائی اڈے پر مختلف ملکوں کے پرچم لہراتے دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ مجلسِ مناظرہ گرم ہے، سمینار کے منتظمین نے راقم کا استقبال کیا اور پھر وی، آئی، پی لاونج میں کچھ دیر آرام کرانے کے بعد طرابلس کے فندق اِتنالیا میں روانہ کر دیا، طرابلس کا ہوائی اڈہ اور طرابلس کے در و دیوار ایسے اشتہارات سے بھرے تھے، جن میں اسلام اور مسیحیت کو باہم بغلگیر ہونے کی دعوت دی گئی تھی، مثلاً۔

"آسمانی کتابیں، انسان کا احترام سکھاتی ہیں اور تمام ابنائے آدم کے مابین مساوات قائم کرتی ہیں"

"اس سمینار کا مقصد انسانیت کی بحالی ہے"

"اللہ کا دین بھی ایک ہے، اور انسان بھی ایک ہی خاندان کے افراد ہیں"

"براہ راست گفت و شنید امر واقع کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے"

"آسمانی کتابیں انسانیت کا پیغام لے کر آئی ہیں" وغیرہ وغیرہ،

قاہرہ کی طرح طرابلس بھی آج کل اشتہارات کی زد میں ہے، طرابلس کی دیواریں طرح طرح کے اشتہارات سے لت پت ہیں، مثلاً

"انقلاب کے دشمنوں کو کچل دو۔"

"عوامی کانفرنسوں کے بغیر جمہوریت وجود میں نہیں آسکتی۔"

"عرب موسیقی پوری تاریخ میں عرب اتحاد کی حفاظت کرتی رہی ہے۔"

پچھلے دنوں لیبیا میں کچھ عناصر نے بغاوت کا راستہ اختیار کیا تھا، ان کے بارے میں اشتہارات لگے ہوئے ہیں کہ

"کافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔"

بُرے کام کرنے والے کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے، ان کا یہ خیال بہت بُرا فیصلہ ہے،

قذافی کے "پانچ اصول" بورڈ پر لکھ کر بڑے بڑے چوراہوں میں نصب ہیں،

مصر کے نامور ڈاکٹر مصطفیٰ محمود نے کانفرنس کے اندر ایک پُر لطف ہلچل پیدا کر دی، انھوں نے بائبل کا ایک ایسا ایڈیشن عیسائی نمایندوں کی خدمت میں پیش کیا، جو بیت المقدس میں چھپا ہے اور جس کے اندر یہودیوں نے جا بجا تحریف کی ہے، مسلم فریق کے نائب صدر احمد شحانی نے یہ نسخہ نادر، ڈاکٹر فرانس ابوخ (Francois Abumokh) کو پیش کر دیا، فرانسس ابوخ، ویٹی کن میں اسلامک ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں اور عربی زبان کے ماہر ہونے کے علاوہ دوسری مختلف اسلامی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ کرنل معمر القذافی نے اس بائبل کے بارے میں یہ مزید انکشاف کیا کہ اس میں دو سو ساٹھ مقامات پر یہودیوں نے تحریف کی ہے، اسرائیل سے فادر کابوشی نے جیل سے ایک

خط سیمنار کو بھیجا جو یہاں تقسیم کیا گیا، فادر کا بوشی نے جسے یہودیوں نے بغاوت کے الزام میں جیل میں بند کر رکھا ہے، اپنے خط میں بتایا ہے کہ یہودی، عیسائیوں کے مقدس مقامات کی توہین کر رہے ہیں، القیامہ چرچ میں حضرت مریمؑ کے بت کو توڑ پھوڑ دیا گیا ہے، ان کا تاج چوری کر لیا گیا ہے، جس جگہ سیدنا مسیحؑ پیدا ہوئے ہیں اسے پامال کیا جا رہا ہے، کنیستہ المہد اور بیت اللحم میں "ستارہ داؤد" نصب کر دیا گیا ہے، مسجد اقصیٰ کی بھی توہین کی جا رہی ہے، تاریخی کھدائیوں کے بہانے مسجد کی دیواروں کو گرایا جا رہا ہے، ۱۹۶۷ء سے اب تک عیسائیوں کو وہاں سے جس طرح نکالا جا رہا ہے، اس کے نتیجہ میں ان کی تعداد جنوبی علاقہ میں ڈیڑھ لاکھ سے صرف پینتالیس ہزار رہ گئی ہے"

عیسائی فریق نے فادر کابوشی کا یہ خط سیمنار میں تقسیم کر کے اپنا فرض ادا کر دیا، لیکن کیا اچھا ہوتا کہ مسلمان فریق کی طرف سے بھی شیخ مصطفیٰ ابو طیر کا مسئلہ اٹھایا جاتا، شیخ مصطفیٰ ابو طیر، بیت المقدس کے مجاہد عالم دین ہیں، انھیں پچھلے سال سے یہودیوں نے جیل میں ڈال رکھا ہے، وہاں ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کا اصل نشانہ مسلمان اور مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں، لیکن فادر کابوشی کا بیان یہ بھی بتا رہا ہے کہ یہودی کسی بھی آسمانی مذہب کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، خواہ وہ اسلام ہو یا مسیحیت، عیسائیوں کو یہودیوں کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں کا احساس اب ہو رہا ہے، ۱۹۶۵ء میں پاپائے روم اور ان کی عالمی کونسل نے یہ شدید غلطی کی تھی کہ یہودیوں کو حضرت مسیحؑ کا خون (جو ان کے عقیدے کے مطابق یہودیوں کی گردن پر تھا) معاف کر دیا تھا، اور بیت المقدس کو بین الاقوامی شہر بنانے کی تجویز قبول کر لی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ کیتھولک چرچ اب اپنی غلطی کا احساس کر رہا

اس سمینار میں تمام عیسائی فرقوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ بیت المقدس عربی شہر ہے، اور اسے یہودی بنانے یا تقسیم کرنے یا بین الاقوامی شہر قرار دینے کی کوئی اسکیم قابلِ قبول نہیں ہے،

سمینار میں سب سے زیادہ دھماکہ خیز تقریر ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی کی تھی، ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی کا یہ جملہ بہت چبھتا ہوا تھا کہ یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ مسیحیت کو بھی یہودی کر دیا جائے، ڈاکٹر فاروقی امریکہ میں رہتے ہیں، انھوں نے امریکہ کے حالات کو سامنے رکھکر یہودیوں کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی بے بسی کی طرف حاضرین کی توجہ دلائی عیسائی نقطۂ نظر رومانیہ کے نوجوان پادری مورس مورمانس نے پیش کیا،

قذافی صاحب خود ایک منفرد فلسفی ہیں، پہلے ہی دن کے اجلاس میں وہ جب یکایک تشریف لے آئے تو انھوں نے اپنی بحث کا آغاز اس سوال سے کیا کہ کیا ویٹی کن کی ریاست دین پر قائم ہے یا کسی خود ساختہ نظام پر؟ کرنل صاحب کے جواب کے لئے بشپ روسامن کھڑے ہوئے اور بولے پہلی بات یہ ہے کہ ویٹی کن کا نام دراصل اُن سات چٹانوں کے نام پر ہے جو روم کے اردگرد پائی جاتی ہیں، ویٹی کن اصل میں ایک قبرستان ہے جس میں ایک قدیس مدفون ہے، اور قدیس کی قبر ہی ویٹی کن کے قیام کی بنیاد بنی تھی، اسی بنیاد پر ویٹی کن کو مرکزِ حق کا درجہ دیا گیا، اسی چٹان پر قدیس پطرس کا مقبرہ بھی ہے، شاہ قسطنطین نے اس پر ایک بہت بڑا کلیسا تعمیر کر دیا، جو بعد میں مرکزی کلیسا کی حیثیت اختیار کر گیا، اس کی اہمیت اس کی تاریخی قدر و قیمت سے ہے، لیکن از منہ وسطیٰ سے یہ پوپ کا مرکز بن چکا ہے، اور اسے بین الاقوامی اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اس تشریح کے بعد ویٹی کن مروج معنی میں ریاست نہیں ہے، بلکہ ویٹی کن پوپ کی رہائش گاہ ہے، جسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا

مثنوی نل دمن

از ڈاکٹر محمد طیب صدیقی، سی، ایم کالج دربھنگہ

مثنوی کو ہم فارسی شاعری کی ایجاد کہہ سکتے ہیں، عربوں کے یہاں رجز نگاری کا دستور تھا، اور رجز کو بڑی حد تک مثنوی سے مشابہت ہے، لیکن اسے باقاعدہ مثنوی نہیں کہہ سکتے ہیں،

مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے، غزل اور قصائد اپنی تنگ دامانی اور ردیف و قوافی کی سخت پابندیوں کی وجہ سے اس کی گنجائش نہیں رکھتے کہ ان میں ہر نوع کے طویل و بسیط مضامین پیش کیے جائیں، لیکن مثنوی میں اتنی وسعت ہے کہ جملہ انواع کے طویل و عریض مضامین اس میں حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیے جا سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج صنف مثنوی میں سیکڑوں تاریخی وقائع، اخلاقی مسائل، پند و نصائح کے دفتر اور رزمیہ و بزمیہ داستانیں محفوظ ہیں، انہی بزمیہ داستانوں میں فیضی کی مثنوی "نل دمن" بھی ہے جو عشقیہ داستانوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے فیضی کی مثنوی ایک خاص انفرادیت کی حامل ہے، اس کی عالمانہ بصیرت اور زبان و بیان پر قدرت و مہارت نے اسے انداز بیان کی ندرت اور حسن الفاظ کا امتیازی خلعت بخشا ہے، استعارات و تشبیہات کی شوخی، تخیل و محاکات کی دل آویزی، الفاظ و تراکیب کی تراش و خراش، فقروں کی دروبست اور بندش کی چستی کی بنا پر ہر جگہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" کا عالم نظر آتا ہے، یہ بات درست ہے کہ فیضی نے نفس مضمون کی ترتیب اور کہانی کی تعمیر

مناسب توجہ نہیں کی ہے، لیکن انداز بیان کی ندرت و شوخی سے اس نے اس کمی کی بڑی حد تک تلافی کر دی ہے، اور سچ پوچھئے تو اس نقص کا ذمہ دار فیضی سے زیادہ اس عہد کے مذاق کو قرار دینا چاہئے جس میں انداز بیان ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا ہو سکتا ہے کہ فیضی کو اس روایت سے بغاوت کی جرأت ہو سکی ہو یا یہ کہ زمانے کے مذاق کے مطابق اسے اپنی اسس خامی کا احساس نہ ہوا ہو،

نل دمن کی اصل عشقیہ داستان کی تاریخ تصنیف اور اسکے مصنف کے حالات زندگی کے سلسلہ میں تاریخی یادداشتیں خاموش نظر آتی ہیں، ہندوؤں کی مذہبی کتاب مہابھارت کو اس قصہ کا قدیم ترین ماخذ سمجھا جاتا ہے، فیضی نے اس مثنوی کی بنا اسی قدیم قصہ پر رکھی ہے، صاحب تاریخ فرشتہ نے اس مثنوی کے ماخذ کے متعلق اپنے خیال کا یوں اظہار کیا ہے۔

"در کتب ہند کہ بیش از یں بہ پنج ہزار سال تصنیف شدہ مسطور است کہ قدیم الایام شہر بیدر پائے تخت رایان دکن بود .... و راجہ بھیم سین کہ بغایت شجاع و دانا و عادل و سخی بود از رایان مشہور شہر بیدر است و راجہ نل مالوی غائبانہ بر دختر راجہ بھیم سین کہ دمن نام داشت عاشق شدہ، و قصۂ عاشقی و معشوقی ایشاں در ہندوستان مشہور است و شیخ فیضی شاعر بموجب حکم جلال الدین محمد اکبر شاہ داستان ایشاں را بہ نظم در آوردہ آں را نل دمن نام کردہ"[1]

فیضی نے شاہی حکم کے مطابق نل دمن کی محبت و عشق کے اس جگر گداز قصہ کو نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنوں کے طرز پر انتالیسویں سال جلوس یعنی ۱۰۰۳ھ میں نظم کیا ہے۔ اس مثنوی کی تکمیل کے وقت اس کی عمر انچاس سال تھی، چنانچہ وہ خود کہتا ہے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اوّل ص ۳۲۵،

اکنوں کہ چہل و نہم دور بن دیر | ہفتاد و دو شعبہ کرده ام سیر
سی و نہم از جلوس شاہی | تاریخ مجدد الٰہی
چوں سال عرب شمار کردم | الف و سہ الف نگار کردم

اس عظیم الشان کارنامہ کی مدت تکمیل کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ یہ مثنوی چار ماہ کی مدت میں انجام پذیر ہوئی،[۱] دوسرا طبقہ جس نے اس کتاب کی مدت تکمیل پانچ ماہ قرار دی ہے، منتخب التواریخ کو بنیاد بنایا ہے، حالانکہ خود بدایونی اس مسئلہ پر پورے وثوق کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار نہیں کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :۔

"در مدت پنج ماہ کم و بیش نل دمن را .... مرتب ساختہ"[۲]

اس صورت میں پانچ ماہ والی روایت کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، نتیجۃً چار ماہ والے قول کو معتبر سمجھا جائے گا،

ملا عبد القادر بدایونی اور صاحب تذکرہ سرو آزاد نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد چار ہزار دو سو لکھی ہے،[۳] حسین قلی خاں عظیم آبادی نے بھی اس کی تائید کی ہے، مدیر معارف سید صباح الدین عبد الرحمن نے بھی بزم تیموریہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے،[۴]

اس کے برخلاف شیخ ابو الفضل، محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ کا خیال ہے کہ مثنوی نل ومن میں صرف چار ہزار اشعار ہیں، ڈاکٹر ریو نے بھی ابو الفضل کے اکبر نامہ کی بنیاد پر اس مثنوی کے اشعار کی تعداد چار ہزار قرار دی ہے' ان حضرات نے ثبوت کے

---

[۱] اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۶۲ - ۶۶۱ دربار اکبری ص ۱۷۲ [۲] و [۳] بدایونی جلد دوم ص ۳۹۶، و سرو آزاد ص ۳۰ [۴] بزم تیموریہ ص ۷۶

پر فیضی کے اس شعر کو پیش کیا ہے، ؎

این چار ہزار گوہر ناب کانگیختہ ام بہ آتشیں آب

لیکن خود شاعر کے ایک دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شمار حتمی نہیں تھا اور بہت

سے اشعار نظر انداز کر دیئے گئے تھے، چنانچہ کہتا ہے، ؎

گر بیشتری نثار کردم بے کسر درو شمار کردم

اشعار کی تعداد کی تعیین کے سلسلے میں بدایونی کا قول زیادہ معتبر قرار دیا جا سکتا ہے

دل کر اس کے قول کی تائید خود فیضی کے کلام اور نل دمن کے مخطوطہ و مطبوعہ نسخوں کے

اشعار کی تعداد سے ہو جاتی ہے،

فیضی کی تصانیف میں نل دمن کو بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی

ہے، اپنی نادر تشبیہوں، نازک استعاروں، زبان کی شوخی اور بیان کی دل کشی نے

اس مثنوی کی ایک ایسی جگہ پیدا کر دی ہے جہاں تک امیر خسرو کے بعد شاید ہی کسی

اور کی رسائی ہو سکی ہو،

بدایونی عقیدے کے لحاظ سے فیضی کے سب سے بڑے مخالف ہیں، مگر جہاں اس کے علمی

کارنامے کے ذکر کا موقع آتا ہے اس کی خوبیوں کے اعتراف سے دریغ نہیں کرتے ہیں، چنانچہ مثنوی

نل دمن کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں:۔

"الحق مثنوی است کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند

کسے دیگر نگفتہ باشد"[1]

ابو الفضل کا بیان ہے کہ

---

[1] بدایونی جلد سوم ص ۲۹۹،

"نل دمن چناں گفتہ کہ انگشت حیرت زیر دنداں صاحبان طلاقت ماندہ واز شیرینی

الفاظ ونکات معنی لب بلب ارباب ذلاقت بہم چسپیدہ"[1]

صاحب مرأۃ الخیال اور حسین قلی خاں عظیم آبادی صاحب تذکرہ نشتر عشق نے بھی اس مثنوی کے بارے میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں،

محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ فیضی کو چونکہ فارسی اور سنسکرت ہر دو زبانوں اور ان زبانوں کی طرز ادا سے پوری واقفیت حاصل تھی، اس لئے وہ ایسے عظیم الشان علمی کارنامے میں کامیاب ہوا،

---

[1] اکبرنامہ جلد اوّل ص ۹،

سلسلہ شعر العجم

فارسی شاعری کی تاریخ اس کے تدریجی ارتقاء اور عہد بعہد کے ممتاز فارسی شعراء کے حالات وسوانح اور ان کے کلام پر مبسوط تبصرہ، جو پانچ حصوں پر مشتمل ہی، اسکا چوتھا حصہ اس سلسلہ کا شاہکار ہے، اسی کے ایک حصہ میں مولانا نے فیضی کے کلام اور اس کی مثنوی نل دمن وغیرہ پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، مولانا کے فارسی کے منتخب شعراء میں ایک ہندوستان نژاد فیضی بھی تھا، جو دربار اکبری سے وابستہ اور اس کے نورتن میں شامل تھا،

شعر العجم حصہ اوّل، عباس مروزی سے نظامی تک کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ قیمت

" دوم، خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت ۵،

" سوم، فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام، قیمت ۲۵-۶

" چہارم، شاعری کے انواع واقسام واصناف میں مثنوی خصوصاً شاہنامہ فردوسی پر بسیط تبصرہ، قیمت ۸-۷، پنجم، عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ ۸-۰

مرتبہ مولانا شبلی نعمانی "منیجر"

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مشاہیر کے خطوط

"معارف میں مشاہیر کے خطوط اکثر چھپتے رہے ہیں، ابھی غیر مطبوعہ کافی تعداد میں موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے شائع کئے جاتے رہیں گے، اُن میں سے چند آج شریکِ اشاعت ہیں"

از مولانا ابوالکلام آزادؒ
بنام مولانا شبلی نعمانیؒ

(۱)

۴۳ میڈل روڈ، انٹالی، کلکتہ،

۲۶ راگست ۱۹۱۰ء

خواہی کہ بتو بیش شود شوق نظیری
از بیش خودش کاہ بر آں کاہ نظر دار

آقائے من! آج پرانے کاغذات میں لفافے ڈھونڈ رہا تھا، آپ کے چند خطوط اور کارڈ نکل آئے، میں پھر ایک مرتبہ اسی تنازار میں پہنچ گیا، جہاں کسی کی نگہ ارادت نوازِ مایۂ حیات تھی، والد کے انتقال کو آج دسواں روز ہے، اخبارات میں بھی تذکرہ آچکا ہے، مگر آپ نے تعزیت کی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔

دل ارادت و عقیدت سے اسی طرح لبریز ہے جیسا کہ پہلے تھا، اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گا

از طور صلح و عربدہ بیگانہ ام ہنوز

ہر آتشے نتاختہ پروانہ ام ہنوز

معلوم نہیں آپ کہاں ہیں؟ حافظ عبدالرحمٰن راوی تھے کہ عرصہ تک آنے کی امید نہیں

ہر کیف میں تو جہلم کے بعد بمبئی پہنچتا ہوں اور وہاں سے جہاں آپ ہوں،

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضعداریاں

جوں جوں رُکے وہ، ملنے سے ہم بیشتر ملے

ابوالکلام

(۲)

حضرت مولانا شبلی مد فیوضہ

حضرت! میری مصلحت دید تو یہ ہے کہ کہیں نہ جائیے لکھنؤ میں رہئیے، حج کی دو صورتیں ہیں، ایک تو للعوام کہ بتلاش کعبہ بحر و بر باطے می کنند، اور دوسرا حج خواص کہ جب ضرورت ہوتی ہے کعبہ کو طلب کر لیتے ہیں، ابراہیم بن ادہم ہر ہر قدم دو رکعت نماز کردچوں قریب کعبہ رسید نہ یافت. ندائے غیبی بگوش رسید کہ برائے استقبال رابعہ بصری رفت آپ کا درجہ اس سے بلند ہے، کہ کعبہ کی تلاش میں دشت پیمائی کریں، ہاں اجرام سماوی کا مطالعہ اور فکر فی خلق السَّمٰوٰتِ وَالاَرض، تو گو لکھنؤ میں بیت المقدس جیسی کوئی ٹیلسکوپ اور دوربین نہیں اس لئے اجرام بعیدہ کا مطالعہ بے عذر لیکن تاہم اگر علم ہیئت کے ابتدائی مراتب کی تحقیق منظور ہو تو شہاب ثاقب کے اجزا کی تفرید و تحلیل کیجئے، ایسا نہ ہو کہ باب حرم سے عراقی کی طرح منہ پھیر کر تو برو ں درچہ کردی کہ

مکلوڈا سٹریٹ کلکتہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۰ء)

(۳)

بنام مولانا سید سلیمان ندوی رح

۲۲ راکتوبر ۱۹۱۱ء ۱۳ ارمکلاؤڈ اسٹریٹ کلکتہ

مکرمی! میں تو اخبارات دیکھتا نہیں، اتفاق سے آج حبل المتین کے یہاں مشرق نظر سے گذرا، آپ کی تحریر تاریخ اسلام داخلِ نصاب کی نسبت پوری پڑھی، جی خوش ہوا، کہ آپ کام کر رہے ہیں، حالانکہ مولانا کو خوف تھا کہ کام نہ ہوگا، لیکن اس کے لئے لوگوں سے اپیل کرنے کی ضرورت نہیں، ندوہ کو براہ راست یونیورسٹی سے خط و کتابت کرنی چاہئے اگر ممبران سنڈیکیٹ اور فیلوز کچھ مفید ہو سکتے ہیں، تو اسے بھی اخبار میں لکھنے کی ضرورت نہیں ندوہ کی طرف سے خط و کتابت کرنی چاہئے،

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۴)

بنام مولانا مسعود علی ندوی رح

صدیقی العزیز! آپ ذوقِ سلیم کا ذکر کرتے ہیں، آپ کو کیا معلوم، یہ جلد کس عالم میں چھپی ہے، اور کیونکر میں نے اس کی اشاعت گوارا کی ہے،

تو اگر ان نخور ندۂ گزند راچہ خبر

جلد دوم کی طباعت کی نسبت تفصیلات ہیں، جو بعد کو لکھوں گا، اگر آپ کے یہاں انجمن ہے، تو آپ بآسانی بڑی تعداد میں چھاپ سکتے ہیں،

ترجمان القرآن کے پچاس نسخوں کے لئے کہہ دیا ہے، والسلام علیکم

ابوالکلام دہلی ۴ر فروری ۳۲ء

(مزید) آپ کے ذوق و فکر سے یہ بات بہت بعید تھی کہ کلکتہ کارپوریشن کی ایلڈرمین شپ پر مجھے مبارکباد دیں، جو شخص اس کے میئر شپ پر راضی نہ ہوا وہ یہ خرافات کب منظور کر سکتا ہے، معلوم ہوتا ہے بعض مسلمانوں نے محض اس خیال سے کہ ہندو کانگریسی انکار نہ کر سکیں میرا نام پیش کر دیا تھا، میں بھلا اس لغویت کے لئے کب آمادہ ہو سکتا ہوں[1]،

(۵)

از ڈاکٹر ذاکر حسین[2] رح

بنام مولانا مسعود علی ندوی رح

مخدوم و محترم ۔ السلام علیکم،

عنایت نامہ شرف صدور لایا، امیر جامعہ کے نام آپ کا خط بھی ملا، امیر جامعہ جب بھوپال سے واپس تشریف لائیں گے، تو اُن کی خدمت میں پیش کر دوں گا، میں بہت ڈر رہا تھا کہ نہ معلوم اس معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہو، لیکن اب اطمینان ہو گیا، اب تک نسیم صاحب اور عبدالماجد صاحب دریابادی کی تحریری رائیں موصول ہوئی ہیں، اور وہ دونوں بھی آپ سے متفق ہیں،

گاندھی جی سے آپ کو جو شکایت ہے وہ اس خاص ہمدردی کی وجہ سے ہے، جو آپ کو ہم لوگوں کی پریشانی سے ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ اگر مفصل حالات پر مطلع ہوں تو یہ شکایت نہ رہے، بہرحال وہ آپ کا اور گاندھی جی کا معاملہ ہے، میں اس میں کیوں پڑوں

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول کے سلسلے میں اصل خط ہے، ایلڈرمین ہونے کی خبر پھیل گئی تھی، آخری حصہ اس کے متعلق ہے [2] یہ بڑا اہم تاریخی خط ہے، حکیم اجمل خاں کا انتقال ہو گیا تھا، اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان کی جگہ امیر جامعہ تھے، اور جامعہ کے پرانے نظام کو تبدیل کر کے نئی تشکیل پر غور ہو رہا تھا، مولانا مسعود علی جامعہ کے

البتہ میری طرف سے یقین مانئے کہ بدسلیقگی بالکل نہ ہوگی، میری تجویز میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے جامعہ کی ماہیت کو بدلنا لازم آئے، تجویز صرف یہ ہے کہ موجودہ اُمنا، دستکش ہو کر جامعہ کو ایک اور جماعت کے سپرد کر دیں، جس میں وہ لوگ ہوں جو جامعہ میں عرصۂ دراز تک خدمت کرنے کے لئے آمادہ ہوں اور اس کے واقعی سچے مددگار ہوں، اس سے نہ کالج کا ٹوٹنا ضروری ہوتا ہے نہ اسکول کا، ہاں اگر روپیہ کی کمی کی وجہ سے ساتھی کم رہ گئے، تو البتہ کام میں تخفیف کرنی ہوگی، لیکن اس بارہ میں آپ نے جو کچھ الہ آباد میں فرمایا تھا، وہ مجھے یاد ہے اور انشاء اللہ جامعہ نہ ٹوٹے گی، اور نہ اُس کی جگہ کوئی نئی چیز بنانے کی کوشش کی جائے گی، جامعہ تقریباً اسی طرح چلے گی جس طرح اب تک چلتی رہی ہے ممکن ہے آیندہ گزشتہ سے بہتر کام ہو سکے، اس سال کالج کی جماعتیں اور اسکول کی برابر جاری رہیں گی، بشرطیکہ شوکت صاحب جلسہ میں آکر یہ نہ کہہ دیں کہ اساتذہ کو صبر کرنا چاہئے، ایثار کرنا سیکھو، قربانی کرو، روپیہ کتنا لوگے، میں دوں گا،

یہ باتیں اب کب تک سنیں ہمیں دماغ نہیں خندہ[1]......... شاعر کہہ گیا ہے، اگر شوکت صاحب نے یہ طے کرالیا، ورنہ بہت ممکن ہے کرالیں کہ جامعہ موجودہ اُمنار کے ہاتھ ہی میں رہے، اور وہ چار ماہ دورہ فرما کر ایک لاکھ روپیہ بھیج دیں گے، تو میں اس وعدہ کو صحیح باور کرنے پر تیار نہیں، اور نہ اس صورت میں اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کھانے کپڑے پر یہاں پڑے رہیں، اور نہ ایسی حالت میں خود ایسا کرنے کو جی چاہتا ہے،

بہرحال آپ کو اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کو نہ توڑنے کی نیت ہے نہ کسی نئی چیز کے بنانے کی خواہش صرف یہ ہے کہ موجودہ اُمنار دستکش ہو جائیں، اُن کی جگہ جو جماعت

---

[1] غالب کا پورا شعر یوں ہے:۔

غمِ فراق میں تکلیف سیرِ باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

جامعہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے، اس کا نام مجلس تعلیم ملی ہو، یا کوئی اور نام! فرض کیجئے تبنیہ الغافلین، اس کے ارکان وہ لوگ ہوں جو یا تو جامعہ میں کچھ قربانی کرکے درس کا کام کریں یا اپنا وقت یا روپیہ دے کر اس کی مدد کریں، بس اس کے آگے اور کچھ نہیں،

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، سعید نے اب تک میرے خط کا جواب نہیں دیا مجھے سخت انتظار ہے، سید صاحب کی اس تمام معاملے کے متعلق کیا رائے ہے، اُن کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے، نجیب صاحب، ریاست صاحب اور معین صاحب کی خدمت میں آداب، مولوی عبدالسلام صاحب کی خدمت میں بھی

کلب تو آپ جاتے ہی ہوں گے، حاضرین کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے، بشرطیکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ پھر چندہ مانگنے آرہا ہے، یہ خیال شاید امیر جامعہ کے کسی عزیز کو آجائے خدا مغفرت کرے خوب شخص تھے، والسلام

نیازمند ذاکر حسین ۱۹۲۵ء

(۶)

از مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

مکرمی دام مجدہم! السلام علیکم،

۱۴ مارچ کا لکھا ہوا خط پہنچا تفصیلی واقعات معلوم ہوئے، یہاں ملاقات کی حالت بذریعہ پریس شائع ہوتی ہے، اس پر لوگوں کو اعتبار نہیں ہے تاہم اس سے نفس واقعہ کا علم ہو جاتا ہے، کاش اس کو بھی مفصل تحریر فرما دیں، یہاں حالات متغیر ہونے کے بجائے عوام میں

تحریک ہے، مگر اعلیٰ طبقہ اسی طرح ساکن ہے۔ .... صرف نواب رامپور نے رجعت قہقری کی ہے، فاروق علی اور ارشاد علی صاحبان جو اعزہ کرمی شوکت علی صاحب کے ہیں، قید کر دئے گئے ہیں، اور ابھی تک ان کی رہائی نہیں ہوئی ہے، عوام کا جوش نواب صاحب کے خلاف بڑھ رہا ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے،

اس وقت ہم لوگ ایک دستور العمل بنا رہے ہیں، کہ تمام تحریکیں جلسہ ہائے خلافت کی کس طرح عمل میں لائی جاویں، ہندو بھی شرکت کو تیار ہیں، ہم لوگ اخبارات سے سخت مایوس ہیں، ایک اور وفد کی تجویز ہو رہی ہے کہ جلد آپ لوگوں کی تائید کی غرض سے بھیجا جاوے اور ارادہ ہے کہ سمرنا میں بھی روپیہ لے کر جلد کسی معتبر وفد کے ذریعہ سے بھیجا جاوے روپیہ وصول ہو گیا ہے، یہ بھی قصد ہے کہ ایک وفد ممالک اسلامیہ میں جاوے میں اور حکیم اجمل خاں تیار ہیں، کہ شام اور حجاز و یمن کے وفد میں خود جاویں، اور بھی فضلاء آمادہ معلوم ہوتے ہیں آپ کے جوابات غیر کافی سمجھے گئے ہیں، مولوی ابو الکلام صاحب کا خط و تار بہت تردد آمیز آیا ہے جس کی تفصیل ارسال ہے،

برادرم محمد علی صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا، ان کا خط مجھے راہ سے ملا تھا، ان کو نیز سید حسین صاحب و محمد حیات صاحب کو سلام مسنون فرما دیجئے، فقیر محمد عبد الباری یکم اپریل ۱۹۲۰ء

از مولانا سید سلیمان ندوی رح

بنام نواب سید امیر حسن خاں[1]

لندن ۲۴ مارچ ۱۹۲۰ء عزیز مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مورخہ ۲۶ فروری یہاں ۱۸ مارچ کو ملا، آپ لکھتے ہیں کہ اب تک ہمارے

---

[1] امیر حسن صاحب نواب علی حسن خان ابن نواب صدیق حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلماء کے صاحبزادے تھے،

جامعہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے، اس کا نام مجلس تعلیم ملی ہو، یا کوئی اور نام، فرض کیجئے "تربیۃ الغافلین" اس کے ارکان وہ لوگ ہوں جو یا تو جامعہ میں کچھ قربانی کرکے درس کا کام کریں یا اپنا وقت یا روپیہ دے کر اس کی مدد کریں، بس اس کے آگے اور کچھ نہیں،

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، سعید نے اب تک میرے خط کا جواب نہیں دیا مجھے سخت انتظار ہے، سید صاحب کی اس تمام معاملے کے متعلق کیا رائے ہے، اُن کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے، نجیب صاحب، ریاست صاحب اور معین صاحب کی خدمت میں آداب، مولوی عبدالسلام صاحب کی خدمت میں بھی

کلب تو آپ جاتے ہی ہوں گے، حاضرین کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے، بشرطیکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ پھر چندہ مانگنے آرہا ہے، یہ خیال شاید امیر جامعہ کے کسی عزیز کو آجائے خدا مغفرت کرے خوب شخص تھے، والسلام

نیازمند ذاکر حسین ۱۹۲۸ء

(۶)

از مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

مکرمی دام مجدہم، السلام علیکم،

۴ مارچ کا لکھا ہوا خط پہنچا تفصیلی واقعات معلوم ہوئے، یہاں ملاقات کی حالت بذریعہ پریس شائع ہوتی ہے، اس پر لوگوں کو اعتبار نہیں ہے تاہم اس سے نفس واقعہ کا علم ہو جاتا ہے، کاش اس کو بھی مفصل تحریر فرما دیں، یہاں حالات متغیر ہونے کے بجائے عوام میں

تحریک ہے، مگر اعلیٰ طبقہ اسی طرح ساکن ہے۔.......... امرت نواب رامپور نے رجعت قہقری کی ہے، فاروق علی اور ارشاد علی صاحبان جو اعزہ کرامی شوکت علی صاحب کے ہیں، قید کر دیئے گئے ہیں، اور ابھی تک ان کی رہائی نہیں ہوئی ہے، عوام کا جوش نواب صاحب کے خلاف بڑھ رہا ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

اس وقت ہم لوگ ایک دستور العمل بنا رہے ہیں، کہ تمام تحریکیں جلسہ ہائے خلافت کی کس طرح عمل میں لائی جاویں، ہندو بھی شرکت کو تیار ہیں، ہم لوگ اخبارات سے سخت مایوس ہیں، ایک اور وفد کی تجویز ہو رہی ہے کہ جلد آپ لوگوں کی تائید کی غرض سے بھیجا جاوے اور ارادہ ہے کہ سمرنا میں بھی روپیہ لے کر جلد کسی معتبر وفد کے ذریعہ سے بھیجا جائے روپیہ وصول ہو گیا ہے، یہ بھی قصد ہے کہ ایک وفد ممالک اسلامیہ میں جاوے میں اور حکیم اجمل خاں تیار ہیں، کہ شام اور حجاز وغیرہ کے وفد میں خود جاویں، اور بھی فضلا آمادہ معلوم ہوتے ہیں آپ کے جوابات غیر کافی سمجھے گئے ہیں، مولوی ابوالکلام صاحب کا خط و تار بہت تردد آمیز آیا ہے جس کی تفصیل ارسال ہے،

برادرم محمد علی صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا، ان کا خط مجھے راہ سے ملا تھا، ان کو نیز سید حسین صاحب و محمد حیات صاحب کو سلام مسنون فرما دیجئے، فقیر محمد عبدالباری یکم اپریل ۱۹۲۰ء

از مولانا سید سلیمان ندوی

بنام نواب سید امیر حسن خاں[1]

لندن ۲۴ مارچ ۱۹۲۰ء عزیز مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مورخہ ۲۶ فروری یہاں ۱۸ مارچ کو ملا آپ لکھتے ہیں کہ اب تک ہمارے

---

[1] امیر حسن صاحب نواب علی حسن خان ابن نواب صدیق حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلماء کے صاحبزادے تھے۔

جامعہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے، اس کا نام مجلس تعلیم ملی ہو، یا کوئی اور نام! فرض کیجئے تبدیلِ عنوان
اس کے ارکان وہ لوگ ہوں جو یا تو جامعہ میں کچھ قربانی کرکے درس کا کام کریں یا اپنا وقت
یا روپیہ دے کر اس کی مدد کریں، بس اس کے آگے اور کچھ نہیں،

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، سعید نے اب تک میرے خط کا جواب نہیں دیا، مجھے
سخت انتظار ہے، سید صاحب کی اس تمام معاملے کے متعلق کیا رائے ہے، اُن کی خدمت میں میرا سلام
پہنچا دیجئے، نجیب صاحب، ریاست صاحب اور معین صاحب کی خدمت میں آداب، مولوی عبدالسلام صاحبؒ
کی خدمت میں بھی

کلب تو آپ جاتے ہی ہوں گے، حاضرین کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے، بشرطیکہ
کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ پھر چندہ مانگنے آرہا ہے، یہ خیال شاید امیر جامعہ کے کسی عزیز کو آجائے
خدا مغفرت کرے خوب شخص تھے، والسلام

نیاز مند ذاکر حسین ۱۹۲۸ء

(۶)

از مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

مکرمی دام مجدہم! السلام علیکم،

۴ر مارچ کا لکھا ہوا خط پہنچا تفصیلی واقعات معلوم ہوئے، یہاں ملاقات کی حالت
بذریعہ پریس شائع ہوتی ہے، اس پر لوگوں کو اعتبار نہیں ہے تاہم اس سے نفس واقعہ کا علم
ہوجاتا ہے، کاش اس کو بھی مفصل تحریر فرمادیں، یہاں حالات متغیر ہونے کے بجائے عوام میں

تحریک ہے، مگر اعلیٰ طبقہ اسی طرح ساکن ہے، .... صرف نواب رامپور نے رجعت قہقری کی ہے، فاروق علی اور ارشاد علی صاحبان جو اعزہ کرمی شوکت علی صاحب کے ہیں، قید کر دئے گئے ہیں، اور ابھی تک ان کی رہائی نہیں ہوئی ہے، عوام کا جوش نواب صاحب کے خلاف بڑھ رہا ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے،

اس وقت ہم لوگ ایک دستور العمل بنا رہے ہیں، کہ تمام تحریکیں جلسہ ہائے خلافت کی کس طرح عمل میں لائی جاویں، ہندو بھی شرکت کو تیار ہیں، ہم لوگ اخبارات سے سخت مایوس ہیں، ایک اور وفد کی تجویز ہو رہی ہے کہ جلد آپ لوگوں کی تائید کی غرض سے بھیجا جاوے اور ارادہ ہے کہ سمرنا میں بھی روپیہ لے کر جلد کسی معتبر وفد کے ذریعہ سے بھیجا جائے روپیہ وصول ہو گیا ہے، یہ بھی قصد ہے کہ ایک وفد ممالک اسلامیہ میں جاوے میں اور حکیم اجمل خاں تیار ہیں، کہ شام اور حجاز وغیرہ کے وفد میں خود جاویں، اور بھی فضلاء آمادہ معلوم ہوتے ہیں

آپ کے جوابات غیر کافی سمجھے گئے ہیں، مولوی ابو الکلام صاحب کا خط وتار بہت تردد آمیز آیا ہے جس کی تفصیل ارسال ہے،

برادرم محمد علی صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا، ان کا خط مجھے راہ سے ملا تھا، ان کو نیز سید حسین صاحب و محمد حیات صاحب کو سلام مسنون فرما دیجئے، فقیر محمد عبد الباری یکم اپریل ۱۹۲۰ء

از مولانا سید سلیمان ندویؒ

بنام نواب سید امیر حسن خاںؒ[1]

لندن ۲۴ مارچ ۱۹۲۰ء عزیز مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مورخہ ۲۶ فروری یہاں ۱۸ مارچ کو ملا آپ لکھتے ہیں کہ اب تک ہمارے

---

[1] امیر حسن صاحب نواب علی حسن خان ابن نواب صدیق حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلماء کے صاحبزادے تھے۔

پہونچنے کی اطلاع ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی، کیونکہ ہوتی جس دن آپ خط لکھ
رہے تھے عین اسی دن ہمارا جہاز دوبار انگلستان میں لنگر انداز ہوا،

ممبران ہاؤس آف لارڈس اور ہاؤس آف کامنس سے ملاقاتیں ہوئیں، یہ سب کچھ
ہوا مگر اصل مقصود کا پتہ نہیں، کوئی ہمارے نقطۂ نظر سے واقعات پر نظر ڈالنے کے لئے آمادہ
نہیں، ہندوستان میں یورپ کی بےتعصبی کی داستانیں بہت سنا کرتے تھے، مگر یہاں آکر
وہ عقیدہ بدعقیدگی سے بدل گیا، یہاں کے مشرقی ارباب علم کی بےتعصبی اور مشرق پرستی
کی بڑی دھوم تھی، وہ بھی دہل تھی ثابت ہوئی، پروفیسر مارگولیوتھ مصنف لائف آف محمد
ترکوں کے سب سے بڑے علمی دشمن ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ مصنف پریچنگ آف اسلام سابق پروفیسر
علی گڑھ کالج جن کی تعریف سے ہمارے استاد مولانا شبلی نہیں تھکتے تھے، وہ بخاری کے حوالہ
سے ثابت کرتے ہیں کہ سلطان خلیفہ نہیں،

غرض یہاں کے وزراء کو تو بہرحال پیام پہونچ گیا، وزیر ہند کی ملاقات کا حال
آپ پڑھ چکے ہیں، اب وزیراعظم کی ملاقات کا حال پڑھئے گا، ہمارے سوال اور اُن کے جواب
میں وہی نسبت ہے جو آسمان اور ریسمان میں، بھئی اصل چیز طاقت ہے، یورپ اسی کو مانتا ہے،

آج کل یہاں ایکوتھ اور لائڈ جارج صاحب کی کشتی کی بڑی گرم بازاری ہے،
لائڈ جارج صاحب سوشلزم یا اس کے ہیبتناک لفظ بولشوزم سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک برل
قائم کرنا چاہتے ہیں، مسٹر اسکوتھ اس کے مخالف ہیں،

ووکنگ مشن کو دیکھا انگریز و ہیم نومسلموں سے ملاقات ہوئی، لندن میں ہر جمعہ کو اور
ووکنگ میں اتوار کو اجتماع ہوتا ہے، کام کی صداقت میں کلام نہیں، مگر اس سے زیادہ
اور محنت درکار ہے، ایک دو دفعہ میں نے بھی نماز پڑھائی،

جناب نواب[1] صاحب قبلہ کی خدمت میں سلام مسنون، اچھے[2] صاحب کہاں ہیں، پتہ کو کمپنی کا رہے، والسلام،

از خواجہ عبدالواجد ندویؒ

بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ

کانپور انتظامی پریس ۳؍ جنوری ۱۵ء

سیدی وسندی

امید ہے کہ آپ پونا میں ہوں گے،[3] ادھر مولوی مسعود صاحب کانپور آئے تھے، اور مجھ کو لکھنؤ لے گئے، اثنائے سفر و نیز لکھنؤ کی صحبتوں میں مولانا مرحوم کے مشن کے متعلق مفصل حالات معلوم ہوئے، نہیں کہہ سکتا کہ کس قدر مسرت اور تسلی ہوئی، یہ صحیح ہے کہ مولانا مرحوم اپنی بیش بہا تصانیف کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے، لیکن یہ حیات سرمدی مکمل اسی وقت ہو سکتی ہے، جبکہ ان کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچے، خداے تعالیٰ ہم لوگوں کے ارادوں میں استقلال اور اسباب حالات میں توفیق و سازگاری عنایت فرمائے۔

سیرت شبلی کے متعلق مولوی حبیب الرحمن صاحب کی رائے سے مجھے کلی اتفاق ہے، بلکہ میں اس میں اس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے عام چندہ بھی نہ ہونا چاہئے، مگر یہ فرمائیے کہ آپ نے لکھنا بھی شروع کیا،

مولانا کی تصویر ضرور ہونا چاہئے مگر الہلال میں جو شائع ہوئی ہے یہ عمدہ نہیں سنا تھا کہ اس تصویر کا عکس لینے کی کوشش کرنے والے تھے جو عطیہ فیضی کے شوہر نے بنائی ہے، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی،

"خواجہ عبدالواجد"

---

[1] نواب سید علی حسن خاں مرحوم، [2] اچھے صاحب کا نام رشید الدین تھا، یہ نواب میر حسن صاحب کے ماموں تھے

[3] یہ خط اس زمانے کا ہے کہ مولانا شبلی کا انتقال ہو چکا ہے، اور دار المصنفین قائم ہو رہا ہے، سید صاحب ابھی دکن کالج میں تھے، مولانا مسعود علی ندوی اعظم گڈھ آ گئے تھے، خواجہ صاحب کے پاس کانپور، پریس کے متعلق مشورہ کرنے گئے تھے،

پہونچنے کی اطلاع ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی، کیونکہ ہوتی جس دن آپ خط لکھ رہے تھے ٹھیک اسی دن ہمارا جہاز دوبار انگلستان میں لنگرانداز ہوا،

ممبران ہاؤس آف لارڈس اور ہاؤس آف کامنس سے ملاقاتیں ہوئیں، یہ سب کچھ ہوا مگر اصل مقصود کا پتہ نہیں، کوئی ہمارے نقطۂ نظر سے واقعات پر نظر ڈالنے کے لئے آزاد نہیں، ہندوستان میں یورپ کی بے تعصبی کی داستانیں بہت سنا کرتے تھے، مگر یہاں آکر وہ عقیدہ بدعقیدگی سے بدل گیا، یہاں کے مشرقی ارباب علم کی بے تعصبی اور مشرق پرستی کی بڑی دھوم تھی، وہ بھی دہل تہی ثابت ہوئی، پروفیسر مارگولیوتھ مصنف لائف آف محمد ترکوں کے سب سے بڑے عملی دشمن ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ مصنف پریچنگ آف اسلام سابق پروفیسر علی گڑھ کالج جن کی تعریف سے ہمارے استاد مولانا شبلی نہیں تھکتے تھے، وہ بخاری کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں کہ سلطان خلیفہ نہیں،

غرض یہاں کے وزراء کو تو بہر حال پیام پہونچ گیا، وزیر ہند کی ملاقات کا حال آپ پڑھ چکے ہیں، اب وزیر اعظم کی ملاقات کا حال پڑھئے گا، ہمارے سوال اور اُن کے جواب میں وہی نسبت ہے جو آسمان اور ریسمان میں، یہی اصل چیز طاقت ہے، یورپ اسی کو مانتا ہے

آج کل یہاں اسکوتھ اور لائڈ جارج صاحب کی کشتی کی بڑی گرم بازاری ہے، لائڈ جارج صاحب سوشلزم یا اس کے ہیبتناک لفظ بولشوزم سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک لبرل جماعت قائم کرنا چاہتے ہیں، مسٹر اسکوتھ اس کے مخالف ہیں،

ووکنگ مشن کو دیکھا انگریز وہیم نومسلموں سے ملاقات ہوئی، لندن میں ہر جمعہ کو اور ووکنگ میں اتوار کو اجتماع ہوتا ہے، کام کی صداقت میں کلام نہیں، مگر اس سے زیادہ روپیہ اور محنت درکار ہے، ایک دو دفعہ میں نے بھی نماز پڑھائی،

جناب نواب[1] صاحب قبلہ کی خدمت میں سلام مسنون، اچھے[2] صاحب کہاں ہیں، پتہ کو ک کمپنی کا رہو۔ والسلام

از خواجہ عبدالواجد ندوی

بنام مولانا سید سلیمان ندوی

کانپور انتظامی پریس ۳ر جنوری ۱۵ء

سیدی و سندی

امید ہے کہ آپ پونا میں ہوں گے[3]، ادھر مولوی مسعود صاحب کانپور آئے تھے، اور مجھ کو لکھنؤ لے گئے، اثنائے سفر و نیز لکھنؤ کی صحبتوں میں مولانا مرحوم کے مشن کے متعلق مفصل حالات معلوم ہوئے، نہیں کہہ سکتا کہ کس قدر مسرت اور تسلی ہوئی، یہ صحیح ہے کہ مولانا مرحوم اپنی بیش بہا تصانیف کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے، لیکن یہ حیات سرمدی مکمل اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ان کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچے، خدائے تعالیٰ ہم لوگوں کے ارادوں میں استقلال، اور اسباب حالات میں توفیق و سازگاری عنایت فرمائے۔

سیرت شبلی کے متعلق مولوی حبیب الرحمن صاحب کی رائے سے مجھے بھی اتفاق ہے، بلکہ میں اس میں اس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے عام چندہ بھی نہ ہونا چاہئے، مگر یہ فرمایئے کہ آپ نے لکھنا بھی شروع کیا،

مولانا کی تصویر ضرور ہونا چاہئے مگر الہلال میں جو شائع ہوئی ہے، وہ عمدہ نہیں سنا تھا کہ اس تصویر کا عکس لینے کی کوشش کرنے والے تھے جو عطیہ فیضی کے شوہر نے بنائی ہے، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی،

"خواجہ عبدالواجد"

---

[1] نواب سید علی حسن خاں مرحوم، [2] اچھے صاحب کا نام رشید الدین تھا، یہ نواب میر حسن صاحب کے ماموں تھے

[3] یہ خط اس زمانے کا ہے کہ مولانا شبلی کا انتقال ہو چکا ہے، اور دار المصنفین قائم ہو رہا ہے، سید صاحب ابھی دکن کالج میں تھے، مولانا مسعود علی ندوی اعظم گڈھ آ گئے تھے، خواجہ صاحب کے پاس کانپور، پریس کے متعلق مشورہ کرنے گئے تھے،

وفیات

احمد زکی

از محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق تحقیق دارالمصنفین اعظم گڈھ،

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کا دور ایک عالمگیر بیداری، تجدید اور ذہنی علمی تہذیب و تشقیف کا دور ہے، تقریباً ہر زندہ قوم و زبان پر بدلے ہوئے حالات کا اثر پڑا اور کچھ ایسی شخصیتیں سامنے آگئیں جو نئے رجحانات اور جدید تقاضوں سے باخبر بھی تھیں اور ان کی اہمیت و ضرورت کی معترف بھی، عالم عرب جو عرصے سے سیاسی تخلف، اور معاشرتی اضطراب و بے چینی سے دوچار تھا، دوسروں کی بہ نسبت ان حالات سے جلد متاثر ہوا، عربی ادب جو زمانے سے جمود و تعطل کا شکار تھا، اس دور میں اس نے کئی ایسے نامور ادیبوں کو جنم دیا جنھوں نے نہ صرف یہ کہ عربی ادب کو نئی روح، اس کے قالب کو نئی جان اور اس کے چہرے کو نئی رونق بخشی، بلکہ ان کی بالغ نظری، جدت طرازی اور دوربینی نے دوسروں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرلی، اور ان کے خیالات کی بازگشت دور دور سنائی دینے لگی، شیخ محمد عبدہ، علامہ رشید رضا، امیر شکیب ارسلان، مصطفی لطفی منفلوطی، مصطفیٰ صادق الرافعی معروف الرصافی خلیل مطران، کرد علی، عباس محمود عقاد، احمد امین حسن زیات جیسے نامور مفکروں اور ادیبوں سے یہ عہد جدید مالامال ہوگیا، ان میں سے ہر شخص زبان و ادب فکر و نظر اسلوب و انداز اور گہرائی و گیرائی کے لحاظ سے منفرد و ممتاز حیثیت کا حامل ہے،

انھی ناموروں کی صف میں احمد زکی کا بھی شمار ہوتا ہے، جن کا ابھی گذشتہ سال انتقال ہوا ہے اور جنھوں نے اپنے سائنس آمیز مقالات و تصانیف کی وجہ سے عربی ادب میں ایسا مرتبہ حاصل کر لیا ہے جو محترم بھی ہے اور باوقار بھی،

اصلاً وہ سائنس کے عالم تھے، ان کی تعلیم کا بیشتر حصہ سائنسی علوم کی تحصیل میں صرف ہوا، سنہ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے لنڈن یونیورسٹی سے سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور پھر چند ہی برسوں کے بعد فلسفہ میں بھی لیورپول یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر لیا، اس طرح وہ سائنس و فلسفہ دونوں میں اعزازی نمبروں کے ساتھ سندیں لے کر اپنے وطن مصر واپس آئے، اور پھر طویل عرصہ تک درس و تدریس کی زندگی میں لکچرر سے لے کر پروفیسر، ڈین اور پرنسپل تک کے عہدوں پر کام کرتے رہے، اس اثنا میں وہ مصر کے اعلیٰ سائنسی اداروں کے مشیر، شریک اور سربراہ کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے، سنہ ۱۹۵۴ء میں سرکاری عہدوں سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ مکمل طور سے سائنسی و علمی بحث و تحقیق میں لگ گئے، اس طرح انھوں نے سائنس اور ادب کے بہترین امتزاج کی ایک مثال قائم کر دی، مشہور عربی محقق ڈاکٹر عدنان خطیب نے لکھا ہے "احمد زکی ایسے اچھے سائنسداں تھے، جنھوں نے لوگوں کو سائنس کے احترام پر مجبور کر دیا، ایسے صاحب فکر تھے جو قارئین کو اپنے نقطۂ نظر سے متاثر کر دیتے، ادیب اس درجہ کے کہ اپنا ایک اسلوب رکھتے تھے، اس کے ساتھ کمال یہ تھا کہ اپنے علم و فکر کو صحیح، سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی بے مثل قدرت رکھتے تھے، احمد زکی کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دقیق و پیچیدہ سائنسی مسائل اور مشکل ترین معانی و مطالب کو ایسے صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی، ان کے یہاں علم کے وزن کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے، "قصہ کروب" اور "قصہ الکیمیا" ان کی

ایسی ہی کتابیں ہیں جن میں قاری تجسس اور کھوج کی بھول بھلیوں میں بڑے اطمینان کے ساتھ ان کے ساتھ چلتا ہوا منزل تک جا پہونچتا ہے۔" مع اللہ فی السماء" "مع اللہ فی الارض" "وحدۃ اللہ ستراہ فی وحدۃ خلقہ اور قدرۃ اللہ ستراہ فی بدیع صنعہ" جیسے سلسلہ مضامین ان کی ہمہ وقت نظری کثرت مطالعہ اور وسیع ثقافتی ذہن کے آئینہ دار ہیں، پیچیدہ ترین موضوع کو آسان الفاظ اور واضح ترکیبوں سے سلجھا دینے کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کی زندہ جاوید کتاب "فی سبیل موسوعۃ علمیہ" کا مطالعہ کیجئے،

انھوں نے مصر کے اعلیٰ علمی ادارہ" لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر" کے ایک ممتاز رکن کی حیثیت سے کئی کتابوں کو عربی قالب عطا کیا، مختلف اعلیٰ علمی مباحثوں میں شریک ہوئے اور ملک کے چوٹی کے مجلوں میں بلند پایہ مضامین لکھے، ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:
(۱) سلطۃ علمیہ (۲) بین المسرع والقراءۃ (۳) ما رجعت ادغادۃ الکیمیا (۴) قصہ المکروب (۵) قصہ الکیمیا (۶) جان دارک (۷) واقف حاسم فی تاریخ العلم (۸) مع اللہ فی السماء (۹) فی سبیل موسوعۃ علمیہ (۱۰) مع اللہ فی الارض، وہ صاحب طرز ادیب تو تھے ہی اس کے ساتھ نئے الفاظ جدید اصطلاحات اور انوکھی ترکیبیں بھی بے تکلف استعمال کرتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے تھے۔" العلم وراء السواد بین الناس" جو جیمز کونانٹ کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے اسکے مقدمہ میں انھوں نے اپنے مسلک کی وضاحت بڑی جرأت کے ساتھ کی ہے، وہ لکھتے ہیں" رہی بات ترجمہ کی تو میں نے اس میں آزادی و آزاد روی کا مسلک اختیار کیا ہے، اور نفع وافادہ کو ترجیح دی ہے، ایسی کتاب کے لئے جو سائنسی مضامین پر مشتمل ہو الفاظ کی نئی ساخت اور جدت واختراع ضروری ہے، چنانچہ میں بھی اس بدعت کا مرتکب ہوا ہوں، ہاں انگریزی سے مانوس وواقف قارئین

کے لئے قوسین میں اصل انگریزی الفاظ بھی لکھ دیتے ہیں، یہ کتابیں صرف اپنی جدت اسلوب کے لحاظ سے ہی ممتاز نہیں، بلکہ احمد زکی کی تعلیقات اور ان کے گہرے علم سے لبریز حاشیوں کی وجہ سے بڑی قیمتی اور بلند پایہ ہو گئی ہیں، یہ حاشیے فروعی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں، مگر مولف کے مسلک اور اس کی ماخذ و قبول تے اصول کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں، عنوانوں کے انتخاب میں بھی ان کا ایک خاص ذوق ہے، "موافقت عاصمہ فی تاریخ العلم" اسی ذوق کا آئینہ دار ہے،

وہ ۱۹۳۲ء میں عالم عرب کی ممتاز ترین علمی اکیڈمی المجمع العلمی دمشق کے ممبر منتخب ہوئے اسی اکیڈمی کے ایک اجلاس میں جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا مشہور ادیب احمد امین نے کہا تھا "احمد ایک نامور ماہر کیمیا اور ایک بلند پایہ ادیب ہیں، انھوں نے سائنس اور ادب کو باہم شیر و شکر کر دیا ہے، حق یہ ہے کہ وہ سائنسدانوں میں ادیب اور ادیبوں میں سائنسداں ہیں، کبھی لیبوریٹری میں نلکیوں اور محلولوں میں سر کھپا رہے ہیں اور کبھی اپنے کتب خانہ میں الفاظ کی تحلیل و تجزیہ میں مشغول کسی اصطلاح کو عربی رنگ دیتے اور اپنے نتیجۂ تحقیق کو ادبی جامہ پہناتے نظر آتے ہیں" قدیم سے اختلاف کے باوجود وہ افراط و تفریط کا شکار کبھی نہ ہوئے، بلکہ ان کے اور کارناموں کے ساتھ یہ کارنامہ بھی یاد رکھا جائیگا کہ نشر و اشاعت کے ذرائع میں انھوں نے سختی کے ساتھ عربی قواعد اور صحیح عربی اسلوب کے اختیار پر زور دیا، خبروں کی نشریات میں خاص طور سے انھوں نے غیر فصیح الفاظ کے استعمال پر روک لگوائی،

احمد زکی عربی صحافت سے تقریباً ہمیشہ وابستہ رہے، ایک زمانہ میں وہ "الرسالہ" اور "الثقافہ" جیسے بلند ادبی رسالوں کی مجلس ادارت میں شریک اور "الہلال" کے اڈیٹر

رہے، لیکن صحیح معنوں میں ان کے سائنس آمیز ادبی شہ پاروں و شہ کاروں کو پیش کرنے کا فخر عالم عربی کے مشہور رسالہ "العربی" کو حاصل ہوا، یہ رسالہ جو آج ۴ لاکھ سے بھی زیادہ تعد میں ہر ماہ شائع ہوکر تمام عالم عرب میں پھیل جاتا ہے، احمد زکی کی ادارتی صلاحیتوں اور ا کی اعلیٰ قابلیتوں کا حسین ترین نمونہ ہے، کویت کا ملک جب نیا نیا قائم ہوا تو اس کی حکومت نے ایک ایسے رسالہ کے اجراء کی تحریک کی جو باوجود اختلاف بلاد عربیہ کے ہر حلقہ میں قبول حاصل کر سکے اور جس کا واحد مشن عربی زبان کی تحسین و تزئین اور ترویج و اشاعت ہو ا ایسا رسالہ جو قدیم اقدار کے ساتھ جدید علوم و نظریات کا بھی حامل ہو، اعلیٰ مقاصد حامل اس رسالہ کے لئے کسی ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے احمد ز سے بڑھ کر اس وقت کون سی ایسی شخصیت تھی چنانچہ حکومت کویت کی نظر انتخاب ا پڑی اور پھر "العربی" اور احمد زکی گویا ایک جان دو قالب ہو گئے ایک کے بغیر دوسرے کا تصور مشکل تھا، احمد زکی نے دسمبر ۱۹۵۸ء میں العربی کے پہلے اداریہ میں جس نے بعد میں "عزیزی الق کے عنوان سے ایک دوامی شکل اختیار کرلی لکھا تھا "ہم نے اس رسالہ کا نام العربی رکھا ہے وطن عزیز کے ہر شخص کے ذہنی افق پر ابھرتے ہوئے نئے معانی و مطالب اور قلب کی گہرائی میں جنم لیتی ہوئی آرزوں اور تمناؤں کو واقعی اور حقیقی انداز میں پیش کرنے کے لئے اس سے مختصر اور مکمل لفظ اور کون ہو سکتا ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا تھا "العربی خالص عربی فکر ترجمان ہے، وہ وسیع معنی میں جہل کے برعکس علم کا مرادف ہے، وہ مرض کے خلاف کا رفیق ہے، وہ فقر کا دشمن اور ثروت و غنا کا دوست ہے، وہ ایسے پرخلوص عمل کا داعی جس میں اعلیٰ تعلیم، وسیع ثقافت اور سچی لگن کی روح کارفرما ہو تب ہی یہ عمل ا خوش حال و باوقار زندگی عطا کر سکے گا، عمل انسانی معاشرہ کا حق ہے، جسے وہ ا

ہر فرد سے طلب کرتا ہے، تعطل دبے عملی قانون فطرت ہی کے نہیں قانون حیات کے بھی خلاف ہے،" عربی دنیا کے مخصوص حالات کے پیش نظر العربی نے اپنے صفحات کو سیاست و عقائد کے مباحث سے پاک رکھا، لیکن احمد زکی استعماری اور استبدادی قوتوں کی ریشہ دوانیوں سے ہمیشہ اپنے قارئین کو باخبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے، عربوں کی شکست کے عوامل کا وہ تجزیاتی مطالعہ کرتے، اور اظہار رائے میں کبھی کسی ملامت یا خوف کا خیال نہ کرتے

العربی بدستور اپنے انداز پر قائم اور اپنی راہ پر گامزن رہا، ۲۰۴ شماروں کے بعد نومبر ۱۹۷۵ء کا شمارہ وہ آخری شمارہ تھا، جس میں احمد زکی نے اپنا آخری مقالہ سپرد تحریر کیا اور جس کا عنوان عربوں کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر بڑا ہی معنی خیز تھا، عنوان تھا، لوگ کہتے ہیں رحم و الفت، دوستی اور محبت تو پرانی باتیں ہو چکیں، اب مصلحت سب پر مقدم ہے، کیسی زبون خیالی ہے" العربی کے دو سو چار رسالوں میں ہر جگہ احمد زکی اپنے وجود کا احساس دلاتے رہے "عزیزی القاری" کے علاوہ نہ جانے کتنی نازک بحثوں اہم معاملوں اور زندہ عنوانوں پر انھوں نے اظہار خیال کیا، ان کے انتقال سے عربی زبان اپنے ایک بہت بڑے خادم سے محروم ہو گئی، جو ہمہ وقت اس کے لئے سینہ سپر رہا کرتا، اور ایک خوبصورت جدید انداز میں عربی کے حسن کو نکھارنے کی کوشش کیا کرتا تھا

لہ مضمون بالا کے واقعات و سنین ڈاکٹر عدنان خطیب کے ایک مضمون سے ماخوذ ہیں، جو المجمع العلمی العربی دمشق کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے،

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر سلام سندیلوی گورکھپور یونیورسٹی

بدلا ہوا کچھ اب کی گلشن کا نظارا ہے
پھولوں نے محبت سے کانٹوں کو پکارا ہے

افسانہ در افسانہ، ہر شے کا نظارا ہے
شبنم ہے کہ موتی ہے، موتی ہے کہ تارا ہے

کچھ کم نہیں گلشن سے، سیر دل خوں گشتہ
وہ باغ تمہارا تھا، یہ باغ ہمارا ہے

از روئے تحفظ تو، کانٹے کہیں بہتر ہیں
مانا کہ گلستاں کو، پھولوں نے سنوارا ہے

دل جوں ہی ادھر ٹوٹا، غنچہ بھی ادھر چٹکا
میں نے بھی صدا دی ہے، اس نے بھی پکارا ہے

بیگانہ سہی سبزہ، لیکن ہے گلستاں میں
گلشن کی زبوں حالی، کب اس کو گوارا ہے

اے غنچہ و گل رہنا، ہشیار ہواؤں سے
نرگس کا گلستاں میں، کچھ اور اشارا ہے

ہوگی نہ سلام اپنی، بجلی سے کبھی سازش
یہ پھول ہمارے ہیں، یہ باغ ہمارا ہے

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر صاحب بجنوری

حقیقت سے جو خالی ہوں وہ افسانے نہیں ہوتے
جنوں سے ہوں جو نامحرم وہ دیوانے نہیں ہوتے

دلوں کو جیت لیتی ہے محبت کی ہمہ گیری
محبت ہو تو بیگانے بھی بیگانے نہیں ہوتے

ترے قدموں میں عالم کی بہاریں رقص کرتی ہیں
جہاں تیرے قدم ہوتے ہیں ویرانے نہیں ہوتے

محبت میں گداز دل ہے پہلی شرط اے ہمدم
جنھیں جلنا نہیں آتا وہ پروانے نہیں ہوتے

جنوں کچھ اور ہے، دیوانگی کچھ اور ہے جوہر
سبھی اہل جنوں در اصل دیوانے نہیں ہوتے

مطبوعات جدیدہ

عمدۃ اللبیب شرح شیم الحبیب (عربی) از۔ مولوی محمد نیاز صاحب میواتی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۲۰۰ قیمت عہ پتہ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم نوح پلہ، گوڑگاؤں، ہریانہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ کی طرح آپ کی سیرت و اخلاق، طور طریقے، طبعی امور اور آپ کی زندگی کا ہر پہلو مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے، اسی لئے علماء نے شمائل نبوی پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، ان میں امام ترمذی کی شمائل جو سب سے پہلے لکھی گئی تھی، زیادہ مشہور و مقبول ہے، شیم الحبیب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جو تحریک تبلیغ و دعوت کے رہنما مولانا محمد الیاسؒ اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے ایک خاندانی بزرگ وجید عالم مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م ۱۲۴۵ھ) کی تالیف ہے، مفتی صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے نامور شاگرد تھے، اس میں زیادہ روایتیں شمائل ترمذی اور شفا قاضی عیاض سے جمع کی گئی ہیں، اس طرح یہ مختصر رسالہ آنحضور صلعم کے حلیۂ مبارک، اخلاق و معمولات، عادات و خصائل، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، لباس و طعام اور ساز و سامان وغیرہ کا مرقع ہے، مولوی نیاز محمد صاحب نے اسکو مع شرح شائع کیا ہے، شرح میں مشکل الفاظ اور جملوں کی تشریح اور بعض مطالب کی توضیح کی گئی ہے، شروع میں مصنف و شارح کے حالات بھی درج ہیں۔

معاشرتی مسائل۔ مرتبہ۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و

وطباعت عمدہ صفحات ۲۲۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۰ روپے پتہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ

اسلام کے معاشرتی مسائل میں نکاح، طلاق اور وراثت سے متعلق بعض قوانین کو تجدد پسندوں نے عرصہ سے اعتراضات کا نشانہ بنا رکھا ہے، اور ان میں اصلاح و ترمیم کا مطالبہ کر رہے ہیں، زیر نظر کتاب میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاذ حدیث مولانا برہان الدین نے معترضین کے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے اور ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کو واضح کیا ہے، انھوں نے ان مسائل کے متعلق تفصیل سے اسلامی تعلیمات بیان کی ہیں، اور ان کے حکم و مصالح کی تشریح کی ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے نکاح کے اسلامی طریقہ کا دوسرے مذاہب سے موازنہ کر کے اسکی برتری و فوقیت ثابت کی ہے، آخر میں مسلم پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کے ایک پرزور حامی جناب آصف علی فیضی کے ایک مضمون پر نظر ڈال کر ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، ممکن ہے کہیں کہیں مصنف کا طنز آمیز انداز علمی متانت کے خلاف سمجھا جائے لیکن یہ کتاب بڑی مدلل ہے، اور محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے۔ شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے۔

حیات سید اشرف جہانگیر سمنانی۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی استاد شعبۂ فارسی و اردو مہاراجہ سیا جی راؤ یونیورسٹی بڑودہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۰ روپے پتہ مولانا سید قدیر احمد کچھوچھہ ضلع فیض آباد (۲) جی آر لال اکھاڑہ یاقوت پورہ، بڑودہ،

یہ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کی سوانحعمری ہے جس کو ان کے خانوادہ کے ایک صاحب قلم ڈاکٹر سید وحید اشرف نے تلاش و محنت سے مرتب کیا ہے

تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے سمنان کی مختصر تاریخ اور اس کے متعلق جغرافیائی معلومات تحریر یے گئے ہیں، پھر حضرت سید اشرف کے خاندان اور سمنان میں قیام کے زمانہ کے ابتدائی حالات یان کئے گئے ہیں اور ان کی پیدائش اور سنہ وفات کی تحقیق کی گئی ہے نیز سمنان سے ہندوستان نے اور بنگال میں شیخ علاء الدین کی خدمت میں حاضری وبیعت اور شیخ کے ایما سے مستقل قیام کے ارادے سے کچھوچھہ میں تشریف آوری اور ہندوستان کے مختلف علاقوں اور عالم اسلام کی سیاحت اور ہر جگہ کے علماء ومشائخ سے ملاقات کا ذکر ہے۔ ایک باب میں ان معاصر علماء صوفیا کا ذکر ہے جن سے حضرت جہانگیر کا افادہ واستفادہ کا تعلق رہا ہے۔ ایک اور باب میں ن کے امراء وسلاطین سے تعلقات کا ذکر ہے، اس میں یہ بھی دکھایا ہے کہ وہ بعض دوسرے شائخ کے طرز عمل کے برعکس کیوں ان لوگوں سے روابط رکھنے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے، آخر میں شیخ کے زہد وعبادت، اخلاق وعادات، ان کی تصنیفات اور وفات کے زمانہ کے بعض واقعات کا تذکرہ ہے، مصنف سید صاحب ہی کے خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں اس لیے ظاہر ہے یہ سوانحعمری عقیدت سے لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بڑی حد تک مورخانہ طرز قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان ہی روایتوں کو نقل کیا ہے، جو ان کے خیال میں علمی وتحقیقی حیثیت سے درست معلوم ہوئی ہیں، اس کتاب میں سید صاحب کے واقعات وحالات زندگی بیان کرنے ہی پر اکتفا کیا گیا ہے، ان کے خلفاء اور تعلیمات پر ایک اور جلد لکھیں گے سید صاحب کے واقعات کے ضمن میں اس زمانہ کے بعض اہم واقعات کا ذکر بھی آگیا ہے، بابا رتن قطعاً صحابی نہ تھے، محدثین نے اس قسم کی تمام روایات کی تردید کردی ہے اسکے باوجود اس میں تامل کی کیا وجہ ہے؟ ص ۵۰ پر میزان الاعتدال اور تجرید اسماء الصحابہ کو حافظ ابن حجر کی تصنیف بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ علامہ ذہبی کی کتابیں ہیں، لیکن ان معمولی فروگذاشتوں کے باوجود کتاب اپنی ایک حیثیت رکھتی ہے، اور مصنف کی محنت قابل تحسین ہے۔

اقبالی مجرم؛ مرتبہ جناب شورش کاشمیری کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، متوسط تقطیع، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ۸۰ میکلوڈ روڈ، لاہور، (پاکستان)

آغا شورش کاشمیری مرحوم علامہ اقبال کے پرستار اور ان کے افکار و خیالات کے پرجوش مبلغ تھے، اس لیے اقبال کے نکتہ چین اور غلط ترجمان اُن کے قلم کا خاص نشانہ تھے، اس کتاب میں انھوں نے اقبال سے متعلق عبدالمجید سالک کی ذکر اقبال کے ان حصوں کی تردید کی ہے جن میں اقبال کو قادیانیت کے معاملہ میں نرم ثابت کیا گیا ہے، پھر عابد علی عابد مرحوم کی شعر اقبال کے بعض مندرجات کی تردید کرکے بتایا ہے کہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کا اصل سرچشمہ قرآنی تعلیمات تھیں، آخر میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی فکر اقبال کا تجزیہ کرکے یہ لکھا ہے کہ خلیفہ صاحب نے فکر اقبال کے بنیادی عناصر کو نظرانداز کرکے اقبال کے طائر فکر کو پابجولاں کر دینے کی کوشش کی ہے، شروع میں اقبال سے متعلق پاکستانی مطبوعات اور وہاں ان کے نام پر قائم کئے گئے اداروں کے اقبال کے افکار و نظریات کو توڑ موڑ کر شائع کرنے پر آہ و فغاں کی ہے، اور ان کو صحیح خطوط پر کام کرنے کا مشورہ دیا ہے،

مثنوی زہر عشق ۔ مرتبہ ۔ جناب امیر حسن نورانی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۸۰ قیمت، عام اڈیشن عہ پیسے خاص اڈیشن ۱؎ پتہ مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دہلی۔

اردو کی جن مثنویوں کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی ان میں ایک نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہر عشق بھی ہے جو اپنی سادگی و سلاست، حلاوت و روانی، سوز و گداز اور روزمرہ اور محاوروں کی صفائی کے لحاظ سے بے مثال خیال کی جاتی ہے، یہ متعدد بار چھپ چکی ہے اور اسکی خصوصیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے عرصہ سے کمیاب تھی، اس لیے لائق مرتب نے اسکو مختلف مطبوعہ اور قلمی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ میں شوق کے حالات، شاعری اور صنف مثنوی پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد زہر عشق کے زمانۂ تصنیف کی تعیین اس کے اہم مطبوعہ نسخوں، مآخذ، قصہ و کردار اور خصوصیات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے مقدمہ میں کہیں کہیں شوق اور انکی مثنویوں کے بارہ میں بعض غلط بیانات کی تردید بھی کی گئی ہے۔

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱- مہاجرین جلد دوم قیمت: ۱۲-۹

۲- سیر الصحابہ جلد ۶ " ۹-۴

امام حسین کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں واقعۂ محزنۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳- سیر الصحابہ جلد ۷،

۴- تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،
قیمت: ۱۲-۵۰

۵- تاریخ اسلام اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ)
قیمت: ۱۲-۵۰

۶- تاریخ اسلام دوم (خلافتِ بنی امیہ) ۱۱-۰۰

۷- تاریخ اسلام سوم (خلافتِ عباسیہ اول)
قیمت: ۱۴-۰۰

۸- تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)
قیمت: ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت ۱۵-۶۵

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،
قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت: ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۴-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیاتِ سلیمان یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشاء اور تحقیق کے لحاظ سے حیاتِ شبلی کا مثنیٰ، دلکش، دلچسپ قابلِ مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۲۷-۵۰

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف۔ علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مستشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور اُن کی نگرانی میں دار المصنفین کے رفقاء محققین نے اُن کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

۱۹۳۴ء، ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۱ء

۱۹۷۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

١١٩ (3)

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ ستمبر ۱۹۷۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ ۱۵ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

بکثرت اضافوں کے ساتھ دو کتابوں کے نئے اڈیشن

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

اس جلد میں شروع کے تین مغل بادشاہ بابر، ہمایوں، اور اکبر کے علمی ذوق اور اُن میں سے ہر ایک کے دربار سے متوسّل علماء، فضلاء، شعراء کا تذکرہ اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، بعد کی جلدوں میں جو زیرِ ترتیب ہیں، بعد کے مغل سلاطین اور اُن کے عہد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوگا،

قیمت:۔ ۱۴-۲۵

بزمِ صوفیہ

تیموری عہد سے پہلے کے تمام ممتاز صاحبِ تصانیف صوفیۂ کرام، مشائخ عظام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ اجمیری، بختیار کاکی، قاضی ناگوری، نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات تعلیمات وملفوظات جس میں آٹھویں صدی کے مشہور شیخ طریقت عبدالحق نوشہ رودولوی کے حالات کا مستقل اضافہ ہے،

قیمت:۔ ۱۶-۲۵

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۱۸ ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ عدد ۳

مضامین

شذرات

دارالمصنفین اور معارف کے حلقہ میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کا نام محتاجِ تعارف نہیں، وہ معارف کی مجلس ادارت کے رکن اور دارالمصنفین کی مینیجنگ کمیٹی کے ممبر تھے، رفیق کی حیثیت سے بھی کئی سال تک یہاں رہ چکے تھے، اور تصنیف و تالیف کے علاوہ سیرۃ النبی کی نظرِ ثانی میں بھی انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ہاتھ بٹایا تھا، سید صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں اُن کی صلاحیت کا اندازہ کر لیا تھا، تعلیم سے فراغت کے کچھ ہی عرصہ بعد اُن کو دارالمصنفین لے آئے، تصنیف و تالیف کے علاوہ وہ اُن کی درسی لیاقت کے بھی معترف تھے، قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق انھیں شروع ہی سے تھا، سید صاحب کی صحبت میں یہ ذوق اور بڑھا، یوں تو سبھی اہم تفسیریں نظر سے گذریں تھیں لیکن ابن جریر اور ابن کثیر سے زیادہ دلچسپی تھی علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے تو عاشق تھے، اُن کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے، اسی گرویدگی کا اثر تھا کہ مختلف کتابوں سے اُن کے تفسیری بیانات چن کر ایک ضخیم کتاب تیار کر دی، اُن کی یہ کوشش ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، اب تک کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں،

علمی انہماک کے ساتھ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کا بھی بڑا خیال تھا، اُن کا خاندان شریعت و طریقت کی جامعیت میں ممتاز تھا، اُن کے پردادا مولانا عبد العلی حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی کے سلسلہ سے وابستہ تھے، دادا مولانا محمد ادریس بھی ایک بڑے عالم اور شیخِ طریقت تھے، وہ مولانا عبد الحئی فرنگی محلی مولانا عبد الحق حقانی، اور قاری عبد الرحمٰن پانی پتی کے شاگرد اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے، والد ماجد مولانا محمد انیس بھی پوری زندگی ارشاد و ہدایت میں مصروف رہے، اس خاندان کی بدولت

اودھ کے بہت سے علاقوں میں کتاب و سنت کی روشنی پہنچی، دیہات کی بہت سی برادریاں جو شرک و بدعت اور غیر شرعی رسوم میں مبتلا تھیں اُن کے ذریعہ راہ راست پر آئیں، مولانا محمد ادریس کو تعلیمی و تصنیفی مشاغل کی وجہ سے دیہاتی حلقوں میں دورہ کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا لیکن بایں ہمہ بزرگوں کی یہ روایت منقطع نہیں ہونے پائی،

دارالمصنفین کے زمانۂ قیام میں، ندوہ کو اُن کی ضرورت محسوس ہوئی، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ندوہ کے بھی معتمد تھے، چنانچہ اُن کے مشورہ سے وہ وہاں چلے گئے، اور قرآن مجید کی تعلیم اُن کے سپرد ہوئی، خدا داد مناسبت کے علاوہ سید صاحب کی رہنمائی میں وہ اس موضوع پر کافی تیاری کرچکے تھے، اس لئے اُن کا درس بہت مقبول ہوا، طلبہ کے علاوہ لکھنؤ کے تعلیم یافتہ اصحاب نے بھی استفادہ کی خواہش کی، اور سید صدیق حسن صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر درس ہونے لگا، یہ سلسلہ جب تک بیماری نے مجبور نہیں کردیا، برابر جاری رہا، اُن کو قلبی تکلیف کئی سال سے تھی لیکن شروع میں اس کا احساس نہیں ہوا لیکن جب تکلیف بڑھی، تو علاج شروع ہوا، اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی لیکن تقدیر کے سامنے کوئی تدبیر نہ چل سکی، بالآخر وقت موعود آپہونچا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اُن کے مراتب بلند فرمائے، اور پسماندگان کو توفیق عطا فرمائے کہ اُن کے نقشِ قدم کو دلیلِ راہ بنائیں،

قرآن مجید کے ترجمے بہت ہوئے، اور ہورہے ہیں لیکن شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ اور تفسیری فوائد (موضح القرآن) کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوسکی، سوڈیڑھ سو برس میں اردو کا اسلوب بہت بدل گیا ہے لیکن شاہ صاحب کا ترجمہ اب بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا ہے لیکن افسوس ہے کہ اہلِ مطابع نے کتابت و طباعت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی، جس کی وجہ سے اغلاط میں اضافہ ہوتا رہا، اس صورتِ حال کو مولانا اخلاق حسین قاسمی نے محسوس کیا، اور بڑی محنت سے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ وہ اس کی

اشاعت کا انتظام کر رہے ہیں، امید ہے کہ صاحبانِ استطاعت اس کارِ خیر میں اُن کی مدد کرکے دنیا میں سرخروئی اور آخرت میں اجرِ عظیم حاصل کریں گے،

ہر سال عربی اور فارسی کے ممتاز عالموں کو صدر جمہوریۂ ہند اعزاز عطا کرتے ہیں، گزشتہ سال پٹنہ کے پروفیسر سید حسن صاحب کو یہ اعزاز عطا ہوا تھا اور امسال وہیں کے پروفیسر اقبال حسین اور شاہ عز الدین ندوی پھلواروی کو یہ اعزاز ملا ہے، پروفیسر سید حسن صاحب دار المصنفین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں، اُن کے علمی کارنامے ہندوستان ہی نہیں بیرونِ ہند کے اصحابِ علم سے بھی خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، شاہ عز الدین ندوی بھی دار المصنفین کے قدر دان اور اس کے کارکنوں سے مخلصانہ تعلقات رکھتے ہیں، انھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، علوم اسلامیہ کے ساتھ عربی ادب سے خاص ذوق رکھتے ہیں، طالب علمی ہی کے زمانہ میں عربی تحریر و تقریر میں انھیں امتیاز حاصل تھا، والزہرا جیسے بلند پایہ مصری رسالہ میں ان کا تحقیقی مضمون شائع ہوا تھا، بعد کو دار العلوم ندوۃ العلماء، مدرسہ شمس الہدیٰ اور اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ پٹنہ میں انھوں نے عربی زبان اور اسلامی علوم کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، پروفیسر اقبال حسین کی علمی اور تعلیمی خدمات بھی اہل علم کے حلقہ میں بنظرِ تحسین دیکھی جاتی ہیں، ہم ان سب اصحاب کو مبارکباد دیتے ہیں،

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو شروع ہی سے جامعہ میں ایک عالی شان مسجد کی تعمیر کا خیال تھا لیکن نامساعد حالات کی بنا پر عرصہ تک یہ خیال عمل کا قالب اختیار نہ کر سکا، ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے دوستوں نے اُن کی آرزو کو بر لانے کی کوشش کی، تعمیر مسجد کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے سکریٹری سعید انصاری صاحب مقرر ہوئے حیدرآباد کے مشہور آرکیٹیکٹ فیاض الدین صاحب نے نقشہ بنایا اور مشکلات کے باوجود انھوں نے چند سال میں وسیع اور خوبصورت عمارت تعمیر کرا دی جسے دیکھ کر لوگ قصر الحمرا اور جامع قرطبہ کو یاد کرنے لگے[1]، اللہ سے دعا ہے کہ اس مسجد کی آبادی کا بھی شایانِ شان انتظام فرما دے، تاکہ حسنِ ظاہر پر حسنِ باطن کا اضافہ نورٌ علیٰ نور ہو جائے،

---

[1] ملاحظہ ہو اسٹیٹسمین ۲ جون ۱۹۷۲ء مضمون الفرڈ جے ایڈون (ALFRED.J.EDWIN)

مقالات

افغانستان میں آٹھ روز

از جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ

شیخ الاسلام خواجہ ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری ہروی جنھیں لوگ پیر ہرات، اور پیر انصار بھی کہتے ہیں، قرن پنجم ہجری کے نامور ترین علمائے دین صوفیائے کرام اور عرفائے عظام میں شمار ہوتے ہیں، اُن کی شخصیت کے چند در چند پہلو ہیں، وہ محدث و مفسر بھی ہیں اور شیخ طریقت و رہبر شریعت بھی، وہ ادیب سخنور بھی ہیں، اور روحانی پیشوا بھی، انھوں نے ابوسعید ابی الخیر میہنوی اور ابوالحسن خرقانی جیسے عارفان بزرگ سے اکتساب فیض کیا تھا، اور خود ان کے حلقۂ رشد و ہدایت میں ابوالحسن باخرزی اور ابوالقاسم زوزنی ایسے علما شامل تھے، خواجہ عبداللہ حنبلی مسلک کے پیرو تھے، اور اہل بدعت کے سخت ترین مخالف، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ حدیث و تفسیر کی تدریس و تفہیم اور معتزلیوں، اشعریوں اور متکلمین کے خلاف معارضہ و مبارزہ میں گزرا، اسی وجہ سے انھیں اپنی زندگی میں بڑی مصیبتیں سہنی پڑیں، انکا زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا پر آشوب تھا اگرچہ پیر ہرات نے اپنے کو سیاست سے برکنار

رکھا، لیکن عقائد میں سخت گیری اور تعصب کی بنا پر ان کے مخالفین برابر اُن کے خلاف سازشیں کرتے رہے، اور تہمت لگا کر دو بار انھیں ہرات سے تبعید اور ایک بار قید پابزنجیر کرانے میں کامیاب ہو گئے، اگرچہ وطن سے دوری اور قید و بند کی مدت میں بہت ہی مختصر رہی۔

خواجہ عبد اللہ کی ولادت ہرات میں ۲ شعبان ۳۹۶ھ (۱۰۰۶ء) کو ہوئی تھی اور وفات ۲۲ ذی الحجہ ۴۸۱ھ کو۔ انکے والد خواجہ ابو منصور بھی ہرات کے رہنے والے تھے، اُن کا سلسلۂ نسب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور و معروف صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، خواجہ عبد اللہ نے سلطان محمود غزنوی سے لیکر سلجوقی فرمانروا ملک شاہ تک کا زمانہ دیکھا تھا، اُن کے علم و فضل کے پیش نظر خلیفۂ عباسی مقتدی باللہ نے انھیں ۱۰۸۱ء میں شیخ الاسلام، کا لقب عطا کیا۔

پیر انصار نے کئی مقتدر تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، جن میں زیادہ تر ملفوظات کی حیثیت رکھتی ہیں، باین معنی کہ وہ منبر سے جو تقریر کرتے اسے ان کے شاگرد اور مرید تحریر کر لیتے تھے۔ آثار پیر ہرات میں مناجات سب سے زیادہ مشہور رہے، لیکن اُن کی سب سے اہم تالیفات کشف الاسرار و عدۃ الابرار، منازل السائرین، اور طبقات الصوفیہ ہیں، اول الذکر قرآن کریم کی تفسیر ہے، جسے اُن کے شاگرد ابو الفضل رشید الدین المیبدی نے املا اور توسیع کرکے مرتب کیا، منازل السائرین میں ان سو منزلوں کی تشریح کی گئی ہے جو سالک طریقت کو طے کرنی ہوتی ہیں، طبقات الصوفیہ سلمی کی ہمنام کتاب کا املا باضافہ ہے، یہ املا ہرات کی مقامی زبان میں تھا، اسے جامی نے فارسی میں ترجمہ کیا اور اسی بنیاد پر اپنی مشہور کتاب "نفحات الانس" مرتب کی۔

۱۹۶۲ء میں خواجہ عبد اللہ کی وفات کی صد سالہ برسی افغانستان میں منائی گئی تھی ایک یادگار تقریب میں شیخ الاسلام کے احوال و آثار کے متعلق افغانستان اور بعض دوسرے

ں کے اسکالروں نے گرانقدر مقالے پڑھے تھے۔ امسال یعنی ۱۳۹۶ھ میں افغانستان
وزارت اطلاعات وکلتور (کلچر۔ ثقافت) کی طرف سے پیر ہرات کے ہزار ویں
سال تولد کی مناسبت سے ایک یادگاری جشن منعقد کیا گیا جس میں شرکت کے لیے
ختلف ملکوں کے نمایندوں کو دعوت دی گئی تھی۔ ثقافتی روابط کے بھارتی کونسل (انڈین
کونسل فار کلچرل ریلیشنز) نے گزشتہ ماہ نومبر میں مجھے اپنا نمایندہ بنانے کی پیشکش کی تھی جسے
میں نے بڑی مسرت اور شکریے کے ساتھ منظور کر لیا تھا۔ سیر و سیاحت کا شوق مجھے ہمیشہ
آمادہ بسفر رکھتا ہے، کسی غیر ملک کی سیاحت کا موقع اگر مل جائے تو اسے ہاتھ سے جانے نہیں
دیتا، پھر افغانستان کی سیر کا خیال ہی ولولہ انگیز تھا کیونکہ اس قدیم ملک سے ہمارا بڑا
گہرا سیاسی، تہذیبی اور ادبی رشتہ ہے خصوصاً فارسی زبان و ادب کا تو یہ ملک گہوارہ
رہا ہے۔ فارسی پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہوگی کہ
انھیں ایران، افغانستان اور ترکستان کی سیر و سیاحت کا موقع میسر ہو۔ میں نے ایران کو
دو بار دیکھا ہے اب افغانستان دیکھنے کی باری آئی تھی۔

کابل میں شیخ الاسلام پیر انصار کی ہزارویں سالگرہ وولادت کی تقریب کی تاریخیں
۲۰ اپریل سے ۲۴ مئی تک مقرر کی گئی تھیں۔ بیرونی ممالک کے نمایندوں کو یہ مشورہ دیا گیا
تھا کہ وہ ۲۰ اپریل تک کابل پہنچ جائیں، اسی اعتبار سے I.C.C.R کی سینیر پروگرام
آفیسر مسز اوشا ملک نے مجھے ہدایت دی تھی کہ میں ۲۰ اپریل کو دہلی سے کابل کے لیے
روانہ ہو جاؤں، لیکن عجب اتفاق کہ ۱۴ اپریل سے میں ایک اذیت ناک مرض ہرپیز
(Herpes) میں مبتلا ہو گیا، جس میں بائیں سینے اور بازو پر آبلہ نما دانے نکل آتے ہیں
اور ان میں بڑی سوزش ہوتی ہے، میں نے علاج کی طرف فوری توجہ کی اسکے باوجود

مرض کی شدت کم ہوتے ہوتے دس دن لگ گئے، جلد اتنی ذکی الحس ہو گئی کہ باریک سے باریک کپڑا ابھی پہننا محال تھا، اسی اثنا میں ۲۰ اپریل کو I.C.C.R. والوں نے پٹنہ سے دہلی اور دہلی سے کابل تک کی رفت و آمد کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ، اور سرکاری پاسپورٹ مع ویزا اور پندرہ پونڈ کے زر مبادلہ کے لیے ریزرو بنک کا اجازت نامہ بھیج دیا اور یہ ہدایت کی کہ میں ۲۴ اپریل کو دہلی پہنچ جاؤں تاکہ وہاں سے ۲۵ کو کابل کے لیے پرواز کر سکوں، میں نے اپنی بیماری کا حال لکھ کر اُن سے یہ درخواست کی کہ میں پٹنہ سے ۲۸ کو اور دہلی سے کابل کے لیے ۲۹ کو روانہ ہو سکتا ہوں، انھوں نے میرے پروگرام کی اس تبدیلی کو پسند نہیں کیا، اور ۲۶ اپریل کو بذریعہ فون اطلاع دی کہ آج دہلی آجاؤ ورنہ یہ سفر ملتوی کرنا پڑے گا، ۲۷ اپریل کی صبح کو میں نے بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھا کر پروگرام کی تبدیلی پر راضی کر لیا اور اسی دن بذریعہ طیارہ دہلی کو پرواز کیا، پٹنہ سے دہلی کا سفر ہوائی جہاز سے دو گھنٹے کا ہے، کیونکہ راستے میں طیارہ لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر نصف ساعت کے لیے توقف کرتا ہے، اور وہاں سے بھی مسافر سوار ہوتے ہیں، ہم پانچ بجے بعد عصر دہلی پہنچ گئے۔

دوسرے دن میں نے مسٹر ادشا ملک سے ملاقات کر کے اپنے آنے اور کابل کے سفر کے واسطے تیار رہنے کی اطلاع دی، انھوں نے آریانا افغان ایرلائنس والوں سے فون پر گفتگو کر کے میرے لیے ۲۹ اپریل کی پرواز میں ایک سیٹ محفوظ کرالی چنانچہ ۲۹ کو میں شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر محمد ادریس کے ساتھ ایک بجے پالم ایرپورٹ پہنچ گیا، کیونکہ کابل کے لیے طیارہ ساڑھے تین بجے سہ پہر کو پرواز کرنے والا تھا، دہلی شہر میں زر مبادلہ حاصل کرنے میں دہلی کالج کے ڈاکٹر محمد یوسف نے بڑی مدد کی،

پالم ایرپورٹ پر ڈاکٹر محمد ادریس کی وجہ سے اسباب وزن کرانے اور فاضل تین پونڈ زرمبادلہ حاصل کرنے میں خاصی آسانی ہوئی لیکن افغانی طیارہ تین گھنٹے تاخیر سے آیا اس لیے ہمیں اس کے انتظار کی خاصی زحمت برداشت کرنا پڑی، ادریس صاحب پانچ بجے تک میرے ساتھ رہے، اس کے بعد میں نے انھیں اور زیادہ تکلیف دینا پسند نہیں کیا اور رخصت کر دیا کسٹمس اور سیکوریٹی چیکنگ کے بعد سب مسافر لانج میں چلے آئے اور یہاں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہمیں طیارہ کی پرواز تک بیٹھنا پڑا، آخر سات بجے شام کے قریب ہمیں طیارہ میں سوار ہونے کی ہدایت ملی اور ہم سوار ہو کر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے، طیارہ میں کوئی سوا سو مسافر ہوں گے، ان میں سے متعدد ایران اور انگلستان جانے والے تھے، آریانا افغان ایرلائنس کے کرایے کی شرح دوسری ہوائی کمپنیوں کی بہ نسبت قدرے کم ہے اس لیے بعض مسافر لندن جانے کے لئے افغانی طیارے سے سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، ہمارے طیارے نے ساڑھے سات بجے پرواز کی میری سیٹ کے دونوں پہلوؤں پر دو نوجوان تھے، ایک تہران جا رہا تھا دوسرا کابل کو، یہ دونوں سکھ تھے۔ ہوائی جہاز میں شراب نسبۃً سستی ملتی ہے، کیونکہ یہاں ڈیوٹی نہیں لگتی ہے، دونوں نوجوانوں نے شراب کی ایک ایک بوتل خریدلی اور جام پر جام چڑھانا شروع کر دیا میری جان بڑی ضیق میں تھی، رات ہو چکی تھی، کھڑکی سے جھانک کر فضا کے تغیرات کو دیکھنا بھی ممکن نہ تھا خدا خدا کر کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کابل شہر کی روشنیاں دکھائی دیں اور یہ اعلان کیا گیا کہ جہاز کابل کے ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے، طیارہ سے اترنے کے وقت میں نے سویٹر پہن لیا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ کابل میں ابھی سردی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اور اس وقت باہر میدان میں سرد ہوا چل رہی ہے، اب مجھے یہ فکر دامنگیر تھی کہ معلوم نہیں ہوائی اڈے پر

کوئی میری مدد کو آیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں آیا تو اجنبی جگہ میں رات کے وقت کہاں مارا مارا پھروں گا، مسٹر ادشا ملک نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ہندوستانی سفارت خانے کو میرے سفرِ کابل کے متعلق تار سے اطلاع دے دی گئی ہے، لیکن تار وقت پر پہنچا یا نہیں اس کا یقین نہیں تھا، اسی تردد میں ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہوا، دروازے ہی پر ایک شخص نے بڑھ کر مجھ سے سوال کیا آپ پروفیسر سید حسن ہیں؟ میں نے ہاں کہا تو انھوں نے اپنا تعارف کرایا، یہ تھے ہندوستانی سفارت خانے کے کلچرل اتاشی جناب عزالدین عثمانی۔ انھوں نے ایک افغانی جوان عورت سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ خانم شیریں تاج ہیں جو شعبۂ تشریفات کی جانب سے آپ کی مہماندار ہیں، اور اس وقت آپ کو ساتھ لے کر ہوٹل انٹرکونٹی نینٹل، جائیں گی جہاں آپ کی اقامت کا انتظام ہے، اور جہاں اسوقت وزیر اطلاعات وکلتور (کلچر) افغانستان کی طرف سے مہمانوں کو ڈنر دیا جا رہا ہے، آپ کا وہاں انتظار ہو رہا ہے۔ خانم شیریں تاج نے میرا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات سفر لے کر میرا اسباب ڈھونڈ کر نکالا، پھر کسٹمس کے معاملات طے کیے،

اس کے بعد ہم تینوں ایک کار میں (جو خاص میری آمد و رفت کے لیے مقرر کردی گئی تھی) بیٹھ کر ہوٹل انٹرکونٹی ننٹل پہنچے۔ مجھے تیسری منزل پر کمرہ ملا تھا، اس کمرے میں پہنچ کر میں نے جلد جلد لباس تبدیل کیا، اور پھر نیچے آگیا، عثمانی صاحب اور شیریں تاج دونوں میرے انتظار میں تھے، میں دونوں کے ساتھ ہوٹل کے ڈائنس ہال میں گیا، جہاں ڈنر ہو رہا تھا، اس وقت ہندوستانی گھڑی کے مطابق رات کے دس بجے تھے، لیکن افغانستان کا وقت ہندوستانی وقت سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے، یعنی یہاں نو کا وقت ہو رہا تھا۔ ڈنر تقریباً ختم ہو چکا تھا، عثمانی صاحب نے وہاں مجھے کئی

مہمانوں سے ملایا، جن میں کچھ تو ہمارے سفارت خانے کے کارمند تھے، کچھ افغانی اور کچھ باہر سے آئے ہوئے اسکالر۔ یہاں ڈاکٹر فتح اللہ مجتبائی بھی موجود تھے، جو ہندوستان میں ایرانی رایزن فرہنگی یعنی کلچرل کاؤنسلر ہیں یہ مجھ سے دو دن پہلے ہی دہلی سے آگئے تھے۔ ڈاکٹر حسین خدیوجم بھی ملے، جو کابل میں ایرانی کلچرل کاؤنسلر اور ایک مہینہ قبل ہندوستان آتے تھے، ان سے پٹنہ میں خدابخش لائبریری میں ملاقات ہوئی تھی، وہ امام غزالی کی تالیفات کے متعلق تحقیقات میں مشغول ہیں، اور اسی سلسلے میں پٹنہ آئے تھے، افغانستان کے مشہور و معروف محقق رضا مائل ہروی سے بھی ملاقات ہوگئی، جو چار سال قبل تحقیقی کام سے پٹنہ آئے تھے، اور چند دن میرے مہمان رہے تھے، خانم شیریں تاج مجھے اس کمرے میں لے گئیں، جہاں کھانا چنا ہوا تھا، اور اصرار کیا کہ میں کچھ کھاؤں، لیکن مجھے بھوک نہیں تھی، اس لیے کہ طیارہ میں ہمیں کھانے کو مل چکا تھا، ان کے اصرار سے میں نے تھوڑے سے چاول اور کچھ آلو کی ترکاری کھائی اگرچہ کھانے کو بہت سی چیزیں موجود تھیں، لیکن میں انھیں پہچانتا نہ تھا، پھر میں اس میز پر آکر بیٹھ گیا جہاں ڈاکٹر مجتبائی بیٹھے تھے، اب افغانستانی موسیقی کا پروگرام شروع ہوا، ہال کے ایک طرف چبوترہ سا بنا ہوا تھا، اس پر آٹھ دس سازندے کرسیوں پر افغانی لباس پہنے آکر بیٹھے ان کے ہاتھوں میں سارنگی، ستار، طبلہ، بانسری، ڈھول کے قسم کے آلات موسیقی تھے، پھر بغل کے کمرے سے ایک مغنیہ نکل کر ڈائس پر آگئی، اس نے ایک ہاتھ میں مائکروفون کا سرا لے لیا، اور گانا شروع کیا، سازندوں نے بھی اپنے ساز پر اس کا ساتھ دیا، لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مغنیہ کا نام مہوش ہے، اور یہ افغانستان کی مشہور گانے والی ہے، اس نے تقریباً آدھ گھنٹے تک پشتو

اور فارسی غزلیں گائیں، اس کے بعد ایک دوسری مغنیہ آئی جس کا نام فسانہ تھا، اس نے بھی نصف ساعت تک گانے سنائے پھر تیسری گانے والی آئی جس کا نام تھا رخسانہ اور اس کے بعد قمر گل نے غزلیں سنائیں بیچ میں ایک نوجوان مرد نے بھی کچھ گانے سنائے اس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں، گانے کا یہ پروگرام تقریباً دو گھنٹے تک چلتا رہا، اس کے بعد سب مہمان رخصت ہونے لگے میں بھی ہال سے نکل کر باہر آیا، عثمانی صاحب اور شیریں تاج دونوں رخصت ہوئے، چلتے وقت شیریں تاج یہ کہہ گئیں کہ میں کل صبح ۹ بجے تیار ہو کر نیچے ہوٹل کے لانج میں آ جاؤں، وہ کار لے کر آئیں گی اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گی۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور نماز عشا کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگا کمرے میں بستر لگی ہوئی دو مسہریاں تھیں، ایک پر لیٹ گیا، نیند تو جلد آ گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد سردی محسوس ہونے سے آنکھ کھل گئی، میں نے پائنتی رکھا ہوا کمبل اوڑھ لیا لیکن یہ کافی نہ ہوا، اور دوسرا کمبل بھی جو دوسری مسہری پر تھا اسے بھی ملا کر اوڑھنا پڑا دوسری صبح کو میں نے کمرے اور ہوٹل کے ارد گرد کا جائزہ لینا شروع کیا، اس میں ضروری سامان یعنی میزوں کرسیوں، کپڑا رکھنے کی الماری کے علاوہ صابن، تولیہ، خط لکھنے کا کاغذ، لفافے، نوٹ بک، ریڈیو اور ٹیلیفون موجود تھے، اس کمرے کی وضع قطع اور فرنیچر تقریباً اسی طرح کے تھے، جو میں نے ایران کے ہوٹل آریا شیراتون میں دیکھے تھے، جہاں میں ۱۹۷۳ء میں ابوریحان البیرونی کی ہزارویں سالگرہ کے جشن میں شرکت کرنے کے موقع پر ٹھہرا تھا، صرف ایک چیز کم تھی یعنی ٹیلیویژن تہران کے ہوٹل میں ٹیلیویژن بھی موجود تھا، کمرے کے ایک طرف شیشے کی دیوار تھی اس کے پردے کو ہٹا کر دیکھا تو سامنے نشیب میں چند عمارتیں نظر آئیں، اور کوئی آبادی

دکھائی نہیں دی، البتہ دور پہاڑوں کا سلسلہ تھا جن کی چوٹیاں برف آلود تھیں، اس میں یہ ہوٹل شہر سے باہر ایک بلند ٹیلے پر بنا ہوا ہے۔ یہاں سے جو سڑک نیچے کو جاتی ہے وہ عام شاہراہ سے مل جاتی ہے۔

ماحول کا جائزہ لینے کے بعد میں نے گھر کے لوگوں کو اپنے بخیریت کابل پہنچ جانے کی اطلاع دینے کو خط لکھ ڈالا اور اسے لیے ہوئے نیچے لانج میں آیا۔ دفتر پذیرائی سے یہ معلوم ہوا کہ ڈاک خانہ زمین دوز کمرے میں ہے، لیکن آج جمعہ کا دن ہے اس لیے تعطیل ہے، ایران کی طرح افغانستان میں بھی جمعہ کے دن تعطیل ہوتی ہے۔ اب چائے ناشتہ کی فکر ہوئی۔ میری مہماندار خانم شیریں تاج نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں بتائی تھی کہ صبح کی چائے کہاں ملے گی، وہ تو نو بجے آنے کو کہہ گئی تھیں، اور اس وقت صرف ساڑھے سات بجے تھے، آخر دفتر پذیرائی کے ملازم سے دریافت کرنا پڑا کہ چائے ناشتہ کہاں ملے گا، اس نے لفٹ کے قریب ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اس میں داخل ہوا تو اندر ایک بڑا ڈائننگ ہال دکھائی دیا، جس میں ہوٹل کے کئی یورپین مرد وعورت میزوں پر چائے نوشی میں مشغول تھے　　میں بھی ایک میز پر جا کر بیٹھ گیا، ہال کے ایک گوشے میں ناشتہ کی چیزیں، از قسم ٹوسٹ، روٹی، کیک، مکھن، پنیر وغیرہ رکھے تھے، لوگ خود وہاں جا کر حسب خواہش چیزیں لے کر میز پر چلے آتے تھے میں نے بھی یہی کیا، دو ٹوسٹ اور ایک کیک لے کر چلا آیا، ہوٹل کے بیرے نے مکھن اور مارملیڈ لا کر میرے سامنے رکھ دیا پھر چائے لے آیا، کھانے کے بعد بیرا بل لے کر آیا ایک سو بیس افغانی کی　　لکھی تھی، میں نے بل پر دستخط کر دیئے اب مجھے یہ فکر ہوئی کہ یہ رقم مجھے اپنی جیب سے دینا ہوگی یا ہمارے میزبان ادا کریں گے، بعد میں معلوم ہوا کہ مہمانوں کے

..... کھانے کے بل حکومت کی طرف سے ادا کیے جائیں گے لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ ناشتہ اور کھانے کے لیے کیا رقم مقرر کی گئی ہے، ایران میں جشن سالگرہ البیرونی کے موقع پر مہمانوں کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ ناشتہ کے واسطے چودہ تومان (=۱۲ روپئے) اور کھانے کے لیے ۳۴ تومان (= ۳۰ روپیہ) کی رقمیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ہوٹل کا مینو (کھانوں کی فہرست) دیکھ کر تنی رقموں کی چیزیں منگوا کر کھا سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ رقم کا اگر بل ہوا تو فاضل رقم جیب خاص سے ادا کرنا ہوگی، جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے کسی وقت بھی مقررہ رقم سے فاضل کی نہیں بلکہ اس سے بہت کم کی چیزیں کھائیں ناشتہ ختم کرنے کے بعد میں ہوٹل کے لانج میں آگیا اور یہاں بیٹھ کر خانم شیریں تاج کا انتظار کرنے لگا۔ لانج میں اور بھی کئی مہمان بیٹھے تھے، جن میں زیادہ تر یورپین یا امریکی تھے، اس ہوٹل کے مالک امریکی ہیں۔ اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس قسم کے ہوٹل دنیا کے اکثر بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ پونے نو بجے خانم تاج آگئیں اور ہم دونوں چھپے ہوئے پروگرام کے مطابق وزارت اطلاعات وکلتور کے کتاب خانے میں مخطوطات کی ایک نمائش دیکھنے چلے، نو بجتے بجتے ہم وہاں پہنچ گئے۔ اور بھی بہت سے مہمان آگئے تھے۔ یہاں افغانی اور بیرونی اسکالروں سے ملاقات ہوئی اور آپس میں تعارف ہوا، وزیر اطلاعات بھی موجود تھے۔ شروع میں کتاب خانہ کے ڈائرکٹر جناب صدیقی نے کتاب خانے کے انتظامی امور پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ یہاں چند ہزار مخطوطات موجود ہیں جن میں سے بعض بہت ہی نادر و نفیس ہیں پھر فرانس کے اسکالر، مسٹر بورکوٹی نے ریشمی فیتہ کاٹ کر نمائش کا افتتاح کیا چونکہ اس نمائش کا خواجہ عبداللہ انصاری کے ہزارویں سال ولادت کی مناسبت سے

نام کیا گیا تھا، اس لیے اس میں نمایاں مقام خواجہ کی تالیفات کو دیا گیا تھا، مناجات اور
ی نامہ کے متعدد نسخے تھے، جن میں بعض بہت ہی قدیم و نادر و نفیس تھے، قرآن پاک
، بھی کم از کم چدرہ مخطوطات تھے، جن میں سے ایک کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ وہ حضرت
ی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا اور ایک دوسرا حضرت حسنؓ کے دست مبارک کا
کھا ہوا ہے۔ کئی شعرائے فارسی کے دیوانوں کے بھی خطی نسخے نمائش میں رکھے گئے تھے
یک عمدہ و مذہب و مطلا بڑی تقطیع کا مخطوطہ کلیات مرزا عبد القادر بیدل کا بھی
کھا، جو ۱۲۸۲ — ۱۲۹۲ ہجری کا لکھا ہوا ہے، چونکہ وقت کم تھا، اور ایک دوسری
ائش کو بھی دیکھنے کا پروگرام تھا، اس لیے ان مخطوطات کو مفصل طور پر دیکھنے کا
وقع نہ ملا۔

اس کتب خانے سے ہم لوگ کابل ننداری، پہنچے جس کی عمارت کے طبقہ فوقانی
ں خواجہ ابو عبد اللہ انصاری کے احوال زندگانی سے متعلق تصویروں کی نمائش تھی، نمائش
کا افتتاح جناب غلام رسول یوسفی وکیل ریاست باختر آژانس نے کیا، اور تصویروں
ی تشریح ڈاکٹر عبد الغفور روان فرہادی نے کی، یہاں مہمانوں کو چائے بھی پلائی گئی۔
نمائشوں کے دیکھنے کا پروگرام بارہ بجے ختم ہوگیا، دوپہر کے کھانے کی دعوت
والی کابل یعنی کابل کے گورنر کی طرف سے باغ بالا کے رستوران میں ایک بجے
تھی، جس کو ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا، اس وقفے میں خانم تاج نے تجویز کیا کہ ہم شہر کے
بعض علاقوں کی سیر کر آئیں، چنانچہ کار میں بیٹھ کر ہم دونوں شہر کے بعض محلوں سے
گزرتے ہوئے پارک زرنگار میں پہنچے یہ پارک خاص شہر کے باہر واقع ہے، بہت ہی
پر فضا اور کشادہ ہے، یہاں عموماً اہل شہر دوپہر کو سیر کے لیے آتے ہیں، لیکن ہم نے

وہاں بہت کم آدمیوں کو پایا، اس پارک کے ایک کنارے بلندی پر امیر عبد الرحمان کا مقبرہ ہے، اور ایک خوبصورت مکان بھی ہے، تھوڑی دیر تک پارک میں گھومنے کے بعد ہم واپس ہوئے اور راستے میں کابل یونیورسٹی اور جمال الدین افغانی کی یادگار دیکھتے آئے جمعہ کی وجہ سے یونیورسٹی بند تھی اس لیے اندر جانے کا موقع نہ مل سکا، راہ میں کئی مسجدیں دیکھیں اور مسجد جامع کے پاس سے بھی گزرے، لیکن ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا تھا اسلیے مسجدوں میں سناٹا تھا، میری خواہش ہوئی کہ میں جمعہ کی نماز ادا کروں اور یہاں نماز پڑھنے والوں کی تعداد اور حالات کا اندازہ کروں، لیکن افسوس کہ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ہم باغ بالا میں ایک بجے پہنچ گئے، ارادہ یہ تھا کہ کھانے کے بعد فوراً کسی مسجد کو چلے چلیں گے، لیکن وہاں دیر تک کھانے کے انتظار میں بیٹھنا پڑا، معلوم نہیں کہ خانم تاج کہاں چلی گئیں کھانے میں دیر دیکھ کر کہیں کام سے چلی گئی ہوں گی یہ جگہ مسجدوں سے بہت دور بھی تھی پھر اجنبی شہر میں پیادہ نہ کوئی سواری اور نہ کوئی رہنما، مجبوراً مسجد جانے کا خیال ترک کر دینا پڑا۔

باغ بالا، جیساکہ نام سے ظاہر ہے ایک بلندی پر واقع ہے، پہلے یہاں امیر عبد الرحمٰن کا محل تھا، جہاں وہ گرمیاں گزارنے آتے تھے، اب اس عمارت میں ایک رستوران ہے یہاں سے نیچے کا منظر بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے، انگور کے باغات بھی ہیں لیکن ان دنوں اس پھل کا موسم نہ تھا، سب لوگ رستوران کے برآمدے میں دیر تک کھانے کے انتظار میں بیٹھے رہے، تقریباً دو بجے کے بعد کھانا شروع ہوا، ضیافت پر تکلف تھی، تین قسم کا پلاؤ، کشمش پلاؤ، مرغ پلاؤ، اور سادہ پلاؤ، مرغ کا گوشت گوسفند کے کئی قسم کے گوشت اور کباب، گوسفند کا بچہ پورا بھنا ہوا کھانے میں بہت ہی

نرم اور لذیذ۔ یہ افغانستان کی مشہور چیز ہے،

میٹھی چیزوں میں دو طرح کی پڈنگ تھی، سب سے آخر میں نارنگی اور پرتقال (یعنی مالٹا)، اس زمانے میں اور کوئی پھل از قسم سردا اور انگور دستیاب نہیں ہوتے، کھانا تقریباً تین بجے ختم ہوا اس کے بعد استالیف کو جانے کا پروگرام تھا، چنانچہ موٹروں کا ایک قافلہ ہوٹل سے نکل کر استالیف کی طرف روانہ ہوا، کابل سے باہر نکل کر ہم کچھ دور تک شاہراہ پر چلتے رہے پھر نسبتہً کمتر درجے کی سڑک پر ہو لیے، یہ سڑک نشیب و فراز طے کرتی اور پہاڑوں کا چکر کاٹتی تقریباً ایک گھنٹے میں بلندی پر بنی ہوئی ایک خوشنما عمارت کے پاس جاکر ختم ہو گئی۔ یہ استالیف کا مہمان خانہ تھا، استالیف کابل سے تقریباً پچاس کیلو میٹر اتر ایک چھوٹا سا قصبہ ہندوکش پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، اور عمدہ آب و ہوا، اور خوبصورت قدرتی مناظر کے لیے سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہے، یہاں شہنشاہ بابر نے ایک باغ لگوایا تھا، جو اب بھی موجود ہے، مہمان خانے کے صحن سے جو اونچی جگہ پر بنا ہوا ہے ہم نے چاروں طرف نگاہ ڈالی، واقعی یہ بہت ہی خوبصورت مقام ہے، سامنے برفیلی چوٹیوں والی پہاڑیاں ڈھلوان پر چنار اور سفیدار کے بلند و بالا اشجار، ان کے درمیان ایک جوئے نغمہ خواں رواں ہے، کناروں پر گل ارغوان کے خوشنما اور نازک پودے، مجھے تو اب معلوم ہوا کہ چھوٹے پیمانے پر کشمیر کا مشہور مقام پہل گام ہے، ہم تھوڑی دیر تک اس پر فضا حسین منظر کو اپنی آنکھوں میں سموتے رہے، پھر مہمان خانے میں چائے کا دور چلا اتنے میں سرد ہوا چلنے لگی اور مجھے خاصی ٹھنڈک محسوس ہوئی، اور لوگوں کو بھی ہوا کی اس تبدیلی کا احساس ہوا اور ہم لوگ واپس چلنے کے لیے موٹروں میں سوار ہو گئے، استالیف کے بازار کو دیکھنے

پروگرام تھا۔ یہ بازار اگرچہ چھوٹا ہے مگر ایک قصبے کے لیے بہت ہی دلکش ہے، سڑک کے کنارے دو رویہ دکانیں ہیں جن میں مقامی دستکاری کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں، یہاں کی خاص صنعت مٹی کے برتنوں پر روغن چڑھانا ہے، چنانچہ روغنی برتنوں کی متعدد دکانیں ہیں، اس کے علاوہ چاندی کے بنے ہوئے زیورات، زری کے تاروں یا ریشمی تاگوں کے کام کئے ہوئے پوستین و پوستینچہ، ٹوپیاں اور عورتوں کے واسطے ہینڈ بیگ سے دکانیں سجی ہوئی تھیں، سیاحوں کے لیے سفر کی یادگار چیزوں کے خریدنے کی اچھی جگہ ہے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک دوکانوں کو دیکھ کر کابل واپس آچلے، راستے میں مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے بچے گل ارغوان اور گل لالہ کے گلدستے لیے کھڑے تھے ہم لوگوں کے ہاتھ بیچنا چاہتے تھے، ایک گلدستہ گل لالہ کا اس قدر دلفریب تھا کہ ہماری مہماندار نے اُسے خرید لیا،

ہم لوگ ساڑھے سات بجے کے قریب کابل لوٹے، رات کا کھانا تالار محمود طرزی کے ڈائننگ ہال میں تھا، محمود طرزی ہال، افغانستان کے مشہور قوم پرست رہنما محمود طرزی کے نام پر ہے، یہاں پریس کلب بھی ہے، اور کانفرنس روم بھی، کھانا تقریباً ساڑھے دس بجے رات کو ختم ہوا، اور سب لوگ اپنی جائے اقامت کو چلے گئے۔

دوسرے دن نو بجے سے سمنار شروع ہوا۔ سمنار کے جلسے تالار محمود طرزی کے کانفرنس ہال میں ہوتے تھے، اچھا خاصا بڑا ہال ہے، بیچ میں ڈائس ہے، اور اسکے سامنے اور دونوں پہلوؤں میں میزیں اور کرسیاں ہیں جو بیضاوی شکل میں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر میز پر مائکروفون اور آلۂ سماعت لگے ہوئے ہیں جس کو بولنا ہوتا ہے وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر مائک پر بولتا ہے، اگر کسی کی آواز دھیمی ہے تو کانوں پر

آلۂ سماعت لگا لینے سے اُس کی بات صاف سنائی دیتی ہے۔ سمنار کے اجلاس دو وقت ہوتے تھے، پہلا اجلاس ۹ بجے سے ایک بجے تک بیچ میں چائے نوشی کے لیے نیم ساعت کا وقفہ۔ ایک بجے سے ۲ ½ بجے تک دوپہر کا کھانا دوسرا اجلاس ۲ ½ بجے سے ۵ ½ بجے تک بیچ میں نصف ساعت کا وقفہ چائے نوشی کے لیے ہر جلسے کا صدر کسی بیرونی اسکالر کو منتخب کیا جاتا تھا۔ ایک افغانی اسکالر نائب صدر اور سکریٹری ایک افغانی جناب محمد آصف فکرت تھے۔ مقالہ کی زبان فارسی مقرر کی گئی تھی، ہر مقالہ کی سائکلو اسٹائل کاپیاں شرکائے جلسہ کو تقسیم کر دی جاتی تھیں، جو اسکالر فارسی میں مقالہ نہیں لکھ سکے تھے۔ ان کے مقالے کو بھی فارسی میں ترجمہ کر کے اس کی کاپیاں بانٹ دی جاتی تھیں، البتہ سویڈن کے ایک اسکالر ڈاکٹر بو اتاس نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا، اس کا فارسی ترجمہ بر وقت نہیں ہو سکا۔ ہر مقالے پر حاضرین اظہار رائے بھی کرتے تھے، بعض مرتبہ تو یہ اظہار رائے بحث کی شکل اختیار کر لیتا تھا، چنانچہ عراقی نمائندے ڈاکٹر عبد الامیر اعثم کے مقالے پر جو خواجہ عبد اللہ انصاری اور حنبلی عقائد کے متعلق تھا بڑی طویل بحث ہوئی۔ ہر جلسے میں پانچ یا چھ مقالے پڑھے گئے جن بیرونی اسکالروں نے اس سمنار میں حصہ لیا اُن کے نام یہ ہیں، رُوس سے ڈاکٹر اتعتینا گرسیمووا (یہ خاتون پشتو زبان کی ماہر ہیں) ایران سے ڈاکٹر جلال رضائی، ڈاکٹر حسین خدیوجم، ڈاکٹر فتح اللہ مجتبائی، ڈاکٹر خطیب رہبر، اور ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی عراق سے ڈاکٹر اعثم اور ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری، سویڈن سے ڈاکٹر بو اُتاس، امریکہ سے ڈاکٹر لاید کلفنٹن میلر، فرانس سے مسٹر بورکوئی اور پروفیسر روزی ارتالدٹ، افغانستان کے تقریباً تیس اسکالروں نے مقالہ خوانی میں حصہ لیا، جن میں سے جناب عبد الحی حبیبی

جناب عبدالوہاب محمود طرزی، استاد صالح پروندنا، استاد علی اصغر بشیر، جناب رضا مائل ہروی، جناب رحیم الہام، ڈاکٹر سید مخدوم رہین، ڈاکٹر روان فرہادی، ڈاکٹر امیر محمد اثیر، جناب عبداللہ خدمتگار، اور ڈاکٹر محمد یعقوب واحدی کے اسمائے گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہیں۔ سمنار میں جو مقالے پڑھے گیے ان میں سے بعض کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) علامہ انصاری۔ محیط فکری منابع و روش بحث وی در کتاب ذم الکلام (مقالہ نگار دکتر اکرم ضیاء العمری)

(۲) پایداری خواجہ عبداللہ انصاری در راہ عقیدہ (محمد علم غواص)

(۳) خداشناسی و خودشناسی در مناجات پیر ہرات (ڈاکٹر عبدالحکیم ضیائی)

(۴) عارفان مفسر قران کریم و مقام خواجہ انصاری در میان ایشان (پروفیسر غلام حسن مجددی)

(۵) پیام پیر ہرات بہ جہان امروز (پروفیسر ڈاکٹر بہاء الدین مجروح)

(۶) پیر ہرات در آثار امیر علی شیر نوائی (ڈاکٹر محمد یعقوب واحدی)

(۷) تاثیر آثار پیر ہرات بر آثار حضرت ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل (ڈاکٹر امیر محمد اثیر)

(۸) مردم شناخت پیر ہرات (رضا مایل ہروی)

(۹) خاندان پیر ہرات (استاد علی اصغر بشیر)

(۱۰) نثر مسجع در سخن پیر ہرات (ڈاکٹر ناصر الدین شاہ حسینی)

(۱۱) معنی توحید در تصوف پیر ہرات (پروفیسر روژہ آرنالدز)

(۱۰) شخصیت روحانی و خدمات عرفانی حضرت خواجہ انصاری (مولوی عبدالغنی علمی)

میں نے پڑھنے کے لائق اب تک کوئی مقالہ مرتب نہیں کیا تھا۔ اپریل کے شروع میں پروفیسر عبدالحی حبیبی کی ایڈٹ کردہ طبقات الصوفیہ اور رسائل مناجات و الہی نامہ کے مطالعہ سے ایک مقالے کا خاکہ تیار کر لیا تھا، اور ارادہ تھا کہ افغانستان روانہ ہونے سے پہلے پورا مقالہ مکمل کر لوں گا، لیکن میں ۱۴ اپریل سے بیمار ہوگیا جس کا تذکرہ اس مضمون کے شروع میں کر چکا ہوں، لہذا ایک غیر مکمل سا مضمون لکھ کر ساتھ لیتا آیا تھا، کابل پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سب لوگوں کو میرے مقالے سے دلچسپی ہے۔ افغانستان میں ہندوستان کے سفیر جناب کے آر پی سنگھ کی ملاقات کو گیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ میں کون سا مضمون کس زبان میں پڑھوں گا، جناب عثمانی صاحب نے بھی یہی سوال کیا، میری مہمان دار مس تاج بھی برابر یہی سوال کرتی تھیں، سمنار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فرہادی بھی بار بار مجھ سے پوچھتے تھے کہ میں اپنا مقالہ کب پڑھوں گا، اور اس کا کیا عنوان ہے، میں ہندوستان کا واحد نمائندہ تھا، اور مجھے اپنا اور اپنے ملک کا وقار قائم رکھنا تھا، اس لحاظ سے مجھ پر بڑی ذمہ داری تھی، میں نے ICCR والوں سے وعدہ بھی کیا تھا کہ میں مقالہ پڑھوں گا اس شرط کو بھی پورا کرنا تھا، آخر میں نے اپنا مقالہ مرتب و مکمل کر لیا، اور ڈاکٹر فرہادی کو بتا دیا کہ میں اجلاس کے تیسرے روز صبح کی نشست میں اپنا مقالہ پڑھوں گا جس کا عنوان ہے "سخنانی چند در بارۂ نفوذ و تاثیر افکار خواجہ عبداللہ انصاری" چنانچہ مقررہ نشست میں جس کی صدارت روسی نمایندہ ڈاکٹر الفتینا گرا سیمووا کر رہی تھیں مقالہ پڑھنے کے لیے میرا نام پکارا گیا اور میرے سامنے رکھے ہوئے مائکروفون میں روشنی ہوگئی، میں نے مقالہ پڑھنا شروع کیا اور تقریباً بارہ، پندرہ منٹ میں اسے ختم کر ڈالا، چند لمحے تک سناٹا سا رہا،

پھر جناب عبداللہ خدمت گار نے اظہار رائے کے لیے لب کشائی کی۔ مقالے پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اس کی تعریف کی اور اس میں بعض جو نئی باتیں تھیں ان کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی۔ کسی اور اسکالر نے میرے مقالے پر تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ اجلاس کے خاتمے پر جناب علی اصغر بشیر اور ڈاکٹر عبدالوہاب محمود طرزی مجھ سے ملنے آئے۔ مقدم الذکر نے مجھ سے خواجہ الطاف حسین حالی کے بارے میں مزید معلومات طلب کیں جنھیں میں نے خواجہ عبداللہ انصاری کی اولاد میں بتایا تھا۔ جناب طرزی نے حکیم ناصر خسرو کے متعلق حالی کے اس مقدمے کے بارے میں سوالات کیے جس کا میں نے مقالے میں حوالہ دیا تھا۔ ڈاکٹر فتح اللہ مجتبائی اور ڈاکٹر روان فرہادی نے میرے مقالے کی تعریف کی ہندوستانی سفارت خانے سے عثمانی صاحب آج مخصوص میرا مقالہ سننے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے بھی اظہار خوشی کیا کہ میرا مقالہ بہت اچھا تھا۔ ان لوگوں کے تعریف کرنے سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ میں ایک بڑی ذمہ داری سے بطور احسن عہدہ برآ ہوا۔ اجلاس برخاست ہونے سے قبل سارے شرکاے جلسہ نے مجھے اتفاق راے سے دوسری نشست کا صدر منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ سہ پہر کو جو اجلاس ہوا اس کی صدارت کے فرائض میں نے انجام دیے، اور یہ کام بھی بخوبی انجام پایا۔ اجلاس کے اختتام پر ڈاکٹر روان فرہادی نے کہا کہ آپ نے مقالہ بھی اچھا پڑھا اور صدارت بھی اچھی طرح کی۔

مئی کی چوتھی تاریخ کو ہم لوگوں کے ہرات جانے کا پروگرام تھا، کیونکہ وہ حضرت خواجہ انصاری کا مولد و مدفن ہے، اور اس تقریب کے موقع پر اس شہر کی زیارت ضروری تھی۔ چنانچہ ہم لوگ نو بجے ہوائی اڈے پر جا پہنچے، جہاں باختر کمپنی کے دو طیارے ہماری مسافرت کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ یہ دونوں طیارے چھوٹے سائز کے تھے، اور ایک میں صرف

تیس ۳۰ مسافروں کی گنجائش ہے، اور ہم چالیس آدمی تھے، اس لیے دو طیاروں کی ضرورت ہوگی، باختر کمپنی کے طیارے اندرون ملک مواصلات کے لیے مقرر ہیں۔ ہمارے طیارے میں ۲۰ آدمی تھے، یہ طیارہ زیادہ بلندی پر پرواز نہیں کر رہا تھا، اس لیے ہم زمین پر کی چیزوں کا دھندلا نظارہ کر سکتے تھے، ہمارے نیچے پہاڑ ہی پہاڑ تھے، جن میں سے اکثر کی چوٹیاں برف پوش تھیں، جہاں پہاڑ نہیں تھے وہ جگہ اُجاڑ معلوم ہوتی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم ہرات پہنچ گئے، یہاں صوبہ ہرات کے گورنر جناب غلام علی آئین، ان کے اسٹاف کے لوگ، دیگر حکام شہر اور علماء و فضلائے ہرات ہماری پیشوائی کو موجود تھے، جہاز سے اتر کر ہم لوگوں کی صف میں سلام اور مصافحہ کرنے کو داخل ہوئے، ہم پر پھولوں کی بارش کی گئی، پھر ہم موٹروں میں سوار ہو کر شہر کو روانہ ہوئے، ہوائی اڈے سے شہر تک تقریباً بیس کیلومیٹر کا فاصلہ ہے، لیکن سڑک پختہ کشادہ اور سیدھی ہے، اس کے دونوں طرف چنار اور سفیدار کے بلند و بالا درخت لگے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے خیابان کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، ایک جگہ سڑک ہری رود، ندی کو پل کے ذریعے عبور کرتی ہے، یہ ندی بہت چوڑی نہیں ہے، لیکن بظاہر گہری معلوم ہوئی، اور اس کا پانی تیزی سے بہ رہا تھا نصف ساعت کے بعد ہم شہر میں داخل ہوئے جہاں ہماری اقامت کا انتظام کیا گیا تھا، اور ہمارے لیے کمرے محفوظ کر لیے گئے تھے، ہم لوگ مختصر سامان کے ساتھ آئے تھے جسے کمروں میں رکھ کر اور منہ ہاتھ دھو کر پھر ہوٹل کے باہر جمع ہوئے کیونکہ ہمیں تالار ولایت (یعنی گورنر کے آفس کے کانفرنس ہال) کو جانا تھا، جہاں گورنر اور اہالی شہر کی طرف سے ہماری پذیرائی کا اہتمام کیا گیا تھا، چنانچہ ہم لوگ پھر موٹروں میں سوار ہو کر وہاں پہنچ گئے، مسٹر آئین کے علاوہ ان کے اسٹاف کے علاوہ پولیس اور فوج کے بڑے بڑے افسران

یورخ شہر بڑی تعداد میں موجود تھے، یہاں بھی ہمارے سروں پر گلاب کی خوشبو بکھیرنے
، بارش کی گئی، تقریب کا آغاز قرآن پاک کی چند آیتوں کی تلاوت سے ہوا، پھر
فغانستان کا قومی ترانہ گایا گیا، اس کے بعد مسٹر آئین نے ایک مختصر اسپیچ میں خواجہ
بد اللہ انصاری کی شخصیت کا تذکرہ کیا، جشن کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور مہمانوں
ا خیر مقدم کیا، ہرات میں شعبۂ اطلاعات وکلتور کے سربراہ جناب عبد الوحید نافذ
، بھی مہمانوں کے خیر مقدم کے لیے مختصر سی تقریر کی، مہمانوں کی طرف سے ڈاکٹر مرشد بور
دئی اور پروفیسر عبد الحی حبیبی نے شکریہ ادا کیا، آخر میں خواجہ انصاری کی مناجات
ے چند جملے بڑی خوش الحانی کے ساتھ سنائے گئے۔ اس تقریب کے اختتام کے بعد
ہرات کے تاریخی مقامات اور مزارات کے دیکھنے کا پروگرام تھا۔

ہرات کابل سے ۵۰ ۷ کیلو میٹر دور شمال مغرب میں ایران کی سرحد کے
قریب مشہور و معروف قدیم شہر ہے۔ سکندر کے حملوں سے پہلے یہاں پر ارتکانا نام
کا ایک شہر آباد تھا، سکندر نے اسی مقام پر ہرات کا شہر بسایا، اور ایک مضبوط
لعہ بنوایا، یہ قلعہ اب نیست و نابود ہو چکا ہے، لیکن حصار ہنوز شکستہ حالت میں قائم
ہے، ہری رود ندی چکر کھاتی ہوئی اس شہر کے مختلف نقاط سے گزرتی ہے، یہاں کی
آب و ہوا نہایت خوشگوار و فرحت بخش ہے، آس پاس کے علاقوں میں پھلوں کے
باغات اور پھولوں کے چمنستان ہیں، یہاں سے کچھ دور بادغیس کا مشہور قصبہ ہے
جہاں بخارا کا سامانی فرمانروا سلطان نصر بن احمد بغرض تفریح و تفریح آیا تھا، لیکن
اس کی فرحت فزا آب و ہوا اور پھولوں اور پھلوں کی رنگا رنگی اور خوش منظری میں ایسا
محو ہوا کہ پائے تخت کو لوٹنا بھول گیا، اور عرصے تک یہاں رہ گیا، اس کا قصہ نظامی عروضی

ں کے ساتھ چہار مقالہ میں بیان کیا ہے کہ کس طرح رودکی نے اپنا مشہور قصیدہ
مانی سے گاکر بادشاہ کو فوراً بخارا لوٹ چلنے پر آمادہ کیا۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں اس کا بیٹا مسعود غزنوی ہرات کا گورنر تھا
شہر پر ترکوں اور تاتاریوں نے بار بار حملے کئے، اور ہرات اُجڑ اُجڑ کر بستا رہا،
ی بادشاہوں کے زمانے میں اسے بڑا عروج حاصل ہوا، خصوصاً تیمور کے بیٹے، اور
بن شاہرخ مرزا نے اس شہر کو اپنا پائے تخت بنا کر اس کی تزئین و آرائش پر
توجہ صرف کی، اس کی بیوی گوہر شاد بھی عمارات بنوانے کا بڑا ذوق رکھتی تھی،
ان حسین بایقرا اور اس کے علم دوست و معارف پرور وزیر امیر علی شیر نوائی
انے میں ہرات دانشمندوں اور ہنرمندوں کا مجمع تھا، یہاں شاعر و سخنور بھی تھے
ر محدث و مفسر بھی، فقیہ و معلم بھی، صوفی و عارف بھی، مورخ و طبیب بھی، مصور و
بھی، بہزاد ایسا مصور اسی زمانے میں یہاں پیدا ہوا، ان سب کو امیر علی شیر
ا سرپرستی حاصل تھی، سامانی اور غزنوی بادشاہوں، اور ان کے وزیروں نے
ا خوبصورت باغ لگوائے، اور عمارتیں بنوائی تھیں، جن میں سے بعض اب تک باقی
خواص و عوام کے لیے قابل دید ہیں۔ (اس شہر کی تاریخ و توصیف کے لیے معین الدین
، اسفزاری کی مشہور تالیف روضات الجنات فی اوصاف مدینۃ الہرات ملاحظہ ہو)

راقم السطور نے ۱۹۵۰ء میں ہرات کے ایک فارسی شاعر اور خواجہ حافظ شیرازی
زمان و ہم دربار کن صاین ہروی کا دیوان مرتب و محشی کرکے طبع کرایا تھا، اس وقت سے
میں ہرات دیکھنے کی تمنا تھی، اب جو وہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی تو عجیب کیفیت سے دوچار
خدا کا شکر بجا لایا کہ اس نے میری قسمت میں اس شہر کی زیارت لکھ دی تھی ورنہ

خواب میں بھی اس کی امید نہیں کرسکتا تھا، اپنی قسمت کی یاوری پر حیرت ہوتی تھی کہ کہاں میں اور کہاں ہرات کا دیدار ۔

اب ہم قدیم عمارتوں اور تاریخی مقامات کو دیکھنے چلے، سب سے پہلے ہرات کے محلے کہن دژ (۔ حصار قدیم) پہنچے جو خواجہ انصاری کی جائے ولادت ہے، یہاں وہ اپنے والد کے گھر میں پیدا ہوئے تھے، وہ مکان زیر زمین ہوگیا تھا اس کا صرف اوپر کا حصہ نظر آتا تھا، اندر جانے کا راستہ زمین دوز ہے۔ اب اسے زمین کھود کر باہر نکالا گیا، یہ مکان ایک پُر فضا و شاداب باغ میں واقع ہے۔ نزدیک ہی امام زادہ ابوالقاسم محمد بن جعفر صادقؒ کا مزار ہے۔ حضرت ابوالقاسم خلیفہ عباسی ہارون رشید کے زمانے میں خفیہ طور پر خراسان میں رہتے تھے۔ ہرات ہی میں وفات پائی یا بروایت دیگر شہید ہوئے خواجہ انصاری برابر اس مزار کی زیارت کیا کرتے تھے، مزار کی قدیم عمارت اور اس کا گنبد خراب ہوچکا تھا، جس کی مرمت ۱۳۲۵ ہجری میں کی گئی، اور پھر بعد میں اس کے مدخل کے ایوان کو کاشی کاری سے مزین کیا گیا ہے، کہن دژ ہی میں سید عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر طیار کا مزار بھی ہے، جو سال ۱۳۴ ہجری میں شہید ہوئے تھے ان کے مقبرے کا گنبد سنہ [illegible] ہجری میں تعمیر ہوا تھا، اور سلطان حسین بایقرا کے عہد میں اس کی مرمت و کاشی کاری ہوئی ہے۔ گنبد کے اندر اس کے آٹھ رواقوں کی مقرنس کاری قابل دید ہے، اسے اسلامی ہنر کے نفیس نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مقبرے کے مشرقی رواق میں صاحب[1] کتاب نزہتہ الارواح و طرب المجالس اور محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشن راز کے سوالات کے طرح کنندہ کا مزار ہے، امیر حسینی سادات خواجہ عبداللہ انصاری کے عقیدت مندوں میں سے تھے، اس گنبد کے اندر چند اور

---

[1] امیر حسینی [illegible]

با میں، ایک قبر میر ناصر عرب کی ہے، جس کے بڑے سنگی صندوق پر شمشیر و تفنگ
خود اور سپر کے نقوش بنے ہوئے ہیں۔

یہاں سے نکل کر ہم لوگ خواجہ عبداللہ انصاری کے استاد ابوعبداللہ محمد بن
ں طاقی سجستانی ہروی کے مقبرے کی زیارت کو گئے۔ ابوعبداللہ محمد جو خواجہ طاقی کے نام
مشہور ہیں۔ علوم شریعت و طریقت میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ شیخ الاسلام خواجہ
نصاری نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "او پیر من است واستاد من واگر او را ندیدم
عاد حنبلیان نمی دانستم" خواجہ طاقی سال ۴۱۷ھ میں فوت ہوئے تھے۔ ان کا مقبرہ
رکے جنوب میں واقع ہے۔ شاہرخ مرزا نے ان کی تربت پر ایک بلند و بالا عمارت
برکرادی تھی لیکن مرور ایام سے وہ اب باقی نہیں رہی۔

دوپہر کا وقت ہوگیا تھا، اور تالار ولایت میں والی ہرات کی طرف سے چاشت
ی لینچ کی دعوت تھی، چنانچہ ہم لوگ وہاں ڈیڑھ بجے جا پہنچے۔ دعوت میں تقریباً وہی سب
بزیں تھیں جو ہم لوگ کابل کی دعوتوں میں کھا چکے تھے، تین قسم کا پلاؤ، مرغ اور گوسفند
گوشت، کباب، سلاد، روٹی، پڈنگ، پھلوں میں نارنگی، کیلا اور پرتقال، مشروبات
یا کاکاکولا، اور فنٹا، ایران کی دعوتوں میں شراب کی بھی فراوانی رہتی تھی، یہاں
س کا نام و نشان بھی نہ تھا، کھانے میں میزبان اور ہرات کے بہت سے علماء فضلاء بھی
ریک تھے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد ہم لوگ پھر ہوٹل موفق کو واپس آئے اور یہاں تھوڑی دیر
لمہ استراحت کرنے کے بعد پھر مزارات و تاریخی مقامات کو دیکھنے کے لیے، روانہ ہوئے،
سب سے پہلے ہم ہرات کی مشہور مسجد "مسجد جامع ہرات" گئے۔ یہ مسجد وسط شہر میں

ایک پُر رونق بازار کے سامنے واقع ہے، ہمارے راستے میں ہرات کے لوگ سڑکوں کے دونوں طرف پیادہ رو پر قطار باندھے کھڑے تھے، ان میں عمامہ پوش بوڑھے نوجوان اور بچے بھی تھے، لیکن ان تماشہ بینوں میں کوئی عورت نہ تھی، ہم جہاں جہاں گئے، وہاں لوگوں نے اظہار خوشی کیا، اور پھول برسا کر ہمارا خیر مقدم کیا، یہ مسجد جامع ایک کشادہ سڑک پر واقع ہے، یہ مسجد ہرات کی نفیس و پُرشکوہ عمارتوں میں سے ہے، اسے سلطان غیاث الدین محمد بن سام غوری نے ۵۹۷ھ میں تعمیر کرایا تھا، صحن مسجد میں سنگ فرش کیا ہوا ہے، یہاں ایک بہت بڑی آہنی دیگ بھی ہے، جس میں غالباً زمانہ قدیم میں پانی بھر دیا جاتا ہوگا۔ محمد غوری کی ۵۹۹ھ میں وفات ہوگئی تھی، اس کی قبر ایک مقبرہ میں ہے، جو مسجد کے شمال میں واقع ہے، اس کی چھت خراب ہوگئی ہے، جس کی مرمت ہو رہی تھی۔ سلطان حسین بایقرا اور امیر علی شیر نوائی نے اس مسجد کی مرمت اور تزئین و کاشی کاری کی طرف توجہ کی، اسے دیکھ کر مشہد کی مسجد گوہر شاد کی یاد آگئی دونوں کا طرز تعمیر میں خاصی مشابہت ہے، مسجد کے میناروں اور گنبد کی کاشی کاری بڑی خوبصورت ہے، بلند محرابوں پر قرآن کی سورتیں طغرا میں تحریر ہیں۔ مسجد کی بعض دیواروں کی کاشی کاری قابل مرمت ہوگئی ہے، چنانچہ ایک کمرے میں منقش اینٹوں کے بنانے کا کام ہو رہا تھا، کئی کاریگر کام میں مشغول تھے۔   (باقی)

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی کی بے نظیر کتاب عرصہ سے ختم ہوگئی تھی، اب اس کا نیا ایڈیشن شایع ہوگیا ہے۔   قیمت :- ۲۵-۶

قلقشندی اور صبح الاعشیٰ

از

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے (علیگ)

ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر میں تاتاریوں کے فتنۂ بلاخیز نے جہاں اسلامیان عالم کو سیاسی اور معاشی حیثیت سے زوال وانحطاط کی ذلتوں سے دوچار کیا وہیں اس سے دنیائے علم وفن کو بھی ناقابل تلافی نقصانات پہنچے۔ تاتاریوں نے بغداد اور دوسرے دیار و امصار پر یورش کے دوران صرف خلیفہ اور حکام وامراء ہی کے قتل پر اکتفا نہیں کی بلکہ بے شمار علماء کو بھی تہ تیغ کیا۔ اور علوم وفنون کا وہ تمام بیش بہا ذخیرہ جو صدیوں کی عرق ریزیوں کا ثمرہ تھا چشم زدن میں غرق آب یا نذر آتش کر دیا گیا۔ بلاشبہ یہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت افسوسناک حادثہ اور سیاہ ترین ورق ہے۔ بلکہ شاید پوری تاریخ انسانی میں اس سے زیادہ عظیم کسی المیہ کا ظہور نہیں ہوا۔

اس پر آشوب عہد میں صرف مصر وشام دو ایسے ملک تھے۔ جو بعض وجوہ سے اس موج خوں کی زد سے مامون رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان وادب اور اسلامی علوم وفنون کو باقی رکھنے اور فروغ دینے میں ان کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ اس وقت ان ملکوں میں سلاطین ممالیک حکمرانی کر رہے تھے۔ جن کے بعض علم دوست اور علماء نواز حکمرانوں کی توجہ سے اسکندریہ، اسیوط، فیوم، دمشق، حمص، حلب اور حماۃ وغیرہ میں بخارا، سمرقند، نیشاپور، مرو اور بغداد

و قرطبہ کی سی علمی و ادبی مجلسیں آراستہ ہوگئیں۔

یہ صحیح ہے کہ فتنۂ تاتار نے بخارا، نیشاپور، اور بغداد کے بڑے عدیم المثال اور نادر کتب خانوں کو خاکستر کر کے اپنے نزدیک صفحۂ ہستی سے علم و فن کا خاتمہ کر دیا تھا۔ لیکن اسی خون صد ہزار انجم سے وہ سحر تازہ پیدا ہوئی جسے "تحریک موسوعات" کا نام دیا جاتا ہے، چنانچہ اس عہد میں اس کثرت سے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و تالیف کا کام ہوا کہ بعض محققین نے اسکو عصر موسوعات[1] سے تعبیر کیا ہے،[2] یہ حقیقت ہے کہ ان مخصوص سیاسی انقلابات کے بغیر عربی زبان میں اتنے مفید و ضخیم انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا خیال شاید پیدا نہ ہوتا۔ جب مصر و شام کے ممتاز اہل علم نے ذخائر کتب کی اس وسیع پیمانے پر تباہی کو دیکھا تو وہ اسلاف کی صدیوں کی کمائیوں کے باقی ماندہ گنج ہائے گرانمایہ کو یکجا کر کے ایک سلک گہر میں پرونے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ بلا شبہ یہ کام بہت دیدہ ریزی اور جانکاہی کا طالب تھا، لیکن جس طرح ان ماہرین فن نے کوہکنی کر کے جوئے شیر نکالی ہے، اس نے ان کو علم و فن کی تاریخ میں حیات ابدی عطا کی ہے۔

ان نامور فضلاء میں شہاب الدین النویری (نہایۃ الارب) ابن فضل اللہ العمری (مسالک الابصار) ابن منظور الانصاری (لسان العرب) اور قلقشندی (صبح الاعشی) کے نام نمایاں ہیں۔

مذکورہ بالا تمام موسوعات پر اپنے مرتبین کے مخصوص ذوق و رجحان کا رنگ غالب ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ سب علوم و فنون کا حسین گلدستہ بلکہ گنجینۂ معارف اور خزینۂ حکمت ہیں۔ پیش نظر مضمون میں راقم سطور کا مقصود صبح الاعشی قلقشندی پر تفصیل کے ساتھ کچھ عرض کرنا ہو لیکن اس سے پہلے پس منظر کے طور پر چند سطور میں دوسرے موسوعات کا اجمالی جائزہ لینا بھی ضروری ہے، تاکہ اس سے صبح الاعشی کی اہمیت اور اس کا مقام نمایاں ہو کر سامنے آسکے۔

---

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ ص ۱۱۲ [2] ایضاً ج ۳ ص ۲۲۵

نہایۃ الارب | یہ عہد ممالیک کی سب سے اہم انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کے مؤلف احمد بن عبدالوہاب بن محمد بن عبدالدائم البکری ہیں جنھوں نے شہاب الدین النویری کے نام سے شہرت پائی۔ یہ ۶۷۷ھ/۱۲۷۸ء میں مصر کے ایک گاؤں نویرہ میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طفولیت وہاں گذار کر قوص آگئے، جو اس عہد میں پورے مصر میں اپنی علمی و ادبی فضا کے لیے مشہور تھا۔ اسی شہرستان علم میں نویری نے نشو ونما پائی۔ اور منتخب زمانہ ارباب فن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر کے مروجہ علوم میں دسترس حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد سلطان الملک الناصر محمد بن قلاوون کے دامان حکومت سے وابستہ ہوگئے۔ اس نے ان کو طرابلس کی فوج کے عہدۂ نظارت پر مامور کیا ایک مدت تک اس خدمت کو انجام دینے کے بعد پھر کوچۂ علم کی یاد آئی طبعاً ان کا ذوق بھی یہی تھا لیکن رجحان طبع کے علی الرغم معاشی مجبوریوں کے باعث حکومت کی ملازمت اختیار کرنی پڑی تھی۔ جس سے بالآخر گلو خلاصی حاصل کر کے پھر مطالعہ و تحقیق میں منہمک ہوگئے۔ اور نہایۃ الارب جیسی شہرۂ آفاق اور ضخیم کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگئی جس نے نویری کو ایک عظیم مؤرخ، وسیع المطالعہ محقق اور صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے بقائے دوام عطا کی۔

نہایۃ الارب کے سبب تالیف کے بارے میں نویری نے کتاب کے مقدمہ میں خود تصریح کی ہے کہ حکومتی ذمہ داریوں سے علیحدگی کے بعد جب انھوں نے مطالعہ کی بزم آراستہ کی تو اثنائے مطالعہ جو چیزیں اہم، مفید اور معلومات افزا نظر آئیں ان کو نوٹ کرتے گئے پھر اس کا ذخیرہ اتنا زیادہ ہوگیا کہ انھوں نے اس کو ایک سلک گہر میں منسلک کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اسی کے نتیجہ میں یہ ضخیم کتاب تالیف ہوئی۔ یہ کتاب تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ نویری نے اس کو پانچ فنون میں تقسیم کیا ہے اور پھر ہر فن پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا فن آسمان

و زمین، آثار علویہ اور معالم سفلیہ سے متعلق ہے۔ دوسرے میں انسان اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔ تیسرا فن حیوان صامت کے بارے میں ہے، چوتھے میں نباتات کا ذکر ہے، اور پانچواں فن تاریخ سے متعلق ہے۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد تک جتنے انسانی علوم و فنون مروج تھے۔ سب کو نویری نے قدماء کی کتابوں سے اخذ کر کے نہایت خوبصورتی کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔ نہایۃ الارب کی ہر جلد مؤلف کی عرق ریزی، کاوش و محنت، وسعت مطالعہ معیاری ادبی ذوق اور حسن سلیقہ پر شاہد عدل ہے جب اس کا مطالعہ کرنے والا نویری کی حیرت انگیز وسعت معلومات کو دیکھتا ہے تو وہ مجسم حیرت و استعجاب بن کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ آسمان کا ذکر کرتے ہیں، تو اس کے بارے میں صرف اہل نجوم اور ماہرین فلکیات کے بیانات اور ان کے نتائج تحقیق کے ذکر ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قرآن و حدیث میں جو کچھ آسمان کے متعلق مذکور ہے، اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ پھر ایسے امثال و محاورات نقل کرتے ہیں جن میں لفظ "السماء" آیا ہے، اس کے بعد کثرت سے ایسے اشعار یکجا کرتے ہیں جن میں آسمان کا وصف یا اس کی تشبیہات آئی ہیں۔ اتنا کرنے کے بعد پھر ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جن میں "فلک" کا لفظ آیا ہے۔ ان سب سے فارغ ہو کر ستاروں اور آفتاب و ماہتاب کی معلومات آفریں تفصیلات بیان کرنے لگتے ہیں، اور پھر اسی سلسلہ کلام میں اجرام سماوی، ملائکہ، بادل، بارش اور ژالہ باری کے اسباب، برق و صاعقہ، گردش لیل و نہار، اور مختلف موسموں کے بارے میں ایسی ایسی معلومات کا انبار لگا دیتے ہیں کہ چشم حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے۔[1]

---

[1] مصادر کے لیے ملاحظہ فرمائیں، الاعلام زرکلی ج ۱ ص ۹۴، الطالع السعید ادفوی ص ۴۰، الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۱ ص ۱۹۰، حسن المحاضرۃ سیوطی ج ۱ ص ۲۳۹، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۳ ص ۲۲۵، معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۸۰۴

اسی نہج پر انھوں نے شعر و ادب، امثال و حکم، غنا و موسیقی زہد و رندی، نظام حکومت و وزارت، جنگ و تجارت اور محکمہ قضا وغیرہ کے بارے میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے، غرض نہایۃ الارب ایسا دائرۃ المعارف ہے، جس کے نگار خانے میں ہر طرف علم و ادب کی قندیلیں فروزاں دیکھکر قاری کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

مسالک الابصار اس جغرافیائی موسوعہ کے مؤلف ابوالعباس شہاب الدین احمد بن یحیٰ بن فضل اللہ ۳ شوال ۷۰۰ھ کو دمشق میں پیدا ہوئے۔ حضرت عمر فاروق سے نسبی تعلق رکھنے کے باعث دنیائے علم میں "العمری" کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ دمشق کے علاوہ قاہرہ، اسکندریہ اور حجاز وغیرہ کا سفر کرکے نادرۂ عہد اہل علم اور ماہرین فن سے اکتساب فیض کیا۔ قاہرہ میں محکمہ قضا اور کتابت کے مختلف ذمہ دار عہدوں پر مامور ہوئے، پھر وطن مالوف واپس آکر وہیں ذی الحجہ ۷۴۹ھ میں وفات پائی۔

ابن فضل اللہ العمری ادب، تاریخ، انشاء اور دوسرے بہت سے علوم میں ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن خاص طور پر ہندوستان کے بلاد وسطی، ترک سلاطین، جغرافیہ اور تقویم البلدان میں ان کو درجہ امتیاز و استناد حاصل تھا، اور وہ اکابر عصر کے سوانح و اخبار کے سب سے بڑے واقفکار شمار ہوتے تھے، نظم و نثر دونوں پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی، مبدأ فیاض سے حافظہ بھی نہایت قوی پایا تھا، جمال ظاہری کے ساتھ حسن خلق و مروت کا بھی پیکر تھے۔

ابن شاکر کتبی نے فوات الوفیات میں ان کے کمالات علم و فضل پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

عمری نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ لیکن بایں ہمہ کافی بڑا اور گرانقدر تحریری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ مسالک الابصار کے علاوہ خیر الدین زرکلی نے ان کی درج ذیل کتابوں کے نام

شمار کرائے ہیں۔ الدرر الفرائد، الشذورات، النبذ الکافیۃ فی معرفۃ الکتابۃ والقافیۃ، مسالک عباد الصلیب، التعریف بالمصطلح الشریف، فواضل السمر فی فضائل آل عمر (چار جلد) یقظۃ الساہر، نفحۃ الروض، دمعۃ الباکی، صبابۃ المشتاق (مدائح نبوی چار جلدوں میں)

العمری کی شہرۂ آفاق موسوعہ "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ یوں تو اس میں دنیا جہان کی باتیں ہیں مگر پوری کتاب پر جغرافیہ و تاریخ کا رنگ غالب ہے جن میں العمری کو خصوصی مہارت حاصل تھی۔ خود مؤلف کی تصریح ہے کہ :۔

وصف الارض وما اشتملت	(اس میں) زمین اور اس کے مشتملات
علیہ برا وبحرا وھو قسمان	خشکی وتری کا بیان ہے۔ اس کے
اولھا فی الارض وثانیھما	دو حصے ہیں ایک حصہ زمین سے
فی سکان الارض	متعلق ہے اور دوسرا زمین کے
" " " " " "	باشندوں سے۔

پہلے حصہ میں جغرافیہ اور تقویم البلدان کے مباحث ہیں اور خاص طور پر مصر و شام اور حجاز کے جغرافیہ اور تقویم پر سیر حاصل بحثیں ہیں۔ دوسرے حصہ میں اقوام وممالک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مغرب و مشرق کے بکثرت علماء، فقہاء، اطباء اور اہل سیاست کے تراجم تحریر کئے ہیں، اس کے علاوہ حیوانات، طیور و وحوش اور نباتات و جمادات وغیرہ پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اپنے زمانے کے عام دستور کے مطابق العمری نے بھی اس موسوعہ کو علم و ادب کا حسین سنگم بنا دیا ہے اس کتاب کا بنیادی موضوع جغرافیہ ہے۔ لیکن

مؤلف نے ادب، تاریخ، تقویم اور مذہب و تمدن کے امتزاج سے اس خشک موضوع کو باغ و بہار اور دلچسپ معلومات کا سمندر بنا دیا ہے۔ خود کار مشین کی طرح بات سے بات نکلتی اور پھیلتی چلی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب آٹھویں صدی کے علمی و ادبی ارتقاء اور تاریخی و جغرافیائی معلومات خصوصاً اس عہد کی تاریخ ہند کا مستند ترین ماخذ ہے۔[۵]

لسان العرب | اس شہرۂ آفاق معجم کے مؤلف ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن علی بن احمد الانصاری محرم ۶۳۰ھ میں پیدا اور شعبان ۷۱۱ھ میں بمقام قاہرہ فوت ہوئے۔ دنیائے علم میں ابن منظور کے نام سے شہرت حاصل کی۔ وقت کے کبار علماء کے خرمن فضل و کمال سے خوشہ چینی کرکے ادب و انشاء، نحو و لغت، اور تاریخ و کتابت میں مہارت تامہ حاصل کی۔ بقول حافظ سیوطی ادب اور انشاء میں خاص طور پر وہ اپنے زمانے کے مشہور فاضل اور مسلم الثبوت امام خیال کئے جاتے تھے۔

ابن منظور کو ادب کی مطول کتابوں کی تلخیص کا خاص شغف اور ذوق تھا، اور بقول صاحب الدرر الکامنہ "کان لا یمل من ذلک" یعنی وہ اس کام سے اکتاتے بھی نہیں تھے، انھوں نے کتاب الاغانی، العقد الفرید، الذخیرہ، مفردات ابن بیطار اور بکثرت تاریخی و ادبی کتابوں کا خلاصہ کیا ہے، حافظ ابن حجر نے صفدی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

لا اعرف فی الادب	مجھے ادب میں جس مطول کتاب کا
وغیرہ کتابا مطولا الا	بھی علم ہے اس کو انھوں نے مختصر

[۱] مراجع کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ فوات الوفیات ج ۲ ص، حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۲۲۵ الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۴ ص ۲۶۲ الاعلام زرکلی ج ۸ ص ۵۰ معجم المطبوعات ج ۱

وفد مختصر کر دیا ہے۔

خود ابن منظور کے صاحبزادے قطب الدین سے منقول ہے کہ انہ ترک بخطه خمسمائة مجلد۔ یعنی انھوں نے پانچ سو جلدیں اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادگار چھوڑی ہیں۔

ایک طویل مدت تک مصر کے دیوان انشار میں ملازم رہے۔ اور کچھ عرصہ طرابلس میں قضا کی خدمات بھی انجام دیں۔ عمر کے آخری حصے میں نابینا ہو گئے تھے۔ علامہ سبکی اور حافظ ذہبی کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔

لسان العرب ابن منظور کی وہ عظیم اور مشہور ترین تالیف ہے، جس سے ساتویں صدی ہجری میں تالیف موسوعات کی بنیاد پڑی۔ یہ بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ اسّی ہزار لغوی مادوں کا مجموعہ ہے، اس لحاظ سے یہ اب تک کے عربی معاجم میں سب سے عظیم لغت شمار کی جاتی ہے، اس کی ترتیب میں ابن منظور نے صحاح جوہری کا طرز و نہج اختیار کیا ہے، اگرچہ بنیادی طور پر یہ کتاب لغت سے متعلق ہے، لیکن ضمنی طور پر اس میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مباحث اور موضوعات کا ذکر آگیا ہے۔ یہ دراصل کوئی مستقل بالذات (Original) تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ خود ابن منظور نے اس کے مقدمہ میں تصریح کر دی ہے کہ "تہذیب اللغۃ" لابی منصور الازہری، الصحاح للجوہری، اس پر بری کے حواشی، المحکم لابن سیدہ، الجمہرہ لابن درید اور النہایہ لابن اثیر کے جو مفید مضامین منتشر اور پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو اس کتاب میں سلیقہ سے یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور اس نقل و اقتباس میں ابن منظور نے اتنی دیانت و امانت کا ثبوت دیا ہے کہ اصل عبارت میں اپنی طرف سے کہیں بھی حذف و اضافہ یا ترمیم نہیں کی۔

اسی لیے وہ مقدمہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ: اس کتاب میں میرا کام صرف اتنا رہا ہے کہ مذکورہ بالا کتابوں میں جو کچھ منتشر تھا، میں نے اس کو بعینہٖ ایک لڑی میں پرو کر پیش کر دیا ہے، اور بس۔ چنانچہ اس میں اگر کوئی خوبی یا تسامح، لغزش یا کوتاہی اور مدح و قدح کے لائق کوئی بات نظر آئے تو اس کے ذمہ دار اور مستحق اصل مؤلفین ہیں، میں نہیں، اسی طرح اگر اس کتاب سے کوئی کچھ نقل و اخذ کرے گا، تو وہ گویا اصل ماخذ سے استفادہ کر رہا ہے[1]۔

قلقشندی

مذکورہ بالا مرتبین انسائیکلوپیڈیا کی فہرست میں آخری شخصیت قلقشندی کی ہے جن کی شہرہ آفاق ضخیم تصنیف صبح الاعشیٰ سے آج عربی زبان و ادب کا ہر حلقہ پر شور رہے، بلکہ قلقشندی اور صبح الاعشیٰ دونوں کچھ اس طرح لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ایک کے ذکر کے ساتھ دوسرے کا تصور خود بخود ذہن میں آجاتا ہے لیکن نہایت تعجب کا مقام ہے کہ بایں شہرت و عظمت ارباب سیر و تذکرہ نے قلقشندی کے ساتھ وہ اعتنا نہیں کیا ہے جس کا وہ درحقیقت مستحق ہے، اسی باعث اس کے حالات و سوانح کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ میرے علم کے مطابق غالباً سب سے زیادہ حافظ سخاوی نے الضوء اللامع میں اس کا تذکرہ لکھا ہے۔ مگر وہ بھی نصف صفحہ سے زائد نہیں اور اس میں بھی تحقیق کی بعض غلطیاں موجود ہیں۔ اسی پر دوسرے ماخذ کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس حیثیت سے بلاشبہ قلقشندی

---

[1] مراجع کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ فوات الوفیات کتبی ج ۲ / ۳۳۱، نکت الہمیان ص ۵۰، ۲، بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۱۰۶، مفتاح السعادۃ طاش کبری زادہ ج ۱ ص ۱۰۹، الدرر الکامنہ ابن حجر ج ۴ ص ۲۹۲، معجم المطبوعات ج ۱ ص ۵۶۲ مقدمہ لسان العرب۔

اپنی تمام شہرت وعظمت اور قبول عام کے باوجود عربی زبان کے مظلوم ادیبوں کی صف میں شامل ہے بہرحال راقم سطور کو تلاش و تفحص کے بعد قلقشندی کے حالات و کمالات کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہو سکیں وہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں۔[1] اس کے بعد انشاء اللہ العزیز صبح الاعشیٰ کے مباحث کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

نام اور مولد ومنشا شہاب الدین لقب، ابو العباس کنیت اور احمد بن علی نام تھا قلقشندی وطنی نسبت ہے۔ وہ نسلاً خالص عرب تھا اس کا خاندان قبیلہ بنو فزارہ سے تعلق رکھتا تھا، جو اسلامی فتوحات کے زمانے میں عرب سے مصر آکر آباد ہو گیا تھا، قلقشندی باتفاق روایت ۷۵۶ھ میں مصر کے مدیریہ القلیوبیہ کے ایک گاؤں قلقشندہ میں پیدا ہوا۔[2] وطنی نسبت کی شہرت نے اصل نام پر خمول کے دبیز پردے ڈال دیئے یاقوت رومی نے معجم البلدان میں اس بستی کا نام قلقشندہ کے بجائے قرقشندہ (بالراء) تحریر کیا ہے[3] لیکن کسی دوسرے ماخذ سے اس کی تائید نہیں ہو سکی اس زمانہ میں یہ گاؤں قاہرہ سے جنوب میں صرف تین فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا، اور اپنی سرسبزی و شادابی کے اعتبار سے پورے ملک میں امتیازی حیثیت کا حامل تھا۔ اسی کی مردم خیز خاک سے دوسری صدی ہجری میں امام لیث ابن سعد جیسی عہد آفریں شخصیت پیدا ہوئی۔ جو زمرہ تبع تابعین کا گل سرسبد شمار ہوتی ہے۔ علم و فضل، تفقہ فی الدین

---

[1] مراجع کے لئے ملاحظہ فرمایئے۔ الضوء اللامع سخاوی ج ۲ ص ۸ کشف الظنون ۲/۱۰۳۳ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جرجی زیدان ج ۳ ص ۱۳۳ شذرات الذہب ج ۷ ص ۱۴۹ مقدمہ صبح الاعشیٰ ج ۱ ص ۴، البدر الطالع ج ۱، القلقشندی تالیف ڈاکٹر عبد اللطیف حمزہ [2] حافظ سخاوی اور ابن عماد حنبلی نے قلقشندی کا سلسلہ نسب یہ لکھا ہے، احمد بن علی بن احمد لیکن جرجی زیدان نے تاریخ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۹)

فیاضی وسیرچشمی اور تواضع وہ اوصاف ان کے سوانح حیات کی جلی سرخیاں ہیں، حدیث کی کوئی متداول کتاب ایسی نہیں ملے گی، جس میں لیث بن سعد کی مرویات موجود نہ ہوں۔ ان سے سماع و روایت کو کبار ائمہ اپنے لیے باعث فخر تصور کرتے تھے۔ فقہی حیثیت سے وہ مرتبہ اجتہاد پر فائز تھے، لیکن دوسرے ائمہ مجتہدین کی طرح ان کے استنباطات اور مجتہدات مدون و مرتب نہیں ہو سکے جس کی وجہ سے ان کے فقہ و اجتہاد کو عمومی شہرت حاصل نہ ہو سکی جلالت علمی کے ساتھ دنیاوی جاہ و جلال اور مال و دولت سے بھی بہرۂ وافر نصیب ہوا تھا۔

تعلیم و تربیت اسی خطۂ ارض سے آٹھویں صدی ہجری میں شہاب الدین القلقشندی جیسا گوہر شب چراغ پیدا ہوا۔ قلقشندی کی نشو و نما تمام تر علمی ماحول میں ہوئی۔ طلب علم کے سلسلہ میں وہ ایک مدت تک اسکندریہ میں مقیم رہے۔ جہاں انھوں نے اپنے زمانے کے مشاہیر اہل علم سے مروجہ علوم کی تحصیل کے ساتھ عربی زبان و ادب میں خصوصی کمال پیدا کیا۔

اسکندریہ کے دوران قیام میں ان کو آٹھویں صدی کے مشہور فاضل اور جامع الکمالات شخصیت قاضی ابوحفص سراج الدین عمر بن علی سے جو علمی دنیا میں ابن الملقن کے نام سے معروف ہیں، تلمذ خاص کا شرف حاصل ہوا، شیخ ابن الملقن حدیث، فقہ، رجال اور عربی زبان و لغت پر یکساں عبور رکھتے تھے، محققین نے ان کی علمی بلندی مرتبت کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ حافظ ابن حجر کو ان سے اختلاف تھا لیکن شدید

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۸) آداب اللغۃ العربیہ میں لکھا ہے کہ "ہم نے قلقشندی کی کتاب قلائد الجمان میں اس کا نام و نسب اس طرح لکھا دیکھا ہے۔ شہاب الدین ابوالعباس احمد بن عبداللہ بن احمد بن عبداللہ بن سلیمان اسماعیل الشہیر بابن ابی غدہ (جلد ۳ ص ۱۳۳) ۳ معجم البلدان جلد ۵ ص ۵ ، ۴ تاریخ بغداد خطیب جلد ۳ ص ۱۱ ، صفوۃ الصفوۃ جلد ۴ ص ۲۵ ، الرحمۃ الغیثیہ، تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ ص ۷۴ ، تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۲۰۴ ، تہذیب التہذیب ابن حجر ج ۸ ص ۴۶۳

نقد و جرح کے باوجود وہ بھی یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے کہ کان ابن الملقن اعجوبۃ عصرہ فی کثرۃ التصانیف۔ یعنی وہ اپنی کثرت تصانیف میں اعجوبۂ روزگار تھے۔[1]

۷۷۸ھ میں ان ہی شیخ ابن الملقن نے قلقشندی کو درس و افتا کی اجازت مرحمت فرمائی۔ چونکہ شیخ مذکور بہت متقشف شافعی المسلک تھے، اس لیے اپنے تلمیذ رشید کو بھی اسی مسلک کے مطابق فتویٰ دینے کی تلقین کی نیز صحاح ستہ، اور مسند شافعی اور مسند ابن حنبل کی روایت کی بھی اجازت دی، حالانکہ اس وقت ابن الملقن کا رہوار عمر اکیسویں منزل سے آگے نہیں بڑھا تھا، اس سے ان کی صلاحیت اور علمی کمال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

درس و افادہ | جب قلقشندی نے مسند درس پر قدم رکھا تو ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کے لیے بے شمار شائقین علم جمع ہو گئے۔ اور ان کی بساط درس کے حاشیہ نشین نادرۂ عہد فضلاء بن کر نکلے۔ قلقشندی نے اپنے سیکڑوں تلامذہ کو خرقہ و سند اجازہ سے سرفراز کیا۔ اس زمانہ میں فقہ کے ساتھ ان کو خصوصی اعتنا پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ علم فقہ میں درج ذیل دو کتابیں تالیف کیں۔ الغیوث الھوامع (یہ شافعی مسلک کی فقہی کتاب جامع المختصرات کی شرح ہے) اور کتاب الحاوی الصغیر کی شرح۔ فقہ کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی دلچسپی بڑھتی گئی، اور اسی زمانہ تدریس میں کئی ادبی رسائل تحریر کیے۔ علاوہ ازیں کنہ المراد کے نام سے کعب بن زہیرؓ کے قصیدۂ بانت سعاد کی شرح بھی لکھی۔ جس کے بارے میں وہ خود رقمطراز ہیں کہ "اللہ جل شانہ نے اس شرح میں مجھ پر کچھ ایسے معانی و مطالب منکشف فرمائے۔ جو اس سے پہلے میں نے اس قصیدہ کی کسی شرح میں نہیں دیکھے"۔

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھیں الضوء اللامع ۶/۱۰۰، شذرات الذہب ج۷، ص ۴۹، ذیل طبقات الحفاظ ص ۹، البدر الطالع ج ۳ ص ۵۰۸، الاعلام زرکلی ج ۲ ص ۲۰، حسن المحاضرۃ سیوطی ج ۱ ص ۱۸۶

خلیفہ چلپی نے کنہ المراد کو ابن حجر کی طرف منسوب کیا ہے۔[۱] استاذ ابراہیم الابیاری نے قلقشندی کی تالیف نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس شرح (کنہ المراد) کا ایک ایک نسخہ دار الکتب المصریہ اور کتب خانہ ازہریہ میں ہے۔ اور یہ دونوں حافظ سیوطی کی طرف منسوب ہیں۔ قصیدہ بانت سعاد کی شروح بہت کثرت سے لکھی گئی ہیں، اس لیے کوئی استبعاد نہیں کہ قلقشندی نے بھی کنہ المراد ہی کے نام سے اس کی شرح لکھی ہو۔

دیوان انشاء سے وابستگی | اب قلقشندی کی علمی شہرت اور فقہ و ادب میں غیر معمولی مہارت کے غلغلہ سے پورا ملک گونج اٹھا تھا۔ چنانچہ حکام و سلاطین وقت کی نگاہیں بھی ان کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ سنہ ۷۹۱ھ میں جب مصر میں دولت ممالیک کا آفتاب اقبال بلند تھا، دیوان انشاء میں کارگذاری کے لیے قلقشندی کا انتخاب عمل میں آیا۔ محققین نے لکھا ہے کہ اس منصب پر مامور ہونے کے بعد قلقشندی کی ذہانت اور جودت طبع کے جوہر نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اسی زمانے میں اس نے قاضی محی الدین ابن فضل اللہ کی جو اس وقت دیوان انشاء کے صدر تھے، تعریف میں "الکواکب الدریۃ فی المناقب البدریۃ" کے نام سے ایک مقامہ لکھا۔ جس میں فن انشاء کی تعریف اس کی اہمیت و افادیت اس کی نزاکتوں اور فن کتابت کے اصول و ضوابط پر بحث کی ہے۔ مگر حد سے زیادہ ایجاز کے باعث اس میں کافی ابہام و تعقید پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ قلقشندی نے اس کے اختصار، اشارات اور ابہام کو دوبارہ وضاحت و تفصیل کے ساتھ لکھا، جس کے نتیجہ میں چودہ ضخیم جلدوں پر مشتمل صبح الاعشیٰ منصہ شہود پر آئی۔

اسلوب نگارش | قلقشندی کا اسلوب نگارش اور طرز تحریر اپنے عہد کے عمومی رنگ سے

۱؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۳

ہم آہنگ ہے، جس کی بنیاد تخییل آرائی اور محسنات بدیعیہ یعنی سجع و قوافی، جناس و طباق اور مبالغہ آفرینی پر ہے۔ اس زمانہ کے نامور ممتاز ادبا، مثلاً قاضی فاضل ابن نباتہ ابن فضل اللہ العمری وغیرہ کے طرز تحریر کا یہی طغرائے امتیاز تھا۔ لیکن باین ہمہ قلقشندی کے ہاں تعقید و اغلاق اور ابہام و اشاریت کے بجائے وضاحت و شگفتگی نسبتہً زیادہ ملتی ہے۔ دیوان انشار سے وابستگی کے بعد اس نے جو مذکورۃ الصدر مقامہ لکھا تھا، اس سے اس کے تبحر علمی، ادبی کمال اور قوت حافظہ کا پورا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ صبح الاعشی میں بھی مسجع نثر کی قوس قزح موجود ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیش از بیش معلومات فراہم کرنے کی فکر میں اس صنعت کا التزام پوری کتاب میں باقی نہیں رکھ سکے۔

تصنیفات قلقشندی کی سب سے مشہور تصنیف جس نے اس کو بقائے دوام کے دربار میں صف پیش میں جگہ دی ہے۔ صبح الاعشی ہے اس پر چونکہ آئندہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے یہاں اس سے تعرض کیے بغیر قلقشندی کی دوسری تصنیفات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب۔ قلقشندی کا خیال تھا کہ فن انشار میں مہارت کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک علم انساب العرب سے پوری واقفیت نہ ہو۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اس نے علم الانساب کے موضوع پر دو کتابیں لکھیں ایک تو یہی زیر نظر نہایۃ الارب دوسری قلائد الجمان جس کا ذکر آگے آرہا ہے، نہایۃ میں حروف معجم کے مطابق مختلف قبائل اور ان کی شاخوں کے نام مرتب کئے گئے ہیں، یہ کتاب استاذ ابراہیم الابیاری کی تصحیح و تہذیب کے ساتھ مصر سے شائع ہو گئی ہے جس پر فاضل مصحح کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے کتب خانہ

خدیویہ مصر، برلن اور برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں۔

۲۔ قلائد الجمان فی قبائل العربان۔ جیسا کہ مذکور ہوا یہ کتاب بھی انساب عرب سے متعلق ہے۔ اس کی تالیف سے رجب ۸۱۹ھ میں یعنی وفات سے صرف دو سال قبل فراغت پائی۔ خلیفہ چلپی نے کشف الظنون میں اس کتاب کو قلقشندی کے والد کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا ہے کہ نہایۃ الارب سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن بقول شیخ محمد عبد الرسول (جن کی تصحیح و تنقیح کے ساتھ صبح الاعشیٰ مصر سے شائع ہوئی ہے) بہت تلاش و جستجو کے باوجود بھی نہایۃ الارب میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملا۔"

۳۔ ضوء الصبح المسفر۔ یہ صبح الاعشیٰ کی تلخیص ہے۔ جو خود قلقشندی نے کی ہے۔ محمود سلامہ کی تصحیح کے ساتھ اس کا پہلا حصہ جو ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبعہ الواعظ قاہرہ سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ (باقی)

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور پھر یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے

(از شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم)

صفحات ۔ ۴۳۲ صفحے ۔ قیمت ۔ ۲۰/-

خزانۂ عامرہ

از جناب عبد الرزاق صاحب قریشی بمبئی،

آزاد بلگرامی ۱۱۴۸ھ/ ۱۷۳۵ء میں ید بیضا اور ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ء میں سر
ترتیب دے چکے تھے، جو فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔ یہ تذکرے کسی مخصوص نقطۂ نگا
نہیں لکھے گئے تھے بلکہ عام قسم کے تذکرے تھے۔ ان کے بھتیجے میر اولاد محمد ذکا نے ان
کی کہ اب وہ ایک ایسا تذکرہ ترتیب دیں جس میں صرف ان شعرا کے حالات ہوا
نے ارباب کرم کی مدح گستری کی ہو اور اپنے ممدوحین سے صلہ پایا ہو۔ چونکہ آزاد
عزیز رکھتے تھے، اس لئے اس کی بات مان لی۔ اس طرح خزانۂ عامرہ وجود میں آیا
مصنف کے "خامۂ تقریب جو" نے اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات بھی لکھے ہیں، جن کا نا
صلہ کی فہرست میں نہیں ملتا، مثلاً نظام الملک، ناصر جنگ، فیروز جنگ، عما
وغیرہ۔ لیکن بقول مصنف ان کو پڑھنے کے بعد ان کی وفادیت خود بخود ظاہر ہو
گی،[۲] چونکہ یہ تذکرہ بنیادی طور پر ارباب صلہ کے حالات میں ہے، اس لئے
نے اس کا نام خزانۂ عامرہ رکھا۔[۳] یہ تذکرہ ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء میں مکمل
خود آزاد نے قطعۂ تاریخ کہا تھا۔

آزاد رقم نمود تو تذکرہ　　　　در جیب ورق ریخت نقود سرا
گنجور خرد گوہر تاریخ فشاند　　　　حق دادہ عجب خزانۂ عامرا

---

[۱] خزانۂ عامرہ، کانپور، مطبع منشی نول کشور، ۱۹۰۰ء ص ۳ [۲] ایضاً [۳] ایضاً

آزاد کہتے ہیں کہ اگر میں نے اس کتاب میں صلہ و انعام کا ذکر کیا ہے تو اس سے کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ یہ حسنِ طلب ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر تذکرہ نویس اپنے لیے ایک مخصوص پہلو ڈھونڈتا ہے۔ مثلاً کسی نے ایک خاص عصر کے شعرا کا تذکرہ لکھا۔ کسی نے ایک خاص ملک کے شعرا کے حالات ترتیب دئے۔ کسی نے اپنے تذکرے کو مرد شعرا تک محدود رکھا اور کسی نے شاعرات کے حالات لکھے[1]۔ اربابِ صلہ کا تذکرہ آج تک کسی نے نہیں لکھا اس لئے میں نے اس تخصیص کو اپنے لیے پسند کیا۔[2] پھر انھوں نے اپنی بے نیازی اور استغنا کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

"این دریوزہ گر فیضِ الٰہی در تمام عمر خود لب بمدح امیری نکشودہ و دنائتِ خود بستایشِ دولتمندی سیاہ نمودہ۔۔۔۔۔۔ ہرچند با امرا ارتباط دارم و با روسا اختلاط، اما سر رشتۂ استغنا نگسیختہ ام و آبروی فقر بر درِ غنا نریختہ بلی، عندلیب را از مصاحبت گل زری و ماہی را از مجالست صدف گوہری مطمح نظر نباشد۔۔۔۔۔ بیت

حبابم مشت من از گوہر منت تہی ہٗ　　نباشد عیب گر خود را بہ دریا آشنا کردم[2]

تمہیدی سطور کے بعد آزاد نے شعر کی اصطلاحی تعریف بتائی ہے اور اس کی توصیف میں ایک صفحے سے کچھ اوپر لکھا ہے، اس ضمن میں شعر کی تاثیر و اہمیت بتانے کے لیے انھوں نے محمود غزنوی کے ایک حملے کا ذکر کیا ہے۔ محمود نے قلعۂ کالنجر کا محاصرہ کیا، وہاں کے حاکم نندا نے ہندی میں ایک شعر لکھ کر محمود کے پاس بھیجا۔ شعر میں محمود کی مدح تھی صاحب طبعان نے جو محمود کی رکاب میں تھے مضمون شعر کی تحسین کی۔ محمود اس قدر خوش ہوا کہ

---

[1] خزانۂ عامرہ، کانپور، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۷۱ء ص ۳ [2] ایضاً

اس نے محاصرہ اٹھالیا، اور دوسرے پندرہ قلعے اسے عنایت کئے، اور ایران و توران کے تحائف اس کے پاس بھیجے اور غزنی کی طرف کوچ کردیا۔

تذکرے کی ترتیب | تذکرے کی ترتیب عام تذکروں کی طرح حروف تہجی کے لحاظ سے ہے۔ پہلا شاعر جس کے حالات لکھے گئے ہیں، انوری ہے اور خاتمہ میر یوسف بلگرامی کے حالات پر ہوا ہے شعرا کی کل تعداد ۳۳۴ ہے۔

تذکرے کے مآخذ۔ آزاد نے خزانہ عامرہ کے مآخذ بھی بتا دیے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

لب اللباب	محمد عوفی
تذکرۂ دولت شاہی	
تذکرۂ سامی	سام میرزا صفوی
خاتمۂ خلاصۃ الاشعار	
تذکرۂ میر تقی کاشی	
ہفت اقلیم	محمد امین رازی
منتخب التواریخ	ملا عبد القادر بدایونی
مجمع الفضلا	ملا بقائی
تذکرۂ مرزا طاہر نصر آبادی	
مرآۃ الخیال	شیر علی خان
کلمات الشعرا	سرخوش
ہمیشہ بہار	کشن چند اخلاص دہلوی
حیات الشعرا	محمد علی خان متین کشمیری

سفینۂ بےخبر	میر عظمت اللہ بےخبر بلگرامی
ید بیضا	آزاد بلگرامی
ریاض الشعرا	علی قلی خاں والہ داغستانی
مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں آرزو
تذکرۂ شیخ محمد علی حزیں اصفہانی	
سرو آزاد	آزاد بلگرامی
تذکرۂ بےنظیر	میر عبدالوہاب دولت آبادی
مردم دیدہ	حاکم لاہوری۔[1]

یہ مآخذ بتانے کے بعد آزاد کہتے ہیں کہ سوائے این تذکرہ با مواد بسیاری از دواوین شعرا و کتب فن تاریخ وغیر آن نصب العین است کہ سیر کتاب بعرض ناظران می رساند[2]

اس سلسلے میں ان کا یہ بھی بیان ہے کہ تذکرے میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، وہ مذکورہ بالا تذکروں سے نہیں لیے گئے ہیں سوائے ان چند اشعار کے جو متعلقہ کتابوں میں نہ مل سکے

انتخاب اشعار کا اصول نقل اشعار کے ضمن میں آزاد لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی میں نے کسی شاعر کے اچھے اشعار کو اپنے تذکرے میں اس لیے داخل نہیں کیا کہ وہ دوسرے تذکروں میں نقل ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے بھی کچھ اشعار رہ گئے کہ مجھے شاعر کا مکمل دیوان نہ مل سکا۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بھی بیان ہے کہ سرو آزاد میں اشعار نقل کرنے میں میں نے یہ التزام رکھا تھا کہ پہلے مطلعوں کو غیر مطلعوں پر مقدم رکھا تھا، خزانۂ عامرہ میں یہ التزام ملحوظ نہیں رہا لیکن اگر کسی شاعر کا دیوان مل گیا اور اس سے اشعار کا انتخاب کیا تو اشعار ردیف وار نقل کیے

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۶، ۷ [2] ایضاً، ص ،

تاکہ اگر کوئی کسی شعر کو دیوان میں دیکھنا چاہے تو وہ اُسے آسانی سے مل جائے۔ چند عربی اشعار کا انتخاب بھی تذکرے میں ملے گا اس طرح بقول خود آزاد نغمۂ عجم کے ساتھ ساتھ نواے حجاز بھی اس میں موجود ہے۔[۵]

ادبی و شعری نکات | یہ تذکرہ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، ان شعرا کے حالات میں ہے جنھیں ارباب کرم سے صلہ ملا لیکن اس میں صلوں کا ذکر کم ہے۔ شعرا کے حالات میں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ادبی و علمی اور شاعرانہ لطافت و نکات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اگرچہ تذکرے کا مقصد کاملاً پورا نہیں ہوتا لیکن اس کی اہمیت بہرحال بڑھ جاتی ہے۔

خزانۂ عامرہ میں سب سے پہلا شاعر انوری ہے جس کے حالات لکھے گئے ہیں، اور وہ قصیدہ گو ہے، اس لیے آزاد نے قصیدے کے مختلف حصوں کا ذکر کیا ہے اور اس کی اہمیت بتائی ہے، جو حسب ذیل ہے۔

۱۔ مطلع اگر نہایت عمدہ ہے تو طبیعت میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے، اور سامعہ کلام متقبل سننے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اگر حالت اس کے برعکس ہے تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ اور باقی کلام سننے کو جی نہیں چاہتا چاہے وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو۔

۲۔ مخلص (گریز)، تشبیب و مدح کے درمیان برزخ ہے۔ قصیدے کا سب سے مشکل حصہ گریز ہے۔ کیونکہ یہ دو ایسی باتوں کو جو ایک دوسرے سے متعلق نہیں ہوتیں، ملاتا ہے۔ گریز قصیدے کی روح ہے۔

---

[۵] خزانۂ عامرہ، ص ۵،۷

۳۔ حسن الطلب   شاعر اپنا مقصد اس سحر بیانی اور افسوں کاری سے ظاہر کرتا ہے کہ طبیعت ممدوح پر گراں نہیں گذرتا بلکہ بخیل کو کریم بنا دیتا ہے۔

۴۔ مقطع یا حسن الخاتمہ۔ قصیدے کو اس طرح ختم کرنا کہ سامعہ محظوظ ہو۔[۵۱]

اشعار جو نقل کئے ہیں ان کے ضمن میں بھی آزاد نے بعض اوقات معانی و نکات بیان کئے ہیں۔

مثلاً انوری کے ایک قصیدے کا مطلع نقل کیا ہے۔

جرم خورشید چو از حوت در آمد بحمل   اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

اور پھر بتایا ہے کہ اشہب سفید گھوڑے کو کہتے ہیں، ادہم مشکیں (سیاہ) رنگ کا ہوتا ہے، اور ارجل وہ گھوڑا ہے جس کے پاؤں سفید ہوتے ہیں۔ اس طرح شعر کی بلاغت واضح ہو گئی اور مطلع کا حسن لفظی و معنوی طور پر نمایاں ہو گیا۔[۵۲]

ناصر علی سرہندی کا مندرجہ ذیل شعر ایک محفل میں پڑھا گیا۔

صریر خامہ می دانم کہ با طبعیت نمی سازد   دریدی نامہ، دل صد پارہ شد قاصد رسید ای

محمد سعید اعجاز اکبر آبادی نے اعتراض کیا کہ عاشق دور دراز سے خط لکھتا ہے اور صریر خامہ معشوق کی طبع نازک پر گراں گذرتی ہے تو پھر دریدن نامہ، کو جو صریر خامہ سے زیادہ تکلیف دہ ہے، اس نے کیسے گوارا کر لیا؟ شاہ آفریں نے جواب دیا کہ یہاں صریر خامہ خود معشوق کے قلم کی آواز ہے۔ آزاد کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں۔ عاشق کا خط لکھنا معشوق کی طبع کے خلاف ہے اور نامے کو پھاڑ ڈالنا اس کی طبع کے موافق ہے۔ اس لیے صریر خامۂ عاشق اس کی خاطر نازک

---

۵۱ خزانۂ عامرہ، ص ۹-۸   ۵۲ ایضاً، ص ۲۹

پر بہت گراں گذرا اور نامہ پھاڑنے سے جو کرخت آواز پیدا ہوتی ہے، اسے اس نے گوارا کر لیا[1]

کسی شخص نے شیخ محمد علی حزیں کے سامنے ایک شعر پڑھا جس میں قالین باندھا گیا تھا۔ شیخ نے کہا کہ قالی بغیر نون کے صحیح ہے، اس شخص نے آزاد سے رجوع کیا۔ انھوں نے کہا کہ شیخ فرید الدین عطار نے قالین (نون کے ساتھ) استعمال کیا ہے اور سند میں یہ شعر پیش کیا۔

مردہ را بوریا قالیں بود ۔۔۔ زانکہ حسنش عاقبت بالیں بود[2]

ادبی نکات کے ساتھ ساتھ یہ تذکرہ شاعرانہ کمال یا شعری لطافت کے ذکر سے بھی خالی نہیں۔ صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

صائب کا ایک شعر ہے۔

اہل کمال را لب اظہار خامشی ست ۔۔۔ منت پذیر ماہ تمام از ہلال نیست

ایک دن نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کی مجلس میں یہ شعر پڑھا گیا اور اس کے مختلف معنی ومفہوم بیان کئے گئے۔ لیکن آزاد نے جو مفہوم بتایا اسے سب نے پسند کیا اور اس پر تحسین کی۔ آزاد نے کہا کہ ماہ سے مراد مہینہ ہے اور ماہ تمام تیس دن کا ہوتا ہے تیسویں تاریخ کو ہلال دیکھے بغیر کہا جاتا ہے، کہ آج چاند کامل ہو گیا برخلاف اس کے انتیسویں کو یہ نہیں کہا جاتا[3]

آزاد نے کبھی کبھی غیر معروف الفاظ کے تلفظ اور معنی بھی بتائے ہیں۔ مثلاً مسعود بن سعد بن سلمان کی ایک رباعی نقل کی ہے۔

ہموارہ رخ نگارہ ما تو ست نہ گل ۔۔۔ زین روی رخ نگار نکو ست نہ گل

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۳۴، [2] ایضاً ص ۱۸، [3] ایضاً ص ۲۸۹۰

ار رخ دوست باید ای دوست نہ گل　　　زیرا گل چشم ما رخ اوست نہ گل

ؤ کا تلفظ عام طور پر نو ہے۔ اس خیال سے کہ قاری کو الجھن نہ ہو وہ فوراً لکھ دیتے ہیں

اس تلفظ کا نُو بھی ہے، اور سند کے طور پر برہان قاطع کا حوالہ دیتے ہیں۔[1]

شاعر کوری کا ایک شعر ہے۔

یک راہ ز بتیارہ ایمن ازلی آن　　　کہ مدح صاحب خواندم بسان مرزاز

آزاد نے لفظ بتیارہ کی صراحت کی ہے کہ یہ تیارہ بھی ہے جس کے معنی بلا اور آفت کے

ہیں اور تیارہ بھی ہے جس کے معنی غول بیابانی ہے۔[2]

بعض اعتراضات | کہیں کہیں آزاد نے اعتراضات بھی کئے ہیں۔ مثلاً صائب کا ایک

مشہور مطلع ہے۔؟

غیر حق را می دہی رہ در حریم دل چرا　　　می کشی بر صفحۂ ہستی خط باطل چرا

آزاد کا کہنا ہے کہ دونوں مصرع اچھے ہیں لیکن مصرع اول کا استعارہ مصرع

ثانی کے استعارے سے مناسبت نہیں رکھتا۔[3]

سنجر کاشانی کا ایک اچھا شعر ہے۔

کسر گو کہ شیرین دید ز اصطرلاب آئینہ　　　کہ فتح بی ستون از بازوی فرہاد می آید

آزاد کا اعتراض ہے کہ اصطرلاب حوادث کونی کے پہچاننے کے کام میں نہیں آتا۔

یہاں کسی ایسی چیز کا ذکر ہونا چاہئے جو اس کام میں آتی ہو۔ جیسے علم تنجیم، علم رمل، علم شانہ

چنانچہ ان کی رائے میں مصرع یوں کہا جا سکتا تھا بخسرو گو کہ شیرین دیدہ است از شانہ گیسو۔[4]

قدسی مشہدی بقول خود آزاد صاحب سکہ سخن دانی تھے۔ لیکن ان کے قصائد کی

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۱۴۱ [2] ایضاً، ص ۱۸ [3] ایضاً، ص ۲۰۹ [4] ایضاً، ص ۲۶۱

تشبیب کے بارے میں آزاد کی رائے ہے کہ غزل کی طرح اکثر پریشان ہوتی ہے، یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ پل کا راستہ چھوڑ کر ایک ساحل سے دوسرے ساحل کو زقند بھرتے ہیں۔ یعنی مخلص (گریز) کو چھوڑ کر دفعتہً تشبیب سے مدح پر آجاتے ہیں۔ اسے اقتضاب کہتے ہیں۔ اور اس کا اثر طبیعت پر اچھا نہیں پڑتا[۵۸]

اپنے اشعار کی تشریح آزاد نے خود اپنے حالات لکھنے اور اشعار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ فقیر کے بعض اشعار شرح طلب ہیں اس لیے میں ان کی شرح لکھے دیتا ہوں تاکہ اور کہیں رجوع کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ نیچے چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

سفینۂ غزل ہست در نگاہ مرا سواد دست بیاض است سرمۂ مرا

دشت بیاض خراسان میں ایک سرزمین کا نام ہے۔

نخواہم آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را کہ خوش کردم کنار زمزم در کن و مصلیٰ را

حافظ شیرازی کے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے۔ حافظ کے شعر میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ آب، رکنا باد، مصلیٰ۔ میرے یہاں بھی تین چیزیں ہیں۔ زمزم، رکن اور مصلیٰ۔ رکن محدثین کے نزدیک حجر اسود سے عبارت ہے۔ مصلیٰ کے بارے میں قرآن میں آیا ہے۔ واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى اور زمزم و مصلیٰ عین مسجد میں کعبہ کے نزدیک ہیں۔

چہ ناخنی زدہ در دل ہلال الماسی کہ در مواجہہ مصطفیٰ است جلوہ نما

ہلال کی شکل الماس سے تراش کر روضۂ منورہ کی دیوار میں مواجہہ کی جگہ پر لگی ہے۔

فدای خاصیت دادۂ عقیق شوم کہ گر در یگ رو انش علاج تشنہ لبی

---

[۵۸] خزانۂ عامرہ ص ۹۸ ۸ ۴

وادیٔ عقیق ایک مشہور وادی کا نام ہے، جو مدینۂ منورہ کے قریب ہے[1]

بعض اوقات انھوں نے دوسرے شعرا کے اشعار کی تلمیح کی بھی صراحت کر دی ہے، مثلاً ظہیر فاریابی نے ایک قطعہ قزل ارسلان کی خدمت میں پیش کیا تھا جس میں شتر خاص کی درخواست کی تھی۔ اس کے آخری دو شعر ہیں۔

حکایت شتر و ماہتاب و اعرابی | شنودہ ام کہ شنیدہ است شاہ بندہ نواز
مرا کہ در شب افلاس گم شدہ است شتر | بماہتاب قبولت سزد کہ یابم باز

آزاد نے لکھا ہے کہ ان اشعار میں ایک اعرابی کے قصے کی طرف تلمیح ہے۔ اعرابی کا اونٹ اندھیری رات میں گم ہو گیا۔ وہ اس کی تلاش میں حیران و پریشان تھا کہ ناگاہ چاند نکل آیا اور اعرابی نے دیکھا کہ اس کے اونٹ کی مہار ایک درخت سے بندھی ہے اور اونٹ کھڑا ہے۔ وہ بہت خوش ہوا اور چاند کو مخاطب کرکے اس نے دو شعر کہے[2]

دلچسپ واقعات | خزانۂ عامرہ میں بعض دلچسپ واقعات بھی نقل کیے گئے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل واقعہ۔

حاکم لاہوری کی روایت ہے کہ عہد اورنگ زیب میں خان جہاں بہادر کوکہ بادشاہ ناظم لاہور ہوئے تو ایک دن نصرت خان خلف خان جہاں بہادر حویلی دارا شکوہ میں سیر کے لیے گئے۔ شاہ آفریں کو بھی انھوں نے وہاں بلوایا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ترشح ہو رہا تھا۔ نصرت خاں نے اس خوشگوار موسم کی تعریف کی۔ شاہ آفریں نے ارتجالاً یہ دو شعر کہے

خوشا ابری و ابری کم ستیزہ | کہ باران ریزد از وی ریزہ ریزہ
رہ نقش قدم زائل نمی شد | زمین تر می شد اما گل نمی شد

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۱۴۳ [2] ایضاً ص ۵۔۴۔۳

نصیرت خاں نے شاعر کو نواشرفیاں صلہ مناسب خوانی کے طور پر دیں۔[۱]

روایت کی درایت آزاد نے اپنے تذکرے کے ماخذ بتا دئے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان تذکروں یا کتابوں کے بیانات کو پرکھ کر قبول کیا ہے۔ اختلافی مسائل میں انھوں نے صرف روایت سے کام نہیں لیا بلکہ درایت سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً والہ داغستانی نے مسعود سعد سلمان کی ہندی شاعری کا انکار کیا ہے۔ اور دلیل یہ دی ہے کہ ایک غیر ملکی ہندی زبان پر اسقدر عبور حاصل نہیں کر سکتا کہ اس میں شعر کہے اور صاحب دیوان ہو جائے۔ آزاد کہتے ہیں کہ خود والہ کی دلیل کی بنیاد پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسعود نے ہندی میں شاعری کی ہو گی کیونکہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ مسعود کے باپ سعد نے ہندوستان ہی میں شادی کی تھی۔ اس طرح ہندی مسعود کی مادری زبان ہوئی۔[۲]

اسی طرح علم و ادب سے متعلق بعض اور مفید باتیں مثلاً، فارسی و عربی و ہندی بحور، نوادر و فنون وغیرہ اس تذکرے میں ملتی ہیں۔

تاریخی اشارے آزاد کا طبعی رجحان تاریخ کی طرف زیادہ تھا۔ خزانۂ عامرہ میں بھی اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے شعرا کے حالات لکھنے میں اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن نواب آصف جاہ، عماد الملک، مظفر جنگ، صفدر جنگ، شجاع الدولہ، شاہ درانی وغیرہ کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اول الذکر کے سلسلۂ حالات میں انھوں نے مرہٹوں کی اصلیت (ORIGIN) ہو ارتقا و ترقی اور ان کے طاقتور ہونے کے بعد ان کی فتوحات اور چیرہ دستیوں کا ذکر خصوصاً تفصیل سے کیا ہے۔ اکثر و بیشتر واقعات کے جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔ وہ عینی شاہد تھے۔ ولیم جیمیز جو آزاد کے ہم عصر تھے، لکھتے ہیں کہ ان کی

---

[۱] خزانۂ عامرہ ص ۲۹ [۲] ایضاً ص ۱۵،

(آزاد کی) تاریخی تحریریں انگریزوں کی نگاہ میں قیمتی سرمایہ ہیں خصوصاً اس لیے کہ جن واقعات کا انھوں نے ذکر کیا ہے ان کے وہ عینی شاہد ہیں، اور ان مقامات کی سیر کی ہے۔ جن کا وہ ذکر کرتے ہیں[1] ۔ آزاد نے نواب آصف جاہ کے ساتھ مرہٹوں سے جنگ میں حصہ بھی لیا تھا جس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی تالیف مآثر الکرام میں کیا ہے[2] ۔ مرہٹوں کے نسب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ

"مرہٹ عبارت از دیوگیر و اطراف آن است و ساکنان این سرزمین را مرہٹہ گویند و زبان مرہٹی مخصوص این کسان است و ریاست غنیم در قوم بھونسلہ باشد و نسبت بھونسلہ بر اجہای اودی پور می رسد و راجہای اودی پور فوق جمیع راجہای سرزمین راجپوتانہ اند۔ از راجہای دیگر ہر راجہ کہ بر مسند راج می نشیند راجہای اودی پور قشقہ برای او می فرستد و او آن قشقہ افتخار را بر پیشانی ادب می کشد و لقب راجہ رانا است و او نسب خود بنوشیروان عادل می رساند چون سعد وقاص ایران را فتح کرد و اولاد نوشیروان آوارہ شدند یکی از اجداد رانا بہند آمدہ بمرتبۂ راجگی رسید و چون شہربانو دختر یزدجرد بن شہریار نوشیروان باسیری رفتہ در حبالۂ نکاح امام حسین رضی اللہ عنہ درآمد از بطن آن عفیفہ امام زین العابدین رضی اللہ عنہ متولد شد نسل سادات حسینی منحصر در امام زین العابدین است۔ درین صورت قبیلۂ راجہای اودی پور اخوال جمیع بنی اعمام سادات حسینی اند . . . . . یکی از اولاد رانا کہ از بطن دختر نابار بود بسبب ناموافقت برادران از اودی پور برآمدہ بکہسار دکن افتاد و در طرف کرناٹک

---

[1] اسٹوری، پرشین لٹریچر، جلد اول، حصہ دوم ص ۵۹۰، بحوالہ ... جلد ا ص ۶۰۹-۶۹۲

[2] مآثر الکرام، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء، ص ۵-۲۰۴

ساکن شد و از جہت عمدگی خاندان خود با عمدہ ہائے دکن خویشی بہم رسانید و اولاد او دو فرع شد۔ یکی انتوبیہ، دوم بھونسلہ"۔[1]

اس کے بعد انھوں نے شیوا جی اور پیشواؤں کی سیاسی سرگرمیوں کا ذکر تفصیل سے کرنے کے بعد مرہٹوں کے عام عادات و اطوار بیان کئے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے ایک اہم بات یہ لکھی ہے کہ مرہٹوں کے مختصات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے دفاتر و اسناد میں فاروقی سن عربی زبان اور مرہٹی خط میں لکھتے ہیں، اس سنہ کی ابتدا کا آغاز خلافت حضرت عمر فاروقؓ سے یعنی تیرہ ہجری سے کرتے ہیں، اس کی وجہ آزاد یہ بتاتے ہیں کہ مرہٹوں کے جد اعلا عہد فاروقی میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔[2]

مظفر جنگ کے حالات کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنکی سرکار میں نصاریٰ ملازم ہوئے۔ اس سے پہلے وہ اپنی بندرگاہوں میں رہتے تھے اور ان سے باہر قدم نہیں نکالتے تھے۔ نواب نظام الدولہ مظفر جنگ نے نصارائے فرانس کو اپنے یہاں ملازم رکھا اور ان کا اعتماد حاصل کیا۔[3]

معاصرین سے تعلقات | تذکرے سے آزاد کے ان کے بعض معاصرین سے گہرے روابط کا بھی پتا چلتا ہے۔ صرف چند مثالیں نیچے دی جاتی ہیں۔

حاکم لاہوری اور واقف بٹالوی لاہور جا رہے تھے۔ راستے میں اورنگ آباد اور بالاپور کے بیچ میں ان کا سامان لوٹا گیا۔ بالاپور پہنچ کر ان لوگوں نے آزاد کو ایک خط لکھا جس میں ساری سرگذشت تحریر تھی، آزاد نے ہنڈی کے ذریعے کچھ رقم ان کے پاس ۔۔۔۔ بھیجی۔ کوکھاپور پہنچ کر ان لوگوں نے پھر آزاد کے پاس قاصد بھیجا

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۵۹ [2] ایضاً ص ۴۹۔۴۸ [3] ایضاً ص ۶۰

کیونکہ راستہ لمبا تھا۔ وہ لوگ شمالی ہند جا رہے تھے۔ آزاد نے پھر کچھ رقم بھیج دی۔[1]

شاہ آفریں لاہوری کے ساتھ اپنے اور ان کے اخلاص و مودت کا اظہار آزاد نے اس طرح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں سندھ جا رہا تھا، لاہور میں شاہ آفریں سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں وہ ہیر رانجھا کا قصہ نظم کر رہے تھے، مجھے اس کی ایک داستان سنائی۔ جب سندھ سے لوٹا تو پھر ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ مجھ سے تذکرۂ ید بیضا کا نسخہ جو نقش ناتمام تھا، لیا اور اپنی مثنوی انبان معرفت خود اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی، مجھے عنایت کی۔[2]

عبدالوہاب افتخار نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ وارستہ (لاہوری) کا بیان ہے کہ میر غلام علی آزاد کا ایک تذکرہ ہے۔ اس کی بہت سی غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ ہے کہ اشعار عمرو زید کے نام سے اور اشعار زید عمرو کے نام سے منسوب کر دیے ہیں۔ تر بعد افتخار کہتے ہیں کہ وارستہ کی مراد اسی نسخے سے ہے، جو شاہ آفریں نے ان سے لیا تھا۔[3] اس ضمن میں خود آزاد کا بیان بھی قابل غور ہے۔ انھوں نے ید بیضا کے دیباچے میں لکھ دیا ہے کہ شعرا کے اکثر اشعار خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس واضح بیان کے بعد وارستہ کا اعتراض بلا ضرورت ہے۔

حاکم لاہوری نے ایسے فارسی گو شعرا کا ایک تذکرہ لکھا تھا جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے، اس کا نام انھوں نے تحفۃ المجالس، رکھا لیکن آزاد نے اس کا نام مردم دیدہ تجویز کیا اور کہا کہ یہ نام اسم با مسمیٰ بھی ہے اور اس میں ایہام بھی پایا جاتا ہے، چنانچہ وہ

۱؎ خزانۂ عامرہ، ص ۱-۲۔ ۲؎ ایضاً، ص ۲۶-۲۸۔ ۳؎ تذکرۂ بے نظیر مرتبہ سید منظور علی، الہ آباد، سینٹ ہاؤس، ۱۹۴۰ء، ص ۵

تذکرہ اسی نام سے موسوم ہوا۔[1] خود حاکم نے لکھا ہے کہ "این رسالہ را بموجب فرمودۂ میر صاحب آزاد مردم دیدہ نام نہادم"[2] ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور) نے اسے مرتب کر کے شائع کرا دیا ہے۔

آزاد کی زبان | آزاد کی زبان مجموعی حیثیت سے صاف، سلیس اور رواں ہے۔ انداز بیان میں الجھاؤ بالکل نہیں ہے۔ حسن انشا کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ نیچے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں۔

"این دریوزہ گر فیض الٰہی در تمام عمر خود لب بمدح امیری نکشودہ و نامۂ خود بستایش دولتمندی سیاہ ننمودہ۔"[3]

"ہر چند با امرا ارتباط دارم و با رؤسا اختلاط اما سر رشتۂ استغنا نگسیختہ ام و آبروی فقر بہ درِ غنا نریختہ۔ بلی، عندلیب را از مصاحبتِ گل زری و ماہی را از مجالستِ صدف گوہری مطمح نظر نمی باشد و درین معنی زمزمہ می سنجم۔

حبابم مشت من از گوہر منت تہی آمد | نباشد عیب گر خود را بہ دریا آشنا کردم"[4]

(انوری) "کمرِ تحصیل بر بستہ سرمایۂ علوم اندوخت اما وری از رفاہ بر روی روزگار نکشود۔ خریداری متاع سخن از ارباب دول دیدہ در شیوۂ شاعری افتاد و قصیدہ اے بنظم آوردہ از نظر سلطان سنجر سلجوقی گذرانید . . . . سلطان سخن شناس مستحسن داشت و برائے او مشاہرہ و اداری معین فرمود۔ رفتہ رفتہ کار انوری خیلی بالا گرفت۔"[5]

لیکن آزاد نے ایسے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کیے ہیں، جنھیں اہل ایران کو

---

[1] خزانۂ عامرہ، ص ۴۰۰ [2] مردم دیدہ، ص ۱۵، [3] خزانۂ عامرہ، ص ۳
[4] ایضاً، ص ۸ [5] ایضاً۔ ص ۸

دل کرنے میں تامل ہوگا۔ مثلاً

"از مردم آن شہر با سلوکی بسیار معائنہ کرد۔"[1]

"این اشعار برائے معلوم کردن علو مرتبہ مسعود در انشائے شعر عربی کفایہ است۔"[2]
"نکہت خلقش دماغ را شگفتگی آورد۔"[3]

"با سلطان عہد کردہ بود کہ مادام الحیوٰۃ در گفتن تتمہ بہمن نامہ خود را معاف دارد۔"[4]
"..... از ملک سند علاقہ بالکل منقطع گردید۔"[5]

اسی طرح دولتمند امیر کے معنی میں، طبیعت مزاج کے معنی میں، خواہ مخواہ و بجائے خواہی نخواہی، صلات گراں مند وغیرہ صحیح نہیں ہیں۔

خزانۂ عامرہ ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سے لکھا ہوا شعراء کا تذکرہ ہے اور مستند حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں جو تاریخی واقعات، ادبی نکات، اشعار کی تشریح وغیرہ پائی جاتی ہے۔ اس نے اس کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

۱؎ خزانہ عامرہ ص .. ۲؎ ایضاً ص ۱۲ ۳؎ ایضاً ص ۲۲ ۴؎ ایضاً ص ۲۹۲

تذکرہ اسی نام سے موسوم ہوا۔[۱] خود حاکم نے لکھا ہے کہ "این رسالہ را بموجب فرمودۂ میر صاحب آزاد مردم دیدہ نام نہادم۔"[۲] ڈاکٹر سید عبداللہ (لاہور) نے اسے مرتب کر کے شائع کرا دیا ہے۔

آزاد کی زبان | آزاد کی زبان مجموعی حیثیت سے صاف، سلیس اور رواں ہے، انداز بیان میں الجھاد بالکل نہیں ہے۔ حسن انشا کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ نیچے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں۔

"این دریوزہ گر فیض الٰہی در تمام عمر خود لب بمدح امیری نکشودہ و نامۂ خود بستایش دولتمندی سیاہ ننمودہ۔"[۳]

"ہر چند با امرا ارتباط دارم و بارؤسا اختلاط اما سررشتۂ استغنا نگسیختہ ام و آبروی فقر بر در غنا نریختہ۔ بلی، عندلیب را از مصاحبت گل زری در ماہی را از مجالست صدف گوہری مطمح نظر نمی باشد و درین معنی زمزمہ می سنجم۔

حبابم مشت من از گوہر منت تہی آمد | نباشد عیب گر خود را بدریا آشنا کردم"[۴]

"انوری کمر تحصیل بربستہ سرمایۂ علوم اندوخت اما دری از رفاہ بر روی روزگار نکشود۔ خریداری متاع سخن از ارباب دول دیدہ در شیوۂ شاعری افتاد و قصیدۂ بنظم آوردہ از نظر سلطان سنجر سلجوقی گذرانید۔ . . . سلطان سخن شناس مستحسن داشت و برای او مشاہرہ و ادراری معین فرمود۔ رفتہ رفتہ کار انوری خیلی بالا گرفت۔"[۵]

لیکن آزاد نے ایسے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کئے ہیں، جنھیں اہل ایران کو

۱۔ خزانۂ عامرہ، ص ۲۰۰ ۲۔ مردم دیدہ، ص ۱۵، ۳۔ خزانۂ عامرہ، ص ۳
۴۔ ایضاً، ص ۸ ۵۔ ایضاً۔ ص ۸

قبول کرنے میں تأمل ہوگا۔ مثلاً

"از مردم آن شہر بدسلوکی بسیار معائنہ کرد"[1]

"این اشعار برائے معلوم کردن علو مرتبۂ مسعود در انشائے شعر عربی کفایت است۔"[2]
"نکہت خلقش دماغ را شگفتگی آورد۔"

"باسلطان عہد کردہ بود کہ مادام الحیواۃ در گفتن تتمہ ہجو نامہ خود را معاف دارد"[3]
"..... از ملک سند علاقہ بالکل منقطع گردید"[4]

اسی طرح دولتمند امیر کے معنی میں، طبیعت مزاج کے معنی میں، خواہ مخواہ کی جائے خواہی نخواہی، صلات گراں مند وغیرہ صحیح نہیں ہیں۔

خزانۂ عامرہ ایک مخصوص نقطۂ نگاہ سے لکھا ہوا شعراء کا تذکرہ ہے اور مستند حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں جو تاریخی واقعات، ادبی نکات، اشعار کی تشریح وغیرہ پائی جاتی ہے۔ اس نے اس کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

---

[1] خزانۂ عامرہ ص ۸۰ [2] ایضاً ص ۱۷ [3] ایضاً، ص ۲۲ [4] ایضاً ص ۲۹۲

مقالات شبلی جلد پنجم

یہ مولانا شبلی کے اُن مقالات کا مجموعہ ہے جو اکابر اسلام و مشاہیر علم کے سوانح و حالات سے متعلق ہیں، اس میں علامہ ابن رشد، تیتی ...... علامہ ابن تیمیہ اور صاحب خزانۂ عامرہ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ پر بہت معلومات افزا مضامین ہیں،

قیمت :- ۵ - ۳

مینجر دارالمصنفین

سعید نفیسی کے چند تسامحات

(سلسلہ کے لئے دیکھئے معارف جون ۶۰ء)

(۳)

از ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی (؟) فخر الزماں صاحب ریڈر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۴ ۵۔ غزالی چینک (نفیسی ج ۱ ص ۱۱ ۵) نفیسی صاحب نے اس کی تاریخ وفات نہیں دی جو خلاصۃ الاشعار میں موجود ہے "شہور سنہ نہصد وشصت"۔

۵۵) احمد قتالی ظہانی (نفیسی جلد ۲ ص ۸۰۳) "درگذشتہ در ۵۰۸ بودہ است"

نفائس المآثر (برگ ۱۱۴ (ب) رام پور) مولانا بست وششم رمضان سنہ خمس وسبعین وتسعمایۃ در قزوین بعالم بقا انتقال نمودہ"

۵۶۔ شیخ ابو الواحد فارغی خوانی (نفیسی ج ۱ ص ۵۱۶) نفیسی صاحب نے وفات کا ذکر نہیں کیا،

نفائس المآثر (برگ ۴۴ (الف) علی گڑھ) وفاتش در حدود سنہ اربعین وتسعمایۃ دراگرہ بودہ۔ قبرش در خانقاہ شیخ زین است وآن محل ظاہر ومستور است"۔

۵۷۔ نہمی قزوینی (نفیسی ج ۱ ص ۷۶۵) در ۹۹۹ درگذشتہ"

نفائس المآثر (برگ ۱۳۷ (الف) علی گڑھ) وفاتش در قزوین در سنہ

تسع وسبعین وتسعمایۃ وقوع یافتہ"

۵۸۔ نثاری چغتائی (نفیس ج اص ۳۰۳) نفیسی صاحب نے اس کے دیوانے ہونے کا ذکر کیا ہے۔ نفائس المآثر نے اس کا سنہ بھی لکھا ہے:

نفائس المآثر (برگ ۸۴، ب، علی گڑھ): "درشہور سنہ ثمان وسبعین وتسعمایۃ کہ نیدگان حضرت اعلیٰ (اکبر) درناگور نزول اجلال فرمودہ بودند، روزی کوچ از آنجا شاہ نثاری را دست جنون گریبان اختیارش گرفتہ بطرفی برد"

۵۹۔ فرذرہ کابلی (نفیس ج اص ۵۵۱) نفیسی صاحب نے اس کے متعلق کوئی تاریخ نہیں لکھی۔
نفائس المآثر (برگ ۵۳، الف، علی گڑھ)، "دریں ولا کہ سنہ اثنی وثمانین وتسعمایۃ است از کابل روی بدرگاہ جہان پناہ (اکبر) آوردہ"

۶۰۔ کامی اردوبادی (نفیسی ج اص ۷۵۶) "از منشیان دربار شاہ طہماسپ و غزلسرا بودہ"

نفائس المآثر (برگ ۶۶، الف، علی گڑھ): "مکاتبات او کہ از جانب شاہ طہماسپ بحضرت خواندکار پادشاہ روم در وقت آمدن سلطان بایزید بعراق نوشتہ اند تمامی از متانت طبع و قادا و ست کہ در عالم اشتہار دارد .... در بست و ششم ذیقعدہ سنہ تسع وستین وتسعمایۃ در قزوین وفات نمودہ نعش او را بمشہد رضوی بردند"

۶۱۔ کلامی (نفیسی ج اص ۷۶۴) "بدکن رفتہ ودر آنجا ساکن شدہ"

نفائس المآثر (برگ ۷۰، الف، علی گڑھ): "مدتی در دکن بودہ از سلاطین آنجا مراعات یافتہ وبعضی اوقات در سلک ارباب شرع شریف سلسلۂ لطیف مندرج بود در شہور سنہ سبع وسبعین وتسعمایۃ ازین ملک رفت"

۹۲۔ سید نجم الدین ابوالقاسم محمد میانکالی معروف بملا قاسم کاہی (نفیسی ج ۱ ص ۴۱۵)

"در آگرہ در ۲ ربیع الثانی ۹۸۸ درگذشتہ است"

(نفیسی ج ۲ ص ۱۰۹) "در دربار اکبر تہمت ملک الشعرائی یافتہ و یکبار ہزار تنکہ صلۂ غزل با دو داوہ است، وفاتش را در ۹۸۳ و ۹۸۴ نیز ضبط کردہ اند"

قاسم کاہی کی وفات کی خبر صرف دو بار (دروغ و راست) ہمعصر ماخذوں سے ملتی ہے ۔ مگر ہر صاحب ماخذ نے دروغ کی حقیقت واضح کر دی ہے، اور حسن صاحب نے موتوا قبل ان تموتوا کہکر حسن تعلیل کر دیا ہے ۔

نفیسی صاحب نے اس دروغ کے علاوہ دو اور غلط تاریخیں پیش کر دی ہیں، اس کا جواز مشکل ہے، صرف اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ قاسم کاہی کے تین ہمعصروں نے مادہ ہائے تاریخی کہے تھے جن میں سے ہر ایک سے اعداد ۹۸۸ نکلتے ہیں ۔:-

۱۔ از مولانا ابو القاسم بخاری شاگرد ملا قاسم کاہی "رفت ملا قاسم کاہی (ہفت اقلیم)

۲۔ از مولانا عارفی خلف مبارک "زجہاں رفتہ قاسم کاہی" (ہفت اقلیم)

۳۔ فیضی (ملک الشعراء) "دویم از ماہ ربیع الثانی" (دیوان فیضی)

دوسرا نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ ایک غزل پر نہیں، بلکہ قصیدہ لازم فیل پر اکبر نے قاسم کاہی کو ایک لاکھ تنکہ انعام دیا تھا، اس قصیدے کے دو اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں،

تا بفیلان سیل دیدم دلستان خویش را ۔ صرف راہ فیل کردم نقد جان خویش را

قاسم کاہی بپاے فیل آں شہ رخ نہاد ۔ باخت آخر در بساطش خانمان خویش را

ہفت اقلیم (برگ ۵۰۲ (ب) انڈیا آفس)

"بواسطۂ قصیدہ لازم فیلے کہ گفتہ بود یک لک تنکہ صلہ گرفت"

قاسم کاہی کی وفات کے صرف ۱۴ سال بعد کی ہے، ہے،

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مغل پوئٹری: اٹس کلچرل اینڈ ہسٹاریکل ویلیو"

(ہادی حسن)

۶۳- مقیمی سبزواری (نفیسی ج ۱ ص ۳۵۵) حدس می نماید که اسمش محمد مقیم بوده باشد زیرا که در شعر گاہی مقیم و گاہی مقیمی تخلص کرده و بعد از آن بگجرات به هند رفته و پیری را گذرانیده

نفیسی صاحب نے محض اس لئے کہ وہ اشعار میں کبھی مقیم اور کبھی مقیمی تخلص کرتا تھا اس کا نام طے کر لیا کہ محمد مقیم تھا (مقیم، محمد، یا مقیم الدین کیوں نہیں ہو سکتا؟

نفائس المآثر (برگ ۹۰ الف علی گڑھ) در شهور سنه ثمانین و تسعمائة ....

میرزا مقیم با چند امیر دیگر از گجرات بکومک این لشکر آمدند و در عرض سه ماه لشکر جمع ساخته آماده جنگ گشت .... در صباح روز یکشنبه چهارم ماه ذی الحجه جنگ بزرگ عظیم واقع شد. کفار کشته شدند و فتح خوب واقع شد، اما میرزا مقیم که سردار هراول بود بدرجه شهادت فائز گشت"

۶۴- خواجه حسین مروزی (نفیسی ج ۱ ص ۴۰۴) ".... در دربار اکبر مقام بلندی داشت قصیده‌ای ساخته که از هر بیت آن نام سلطان سلیم و تاریخ ولادت او که ۹۷۷ باشد می‌آید و قصیده دیگر در ولادت که از هر بیت آن نام شاه مراد و تاریخ ولادت او ۹۷۸ می‌آید. سرانجام در سال ۹۷۹ از اکبر اجازه گرفت و بکابل رفت و اندکی پس از آن در کابل درگذشت"

نفیسی ج ۲ ص ۹۱۴) سال درگذشتش را برخی ۹۷۹ و برخی ۹۹۹ نوشته‌اند

این روایت دوم درست نمی‌نماید"

ابھی تک نہ ان اوصاف کا ہم نے کوئی مروی کا قصیدہ سنا اور نہ کسی ایسے سلطان سلیم اور شاہ مراد کا نام۔ البتہ مروی نے اکتیس اشعار کا ایک قصیدہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی ولادت کے موقع پر کہا تھا جس کے ہر پہلے مصرع سے اکبر کی تخت نشینی کا ۹۶۳ھ (ثلث وستین وتسعماۃ) اور ہر دوسرے مصرع سے شہزادہ سلیم کی ولادت کا ۹۷۷ھ (سبعین وسبعین وتسعمایۃ) نکلتا ہے، جیسا کہ خود مروی نے اظہار کیا ہے،

نفائس المآثر (برگ ۱۸۱ (الف) علی گڑھ) منتخب التواریخ (ج ۲ ص ۱۲۰۔۱۲۳)
برائے تصحیح و تفصیل ملاحظہ ہو مغل پوئٹری ص ۲۵۲ تا ۲۵۵)

مصرعِ اوّل زدی سال جلوس بادشاہ (= ۹۶۳) — از دویم مولود نور دیدۂ عالم برآر (= ۹۷۷)

پہلا شعر اس قصیدہ کا یہ ہے:۔

للہ الحمد از پی جاہ و جلال شہریٔ (۹۶۳) — گوہر مجد از محیط عدل آمد درکنار (۹۷۷)

مندرجہ بالا ماخذ سے رجوع کرنے پر یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اکتیس اشعار میں سے ایک میں بھی سلطان سلیم کا نام نہیں ہے، اور نفیسی صاحب کے بیان کا یہ جزء بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتا۔

اس قصیدہ کا ایک دو شعر لکھنا ضروری ہوا اسلئے کہ نفیسی صاحب نے زیر بحث شاعر کا تخلص نہیں لکھا یا غلط لکھا حالانکہ شاعر کا تخلص اسکے نام سے زیادہ اہم ہوتا ہے، شہر "مرو" کی نسبت سے مروزی اور مروی دونوں درست ہیں لیکن شاعر نے اپنا تخلص مروی ہی رکھا تھا، جیسا کہ حسب ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے،

یک بیک ابیات مروی بسکہ بے عیب آمدہ (۹۶۳) — ہر یکے جوے زدی مقصود کی دریابی دوبار (۹۷۷)

نہ صرف مرزی کی زندگی میں بلکہ دربار اکبری میں اس قصیدے کی بہت اہمیت ہے کیونکہ
انے میں یہ دوسرا انعامی قصیدہ تھا جس پر اکبر نے گرانبا انعام دیا، اور بدا ونی کے بیان
ابق

"دو لک تنکہ صلہ گرفت"

نفائس المآثر و منتخب التواریخ کے متفقہ بیان اور مثل پوسٹری کی تصحیح کے مطابق مرزی
نے چند اشعار اور بھی کہے تھے جن میں سے ہر ایک کے پہلے مصرع سے سلیم کی تاریخ ولادت اور ہر دوسرے
مصرع سے مراد کی تاریخ ولادت ۹۷۸ (ثمان وسبعین وتسعمائۃ) نکلتی ہے، اس کا بھی ایک شعر
یہاں درج کیا جاتا ہے :-

داد دو شہزادہ بشاہ ایں سپہر چہرۂ آں ہر دو بہ از آفتاب
(۹۷۷ھ) (۹۷۸ھ)

مرزی کے کابل جانے کا سنہ بھی نفائس المآثر اور منتخب التواریخ دونوں میں موجود ہے
ن آخر الذکر کے بیان میں تھوڑی سی الجھن پیدا ہو گئی ہے، اس لئے کہ

منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۱۷۸) "ودر سنہ نہصد و ہفتاد و نہ (۹۷۹) از ہندوستان
ست وطن حاصل کرد، شیخ فیضی کہ تربیت یافتہ او بود "دام ظلہ" تاریخ یافت اس کے اعداد
۹ آتے ہیں، اور یہی (یعنی ۹۸۰) ٹھیک معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ نفائس المآثر سے اُس کی
دیق ہوتی ہے، اگر ۹۷۹ مطلوب ہوتا تو "دام ظلہ" کہا جاتا،

وفات کے متعلق نفیسی صاحب نے دو سنہ لکھدئے ہیں یا کہیں سے نقل کئے ہیں تعجب
تا ہے کہ ۹۷۵ کو قبول اور ۹۹۹ کو رد کرتے ہوئے انھوں نے ایک لمحہ بھی اس پر غور نہیں
یا، کہ جو شخص ۹۷۵ یعنی پانچ سال پہلے مرچکا ہو، وہ ۹۷۸ میں شاہ مراد کی ولادت کا

قصیدہ کیونکر کہہ سکتا ہے،

نفائس المآثر (برگ ۱۸۱ (الف) علی گڑھ)

خواجہ حسین مروی در تاریخ سنہ ۹۸۴ھ اربع و ثمانین و تسعمائۃ بعلت بواسیر طعمۂ

اجل شد "

۶۵۔ محمود مسی محوی (جلد اص ۲۲۴ و جلد ۲ ص ۸۳۴) وطن، تاریخ ولادت، خاندان، مدت ملازمت،

تاریخ وفات نہیں دی گئی، جو نفائس المآثر میں موجود ہے،

نفائس المآثر (برگ ۸۱ (ب) علی گڑھ) "صلش از گچ از نواحی تبریز است محمدی

کہ میر انشائے شاہ طہماسپ است، و استعداد تمام دارد از عشائر اوست، میر محمود بیس

پنج سال است، کہ درین دولت ابدی الاتصال میر انشائے باستقلال است، ولادت

در شہور سنہ ثمان وعشرین و تسعمائۃ بودہ، .... وفاتش در قلعہ سورت سیوم

ذیقعدہ سنہ ثمانین و تسعمائۃ واقع شد"

۶۶۔ میلی ہروی (ج اص ۲۲۴ نفیسی) صاحب نے سنہ وفات نہیں دیا،

خلاصۃ الاشعار :- "ثلاث و ثمانین و تسعمائۃ")

۶۷۔ شفقی بخارائی (ج اص ۵۶۸ و ج ۲ ص ۸۳۶) نفیسی صاحب نے اس

صرف ایک بار ہندوستان آنے کا ذکر کیا ہے،

منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۲۲۸، ۲۲۹) دو مرتبہ در ہندوستان درآمدہ رفت

اسپرنگر نے بھی اس کی تائید کی ہے،

۶۸۔ نیکی اصفہانی نفیسی (ج ۲ ص ۸۳۲)

" در رمضان سال ہزار........... درگذشتہ"

عرفات عاشقین : در تاریخ وفات قائل عرفات، این رباعی که در مرقدش نوشته
بر آورده،

نیکی که بد از جملۂ نیکان زماں　　مرکز شده در دائرۂ کون و مکاں
تاریخ شدش ز بعد رفتن زمیاں　　"نیکی زجہاں رفت نیکی ز جہاں"
(۹۹۲)

۶۹۔ نشانی دہلوی (ج ۲ ص ۸۳۵) "تاریخ درگذشت وے را باختلاف ۱۰۱۸، و
۱۰۱ و ۱۰۲۵ نوشتہ اند"

تزک جہانگیری ص ۸۱-۸۲) در جشن بیجیمیں نوروز جہانگیری (سنہ یکہزار و نوزدہ ہجری
گذشت" جہانگیر کے سامنے سر دربار محفل سماع میں اس کا انتقال ہوا تھا، لہذا اس میں
جہانگیر نے پوری تفصیل لکھی ہے،

۷۰۔ خواجہ بہار الدین سید حسین تجاری متخلص بہ بخاری (ج ۱ ص ۴۰۳)
"در ۹۸۳ تذکرۂ شعرائے فارسی زبان تا عصر خود بنام مذکر احباب تالیف
کردہ است"

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی نے "کتاب خانہ حبیب گنج کی فہرست کے
سلسلے میں (فکر و نظر جنوری ۱۹۶۱ء ص ۴۱) میں اس کے نسخے کا تعارف کرایا تھا، اور
صوف کی فرمائش پر خاکسار نے معارف" ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۰۵ - ۲۲۵) "مذکر احباب
تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ایک مقالہ ہدیۂ ناظرین کیا تھا،
"در ۹۸۳ھ" سے بات کا سر پیر نہیں معلوم ہوتا، یہ آغاز کی تاریخ ہے، یا انجام کی؟
صرف سال بھر میں اُس نے تذکرہ لکھ لیا، مگر وہ تو یہ بھی کہتے ہیں "تا عصر خود" تو وہ کیا تھا؟

اس کا زمانہ کب تک قائم رہا نفیسی صاحب نے آسان سی بات سوچ لی کہ آدم آخورۂ تذکرہ لکھتا رہا ہوگا،

مذکر احباب :-

چوں دریں تذکرہ زبان قلم　　ذکر احباب کرد از ہر باب
تمام و تاریخ سال اتمامش　　گشت ازاں رو "مذکر احباب" (۹۷۴ھ)

مذکر احباب کا تنقیدی جائزہ: "لیکن متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سنہ یعنی ۹۷۴ھ کے بہت بعد تک اضافے کا کام جاری رہا" چنانچہ اس نے خواجہ حسین مروی کے حج سے واپس آنے کا تذکرہ کیا ہے جو ۹۸۰ھ میں واقع ہوا تھا۔ مگر ۹۸۳ھ کی کوئی تاریخ نہیں ملی،

نثاری کا نام:

مذکر احباب: بعد از تولد حضرت ملا اصفہانی کہ از اکابر علماء و محدثین بود تہنیت آمدہ اند، فقیر را والد این کمینہ نزد ایشاں آوردہ نام فقیر را بہاء الدین حسن گذاشتہ اند و این قطعہ را گفتہ بہ خط شریف نوشتہ اند،

خواجہ حسن نقد دل بادشاہ　　خواجہ بہاء الدین کنمش نام
تا ثانی او خواجۂ ابرار باد　　انبتہ اللہ نباتا حسن "

۷۱ - مولانا محمد شریف وقوعی تبریزی (نفیسی ج ا ص ۵۱۳) "در ۱۰۱۸ درگذشتہ است،

منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۳۷۸ - ۳۸۱) وفات شریف وقوعی در ہزار و دو (۱۰۰۲) بود "

....

وفیات

مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ

اہل علم و اصحاب نظر ابھی مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا مرحوم کا خاندان نگرام ضلع لکھنؤ میں صدیوں سے آباد اور اپنی علمی و دینی خدمات کے لحاظ سے قرب و جوار میں ممتاز تھا، مولانا مرحوم کے پردادا مولانا حافظ عبدالعلی نگرامی ایک نامور عالم تھے، مشہور نقشبندی بزرگ قاضی عبدالکریم نگرامی سے بیعت اور صاحب اجازت تھے، یہ قاضی عبدالکریم اپنے ہم نام قاضی عبدالکریم جو اسی کے خلیفہ تھے، حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی کے صاحبزادہ سید محمد کے مرید اور سید محمد عدل کے تربیت یافتہ تھے، اس کے علاوہ مولانا عبدالعلی کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھانجے خواجہ احمد نصیرآبادیؒ سے بھی اجازت حاصل تھی، ان بزرگوں کے اثر نے ان کے اندر توحید کا جوش اور سنت کا غیر معمولی ولولہ پیدا کر دیا تھا، وہ گاؤں گاؤں پھر کر دین حق کی منادی کرتے تھے، اس زمانہ میں شرک و بدعات اور غیر شرعی رسوم کا جال ہر جگہ پھیلا ہوا تھا، مولانا عبدالعلی کے پرتاثیر مواعظ اور دلنشین انداز بیان سے بکثرت لوگ تائب ہوئے اور شیخ سدو کے بکرو اور ہٹیلے کے مرغوں کو چھوڑ کر اور میلے ٹھیلوں کو ترک کر کے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری میں لگ گئے،

حافظ عبد العلی کے بیٹے اور مولانا مرحوم کے دادا مولانا محمد ادریس صاحب بھی اپنے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ میں بہت ممتاز تھے، اپنے والد کے علاوہ انھوں نے مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی، مولانا عبد الرحمٰن پانی پتی، شیخ عبد الحق صاحب تفسیر حقانی سے بھی اکتساب علم کیا، علوم باطنی میں توجہ شیخ وقت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کی پائی، ان سے خلافت عطا ہوئی، اور اس طرح علوم ظاہری و باطنی میں بڑا مقام پیدا کیا، مولانا مرحوم کے والد مولانا محمد انیس نگرامی بھی ایک معروف عالم تھے اور اودھ کے قصبات و دیہات میں ان کے تبلیغی و اصلاحی دورے ہوتے رہتے تھے،

اس طرح مولانا مرحوم کو ظاہری و باطنی علوم وراثت میں ملے اور قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ان کے کانوں میں پڑیں، آگے چل کر انھوں نے اس بیش قیمت ورثہ میں بیش بہا اضافہ کیا اور بزرگوں کے نام اور کام کو دور دور تک پھیلا دیا۔

ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے بزرگوں کے زیر سایہ حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، ۳۲ء میں تعلیم کمل کی، بیعت اپنے والد سے ہو چکے تھے لیکن بعد میں مولانا حسین احمد مدنی سے بھی اجازت حاصل کی اور ان کی مجلس درس سے مستفید بھی ہوئے، مولانا مدنی کے اثر سے ان کے سیاسی شعور میں بھی پختگی آئی اور جرأت و حق گوئی کی عادت پڑی، ذہنی تثقیف و تہذیب کے لیے خود دار العلوم کی فضا اور ماحول ہی کیا کم تھا، مزید یہ کہ استفادہ کا موقع مولانا سید سلیمان ندوی جیسے یگانۂ روزگار سے ملا جن کی نگاہ ہی میں مس خام کو کندن بنا دینے کی صلاحیت تھی، ان کی نگاہ جوہر شناس پہلی نظر میں ذہانت و صلاحیت کو بھانپ لیتی تھی، چنانچہ سید صاحب نے ان کو اپنی خاص تربیت میں لے لیا اور دار المصنفین بلا لیا، یہیں سے مولانا مرحوم کی علمی و دینی شہرت کا آغاز ہوا، معارف میں ان کے مقالات و مضامین، اہل علم کی توجہ کا مرکز بنے، طبیعت کا میلان قرآنی علوم کی جانب شروع ہی سے تھا، چنانچہ اکثر مقالات

اور اس کی تعلیمات سے متعلق تھے، تراجم قرآن، زندیق کی حقیقت، حافظ جلال الدین
ۃ اللہ، ابن جریر طبری، مستشرق نولدیکی اور قرآن، امام ابوالحسن اشعری، کچھ تفسیر
علق، حجر اسود وغیرہ مضامین ان کے اس ذوق وشوق کے شاہد عادل ہیں،
ب کی تربیت ونگرانی میں انھوں نے اس فن میں نمایاں ترقی اور بڑی دسترس
ں، تفسیر ابن القیم ان کی تلاش، محنت کا ایسا شاہکار ہے جس نے دینی وعلمی حلقوں میں
مقبولیت حاصل کی، عرب سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، سات سال تک
ن میں تصنیف وتالیف کی مشق ومہارت کے بعد مولانا مرحوم نے ندوہ کی ضرورت کے
ر سید صاحب کی مرضی ومشورہ سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں شیخ التفسیر کی ذمہ داری
اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے، ندوہ کی ملازمت کے زمانہ میں بعض یونیورسٹیوں سے
ار معاوضہ کی پیشکش ہوئی، مگر وہ ندوہ چھوڑ کر کہیں جانے کے لیے تیار نہ ہوئے، سینکڑوں
ے ان سے کسب فیض کیا، درس قرآن میں شرکت، طلبہ کی آرزو اور وجہ سعادت بن گئی،
لی سی معجزانہ کتاب، بلاغت وفصاحت کا بلند ترین معیار اور پھر مولانا مرحوم کا والہانہ
نفتار، مفسرین کے اقوال وافکار، صوفیہ کے رموز واسرار، درمیان میں سید صاحب کے
تکرار، درس قرآن کو گل افشانی گفتار کا عجیب نمونہ بنا دیتے، سورہ فاتحہ کی تفسیر بالخصوص
ی روز تقریر جاری رہتی، تفسیر ماجدی کا ذکر تحسین کے ساتھ اکثر کیا کرتے، طلبہ کو اس کے
نہ کا مشورہ بھی دیتے، تفسیر میں صرف ونحو کی بحثیں بھی ہوتیں، فصاحت وبلاغت کے مسائل
چھڑتے، عقائد وکلام کے مباحث بھی ہوتے، مگر ان چیزوں میں الجھ کر نہ رہ جاتے بلکہ
ن کی دعوت اور اس کے مقاصد ہر موقع پر پیش نظر رکھتے، مفسرین کے حوالے دیتے، ان کے
ال تائید میں نقل کرتے اور طلبہ کے لیے کسی گوشہ کو تشنہ نہ چھوڑتے، دوران درس آپ جیتا

اور جگ بیتی کے پر لطف واقعات سنا کر خود محظوظ ہوتے، طلبہ کو بھی اس حظ میں شریک کرتے سید صاحب کے ذکر کے وقت ان پر بے خودی و سرمستی کی عجیب کیفیت طاری ہوتی، مزے لے لیکر ان کے واقعات بیان کرتے، آج بھی کانوں میں ان کی یہ صدا گونج رہی ہے کہ "ہمارے سید صاحب یہ فرمایا کرتے تھے"۔

وسیع النظر، وسیع القلب تو تھے ہی وسیع المشرب بھی تھے، تقلید جامد خود کیا کرتے دوسروں سے بھی اس کی توقع نہ رکھتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اس وسیع المشربی میں بڑا حصہ تعلیمات قرآن ہی کی دین تھا۔ ندوہ کے مقاصد سے انھیں صرف قول ہی کی حد تک اتفاق نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ ندوہ کے مقاصد کی سچی تصویر تھے، ندوہ کا ماحول اور سید صاحب کی توجہ نے ان کی فکر کو جلا بخشی تھی۔ ذہن میں ایسی درخشانی، عمل میں ایسی تابانی اور مزاج میں ایسی شگفتگی تھی کہ کیا دوست احباب، کیا تلامذہ و عقیدتمند، سب کے سب ان سے کسب نور کرتے۔ حق یہ ہے کہ ان کی ذات ندوہ کی اساس پر بڑی خوبصورت اور بڑی دلکش عمارت تھی، جس میں قدیم علم و تمدن اور عہد جدید کی بیداری و تازگی دونوں شامل تھیں اور یہی وہ حسن توازن تھا جس نے ان کی شخصیت کو جدید و قدیم کا مرجع بنا دیا تھا، پرانے دیندار بھی ان سے خوش تھے اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی ان کے گرویدہ تھے، ندوہ کا مقصد بھی یہی تھا اور ندوہ کے اس عظیم فرزند کا مشن بھی یہی، کتنے ذہن تھے جو بہک سکتے تھے مگر مولانا مرحوم کے درس قرآن نے ان کو ایمان و یقین کی ایسی مستحکم چٹان بنا دیا تھا جن کو کفر و الحاد کی تیز و تند آندھیاں بھی جنبش نہ دے سکیں۔

مولانا مرحوم کی تقریر و تحریر میں نمایاں چیز شگفتگی تھی، تفسیر تو خیر لیکن کلامی مسائل میں زبان شستہ و شگفتہ رہے یہ ذرا مشکل ہے لیکن شاید یہ اودھ کے قصباتی اور

ندوہ کے ادبی رنگ کی برکت تھی کہ ایسے مواقع پر بھی زبان بڑی دلکش اور مؤثر ہوتی تقریریں عموماً کم کرتے لیکن جب کرتے تو دلوں پر گہرا اثر چھوڑتے، ندوہ کی مسجد کے توسیعی مرحلہ پر انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ ابتک ذہن پر نقش ہے، اسی طرح تعزیتی جلسوں اور طلبائے ندوہ کی انجمن الاصلاح کی محفلوں میں ان کی تقریریں سننے کے لائق ہوا کرتی تھیں۔

بڑے خوش وضع خوش لباس اور خوش گفتار تھے، ہم طلبہ میں یہ بات مشہور تھی کہ مولانا باہمہ ہوں یا بے ہمہ، پان کی نفیس ڈبیا، خوبصورت منقش چھڑی اور لازوال تبسم کبھی ان سے جدا نہیں ہوتے، طلبہ انھیں دار العلوم کی آبرو اور ماضی کی عظمت کا امین سمجھتے تھے اور اس احساس میں وہ غلط بھی نہ تھے،

ندوہ سے ان کے عشق کا حال یہ تھا کہ جشن کے موقع پر ان کی علالت تشویشناک ہو چلی تھی، مرض کی شدت نے ضعف و نقاہت میں بھی تیزی پیدا کر دی تھی، اس کے باوجود ان سے رہا نہ گیا اور معالجوں کی ممانعت کے باوجود ایک کار میں بیٹھکر انھوں نے دار العلوم کے پورے کیمپس کا دورہ کیا، پنڈال اور اسٹیج دیکھا، عمارتوں اور پارکوں پر نظر ڈالی، در و دیوار بلکہ ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھا، در و دیوار پر سبزہ اگ رہا تھا، اس جوشش فصل بہاری میں انھیں غالب کی طرح اپنے بیابانی ہونے کا تکلیف دہ احساس ہو رہا تھا، یہ دورہ دار العلوم کا شاید آخری دورہ تھا، زبان قال سے نہ سہی زبان حال سے وہ چمن والوں کو خوش رہنے اور اپنے آخری سفر پر چلنے کی بات کہہ گئے تھے، ممکن ہے آنسو پلکوں تک آئے ہوں لیکن مانوس تبسم اب بھی ان کے ساتھ تھا، یہ تبسم مجھے اس وقت بھی ان سے جدا نہ دکھائی دیا جب میں آخری بار ان کی عیادت کی غرض سے لکھنؤ میڈیکل کالج پہنچا تھا، بھاری بھرکم جسم اب نحیف و نزار ہو چکا تھا، دل کے مرض نے حالت اس حد تک پہنچا دی تھی، بے اختیار

یہ شعر زبان پر آگیا ؎

ویدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

مگر اس کے باوجود دیر تک نصیحتیں کرتے رہے، جب معلوم ہوا کہ میں دار المصنفین جارہا ہوں تو بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور پھر خاموش ہوگئے، شاید عہد رفتہ کی کچھ کہانیاں یاد آگئی تھیں۔

مولانا مرحوم کی تصانیف کی فہرست زیادہ طویل نہیں، درس و تدریس کی زندگی اس کا موقع بھی کہاں دیتی تھی لیکن اس کے باوجود تفسیر ابن القیم ہی ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے، فکر و خیال کی ہم آہنگی نے انھیں شاہ ولی اللہ دہلوی کا بڑا معتقد بنا دیا تھا، چنانچہ علم کلام میں شاہ صاحب کے رسالہ العقیدۃ الحسنہ کی شرح لکھی جو العقیدۃ السنیہ کے نام سے طبع ہوئی، یہ رسالہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم عربی کے مدارس میں داخل نصاب ہوا، اس کے علاوہ تعلیم القرآن، رسالہ اصول حدیث، قرآن کا مطالعہ کیسے اور بلاکشان اسلام جیسی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ مولانا کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو، سید صاحب کے حوالوں اور حواشی کا ایک قابل قدر تفسیری سرمایہ ان کے پاس محفوظ تھا، اس کی اشاعت بھی قرآنی علوم میں قیمتی اضافہ ہوگی۔

زندگی ان کی قابل رشک رہی پھر موت کیوں نہ قابل رشک ہوتی، جمعہ کا دن تھا شعبان و رمضان کے سے مبارک مہینوں کے عین اتصال کے موقع پر برکتوں کے سایہ میں وہ اپنے رب سے جا ملے، دیکھا تو نہیں لیکن یقین ضرور ہے کہ اپنے خدا سے ملتے وقت بھی وہی لازوال تبسم ساتھ رہا ہوگا، جو خدا کے بندوں کے لیے دل کا آئینہ بنا ہوا تھا ؎

نشان مرد مومن با تو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

ادبیات

غزل

از جناب طفیل احمد صاحب مدنی الہ آباد

ور کیفِ غم جتنا ہی حاصل ہوتا جاتا ہے
مرا ذوقِ جنوں اتنا ہی کامل ہوتا جاتا ہے

جانے کیا اثر پنہاں ہے ساقی کی نگاہوں میں
کہ جس جس پہ نظر پڑتی ہے بسمل ہوتا جاتا ہے

یں کی ذات تھی گویا ضمانت کیفِ ہستی کی
وہ کیا آئے دوبالا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

لب صادق ہو تو مطلوب آجاتا ہے خود کھنچ کر
ہو گر عزمِ سفر ہر گام منزل ہوتا جاتا ہے

رہِ عشق و وفا میں گامزن ہوتے نہ ڈر ہمدم
سفر کا تجربہ منزل بہ منزل ہوتا جاتا ہے

طفیل اس کی توجہ کا اثر ناچیز پر یہ ہے
کہ ذرہ رفتہ رفتہ ماہِ کامل ہوتا جاتا ہے

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

وقت کے ساتھ ساتھ چل وقت کا اعتبار کر
جس سے ملے حیاتِ نو زاویہ وہ اختیار کر

کارگہ جہاں سے دور دسترسِ خزاں سے دور
ایک نیا چمن بنا تکملۂ بہار کر

عشق کی اصطلاح میں زیست فنا کا نام ہے
زیست کا اعتبار یا موت کا اعتبار کر

عقل ہے مصلحت نگر عقل سے چاہئے حذر
دل کے معاملات میں عشق کا اعتبار کر

آتے ہی لب پہ میرے نام مل گئی راحتِ دوام
کوئی خموش ہو گیا آج انہیں پکار کر

اس کی حریم ناز اگر تجھ کو کبھی نصیب ہو دیدۂ و دل کا ذکر کیا جان کو بھی نثار کر
ایک ادائے خاص سے دل پہ گرا کے برق ناز جو ہے بے قرار کر اور بھی بے قرار کر

غزل

از جناب عروج زیدی صاحب

روشنی شرط سفر ہو، یہ ضروری تو نہیں
دن مری راہ گزر ہو، یہ ضروری تو نہیں

جستجو چاہے تو بچ کر بھی گزر سکتی ہے
ہر طرف گردِ سفر ہو، یہ ضروری تو نہیں

زندگی جس کا مہ و مہر بھی کرتے ہیں طواف
وہ فقط رقصِ شرر ہو، یہ ضروری تو نہیں

اے کہ غائب ز نظر مرکزِ ایمان من است
تیرے جلووں پہ نظر ہو، یہ ضروری تو نہیں

انقلابِ سحر و شام کے زیرِ سایہ
غم ہی تقدیرِ بشر ہو یہ ضروری تو نہیں

میری آنکھوں میں تو ہر رخ ابھرتا ہے
وہ بھی آئینہ نظر ہو، یہ ضروری تو نہیں

نگہِ دید طلب کی ہے الگ بات عروج
ہر نظر جانبِ در ہو، یہ ضروری تو نہیں

مطبوعات جدیدہ

نقوش اقبال ۔ ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۳۲۰۔ قیمت للعہ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے عربی مملکت کو علامہ اقبال کے کلام و پیام سے روشناس کرانے کے لئے "روائع اقبال" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اور اردو و انگریزی میں بھی اس کے ترجمے شائع ہوئے، اردو کے پہلے اڈیشن پر معارف میں مفصل تبصرہ ہوچکا ہے، اس دوسرے اڈیشن میں کئی اہم اضافوں کے علاوہ اردو کے نامور انشا پرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے، فاضل مصنف اور ڈاکٹر اقبال میں بڑی فکری ہم آہنگی ہے، دونوں کا مقصد اسلام کی دعوت و اشاعت ملت اسلامیہ کی سربلندی اور دنیا کو یورپ کے مادی و لادینی نظام کی تباہیوں سے بچانا ہے اس لئے مصنف نے اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کے کلام اور ان کی متعدد شاہکار نظموں کا خلاصہ کرکے دراصل اسلام کی اصل روح اور اس کی تعلیمات کا لب لباب پیش کردیا ہے، ان کو قدرت نے اور کمالات کے علاوہ شعر و ادب کا بھی نہایت ستھرا ذوق اور بڑا موثر اور دلکش پیرایۂ بیان عطا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی حکیمانہ اور ساحرانہ

شاعری کی یہ پرسوز، پراثر اور پر کیف ترجمانی دیکھکر بس یہی جی چاہتا ہے کہ ؎

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

مخدوم علی مہائمی۔ مرتبہ مولانا عبد الرحمن پرواز اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۶، قیمت للعہ، پتہ نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ ۴۴۔ جیل روڈ (ایسٹ) ڈونگری بمبئی۔

حضرت مخدوم علی مہائمی آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے علمائے کبار اور صوفیائے عظام میں تھے، یہ کتاب ان جلیل القدر بزرگ کی سوانحعمری ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہے، پہلے صاحب ترجمہ کے وطن "ماہم" کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، اور ان کے خاندان "نوایت" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان کے حالات زندگی تعلیم و تربیت، اشغال و معمولات، وفات اور مزار کے متعلق معلومات درج ہیں۔ آخر میں ان کے علمی کمالات، تصنیفات اور افکار و نظریات پر گفتگو کی گئی ہے۔ مخدوم صاحب تفسیر اور فلسفہ و تصوف میں بہت ممتاز تھے۔ لائق مصنف نے ان کی ان حیثیتوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، آٹھویں باب میں تفسیر رحمانی پر تبصرہ کرکے اس کی اہم خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ مخدوم صاحب قرآن مجید کو منظم و مربوط کلام سمجھتے تھے، نویں اور دسویں باب میں نظریۂ وحدت الوجود کی تشریح و وضاحت کی گئی ہے، اس میں شیخ محی الدین اکبر اور وحدت الوجود کے بارہ میں علمائے اسلام کے مختلف خیالات ذکر کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نظریہ اسلام کے عقیدہ توحید کے منافی نہیں ہے، اسی ضمن میں حضرت شیخ مجدد کے وحدت الشہود کا بھی ذکر آگیا ہے، اور آخر میں مخدوم صاحب نے وحدۃ الوجود کی تشریح میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے، یہ بحث بڑی نازک ہے مگر مصنف نے اس پر معتدل انداز سے بحث کی ہے۔ البتہ انھوں نے مخدوم صاحب کی

بعض تصنیفات کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہونے کی کوئی تصریح نہیں کی ہے، اور حوالے میں قدیم ماخذ کے علاوہ بعد کی تصانیف سے بھی مدد لی ہے، فکر وخیال سے اختلاف اور معمولی فروگزاشتوں کے باوجود کتاب محنت وکاوش سے لکھی گئی ہے، ابھی تک غالباً اردو میں مخدوم علی مہائمی پر کوئی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی تھی اس سے یہ کمی پوری ہوگئی ہے۔ اس میں مخدوم صاحب کی تحریر اور مقبرہ وغیرہ کے عکسی فوٹو بھی دے گئے ہیں۔

صنمکدۂ دلسازِ بیخودی — از جناب عمر انصاری صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت نفیس صفحات بالترتیب ۲۵۴ و ۲۲، مجلد مع گردپوش، قیمت مجلد ۶ روپے، پتہ: مکتبۂ فردوس ادب امین آباد پارک لکھنؤ ۳

جناب عمر انصاری اردو کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں قدیم شاعری کی خصوصیات واعلیٰ روایات کے ساتھ نئے اسلوب اور نئے افکار وخیالات کی گونج بھی سنائی دیتی ہے، انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، "صنمکدہ" غزلوں کا مجموعہ ہے اس میں سنہ ۳۰ء سے سنہ ۶۳ء تک کی منتخب غزلیں شامل ہیں، مصنف نے حسن وعشق اور الفت ومحبت کے لطیف جذبات کی مصوری اور زندگی کے حقائق ومسائل کی تلاش وجستجو بھی کی ہے اور موجودہ دور کے رجحانات ومیلانات کی عکاسی بھی کی ہے۔ اور بقول ان کے "غزل ان کے دل کی آواز ہے" نمونہ کے لئے چند شعر ملاحظہ ہوں:

یہ جنگ حسن وعشق بھی ہے کیا عجیب جنگ — عمریں گذر گئیں نہ کوئی فیصلہ ہوا

اک ترا غم ہے کہ ہوتا ہی نہیں کم ورنہ — چڑھ کے سنتے ہیں کہ دریا بھی اتر جاتا ہے

یہی نہیں کہ بس اک منظرِ تباہی ہوں — میں اپنے عہد کی سرتاقدم گواہی ہوں

کیا چیز ہے نہ جانے یہ مجبوریٔ حیات — کہتے ہوئے ملے مجھے کچھ لوگ دن کو رات

سازِ بے خودی نظموں، اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ نظمیں انصاری صاحب کی فکر کی جولانگاہ اور دردمند و اثر پذیر دل کی صدائے بازگشت ہیں، یہ مختلف واقعات سے متاثر ہوکر کہی گئی ہیں، اور ان میں اس عہد اور ماحول کی مرقع کشی کی گئی ہے، ان سے شاعر کے جوشِ طبع، قوتِ تخیل، شدتِ احساس اور دقتِ نظر و مشاہدہ کے علاوہ اس کی دردمندی، انسان دوستی اور حب الوطنی کا بھی پتہ چلتا ہے، دہرآشوب، بے رحم مہاجن سے خطاب، ہندوستانی کسان، نیچ ذات، گنگا کی بھینٹ اور فریاد میں موجودہ دور کی وحشت و بربریت اور سماجی و معاشی ناہمواری کا دلدوز منظر بیان کیا گیا ہے، جنت کشمیر، دھان کی کھیت کی ایک شام، گومتی، روح کا خطاب، اضطرابِ پیہم، عبد طفلی، یادِ ایام، پپیہا اور شاعر اور نالۂ جرس وغیرہ بھی بڑی موثر اور کامیاب نظمیں ہیں، اور ان سے محاکات اور منظرنگاری میں مصنف کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں رباعیات کا حصہ ہے جنکو مصنف نے اپنی ذہنی آوارگی کا نتیجہ کہا ہے، اور جن کے بارہ میں انکا یہ بجا خیال ہے کہ "میں نے اس صنفِ سخن کو محض نہ بنانے سے زیادہ شاعرانہ بنانے کی سعیٔ بلیغ کی ہے" ہر صنفِ کلام سے شاعر کی زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت فکر و خیال کی لطافت و بلندی، اسلوب و طرز ادا کی جدت و تازگی تشبیہات و استعارات کی دلکشی و رعنائی اور کلام کے اثر و پختگی کا پتہ چلتا ہے، امید ہے کہ اس پرکیف کلام سے اربابِ ذوق لطف اندوز ہوں گے۔

سب کے نبیؐ ۔ مرتبہ۔ مولانا عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۶۰ قیمت ۵۰ پیسے پتہ۔ علمی کتاب گھر، شاہ گنج، جونپور،

مولانا عثمان احمد صاحب نے بچوں کے لیے سیرت طیبہ پر یہ مختصر کتاب سادہ اور آسان زبان میں لکھی ہے، بچوں کیلئے سیرت پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، اس نئی کتاب کا طرز بیان دلچسپ ہے اور جابجا مناسب اشعار سے بھی مزین ہے، اس لیے امید ہے کہ بچے اسکو شوق سے پڑھیں گے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت سے سبق حاصل کریں گے۔ "ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی وادبی وتنقیدی وتاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے
...جو مطالعہ وبصیرت تجربہ ومشاہدہ اور فکر ونظر کے آئینہ دار ہیں شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات
...م کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے،

...اجرین جلد دوم   قیمت: ۱۲-۹

...ر الصحابہ جلد ۶   ″   ۹-۴

...ام حسین کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں
...واقعۂ حزینۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل،
سیر الصحابہ جلد ۷،

...تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،
قیمت: ۱۲-۵۰

...تاریخ اسلام اول (عہدِ رسالت وخلافتِ راشدہ)
قیمت: ۱۲-۵۰

...تاریخِ اسلام دوم (خلافتِ بنی امیہ) ۱۱-۰۰

...تاریخِ اسلام سوم (خلافتِ عباسیہ اول)
قیمت: ۱۴-۰۰

...تاریخِ اسلام چہارم (خلافتِ عباسیہ دوم)
قیمت: ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن   قیمت: ۵-۰۰

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،
قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت   قیمت: ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر   ۴-۷۵
زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیاتِ سلیمان یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی علمی تعلیمی قومی ملی سیاسی حالات وواقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب وطرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیاتِ شبلی کا ثانی، دلکش، دلچسپ قابلِ مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۲۷-۵۰

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف
اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ
اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چہار دیواری
سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مستشرقین کے جن غیرمسلم
فضلا نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی
میں دارالمصنفین کے رفقا محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق
پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

۱۹۳۴ء ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء

۱۹۵۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں، "منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ"

جلد نمبر [illegible] — اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن ـ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

جلد ۱۱۸ ماہ اکتوبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ عدد ۴

مضامین

شذرات

خاکسار ایک طویل عرصہ کی غیر حاضری کے بعد دارالمصنفین کے علمی گلکدہ اور اپنی روح کے عشرتکدہ میں واپس آیا ہے، گذشتہ مارچ میں حکومتِ ہند کی اجازت سے سیرت کی بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کے لئے پاکستان گیا جس کی روداد مئی ۷۶ء کے معارف میں چھپ چکی ہے،

اس سفر میں حکومت پاکستان کی توجہ ایک بار پھر وہاں کے بعض ناشروں کی زیادتی کی طرف دلائی جو دارالمصنفین کی مطبوعات کو غیر قانونی طور پر چھاپ کر اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا رہے تھے، معارف میں پہلے ذکر آیا ہے کہ اس کے خلاف ایک اخباری مہم جناب سید حسام الدین راشدی نے چلائی تھی، جن کو اپنی علمی تحقیق و کاوش کی وجہ سے پاکستان میں اونچا مقام حاصل ہے، انھوں نے دارالمصنفین کی فریاد پاکستان کے وزیر امور مذہبی مولانا کوثر نیازی تک پہنچائی، جو بڑے لائق، اور فاضل اہلِ علم ہونے کے ساتھ، بڑے علم نواز اور علم دوست بھی ہیں، انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اس مسئلہ کی طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی توجہ دلائی، جنھوں نے اپنی معارف شناسی اور ہندوستان سے خیرسگالی کی خاطر اس سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا،

مولانا کوثر نیازی نے پاکستان کے وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ پیرزادہ پر بھی اس معاملہ کی نوعیت کو اچھی طرح واضح کیا، جنھوں نے اپنی فراخدلی سے پاکستانی ناشروں کی بدعنوانی پر اظہار افسوس کر کے اپنی علم پروری کا ثبوت دیا، مولانا ظفر احمد انصاری پاکستان کی قومی اسمبلی کے آزاد ممبر ہیں، وہ ایوان کے بڑے باوقار، با احترام اور قابلِ اعتبار رکن سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے بھی جناب پیرزادہ صاحب سے کئی بار مل کر اس معاملہ کو طے کرانے کی کوشش

فرمائی، بالآخر جناب پیرزادہ صاحب نے کمال عنایت سے اپنی وزارت کو تفصیلات پر غور کرنے کی ہدایت فرمائی،

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ نے خاکسار کو اس کی مطبوعات کا حق طباعت وہاں کے کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ کو دے کر اس کے بدلے میں خاطر خواہ رائلٹی حاصل کرنے کا اختیار دیا تھا، اس کے لئے درخواست مرتب کرتے وقت جناب قدرت اللہ شہاب آئی سی ایس نے مفید قانونی مشورے دیئے، وہ اس وقت محکمہ تعلیم میں ثقافتی امور کے سکریٹری تھے، اب ریٹائر ہو گئے ہیں، بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں، بڑے مذہبی بھی ہیں، اردو کے مشہور شاعر جناب فیض احمد فیض کو بھی اس درخواست سے دلچسپی ہوئی، وہ اس وقت وزارت تعلیم میں تعلیمی مشیر ہیں، جب یہ درخواست وزارت تعلیم میں پہنچی تو اسکے لائق سکریٹری ڈاکٹر محمد اجمل نے اس کی کی طرف پوری توجہ کی، وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں، اُن کا خاص علمی موضوع نفسیات ہے، معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات اور مواعظ کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں مشغول ہیں، جناب قدرت اللہ شہاب کی جگہ پر محکمہ تعلیم کے ثقافتی امور کے سکریٹری جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہوئے تو انھوں نے اپنی غیر معمولی شرافت اخلاق، دل نوازی، عجز و انکسار اور علم نوازی سے اس معاملہ میں ہر طرح کی مخلصانہ کوشش کی، وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہیں، اپنی علمی بصیرت اور قابلیت کی وجہ سے پاکستان میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں،

دفتری کارروائی کے سلسلے میں سب سے پہلے جناب زاہد ملک جوائنٹ سکریٹری وزارت امور مذہبی نے بڑی خوش اخلاقی اور محنت سے اس معاملہ کو آگے بڑھایا، کپتان ابسانی جوائنٹ سکریٹری وزارت تعلیم، جناب محمد زعیم الرحمن اڈیشنل سکریٹری محکمۂ خزانہ اور ان ہی کے محکمہ کے

جوائنٹ سکریٹری جناب امین اللہ نے بڑے لطف وکرم سے نوازا، وزارت تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری حسن شوکت صاحب نے دفتری کارروائی کو جلد از جلد انجام دینے میں پوری مدد کی، شاہ محی الحق صاحب (سیکشن آفیسر محکمۂ قانون) نے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں انیس احمد صاحب (سیکشن افیسر محکمۂ خزانہ) کی وجہ سے دفتری کارروائی میں آسانی ہوئی،

یہ معاملہ آخر میں نیشنل بک فونڈیشن کے حوالہ کیا گیا، جو وزارت تعلیم کے ماتحت نشر و اشاعت کا ایک اہم ادارہ ہے، اس کی شہرت بیرونی ممالک میں بھی پہنچ رہی ہے، اس کے انتظامی امور کے ڈائرکٹر جناب یونس سعید ہیں، جو انگریزی زبان میں اپنی قابلیت کی وجہ سے پاکستان کے علمی حلقہ میں مقبول ہیں، وہ دارالمصنفین کی مطبوعات میں سیرۃ النبیؐ سے کچھ ایسے متاثر تھے کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کے خواہاں ہوئے، مگر جب میں نے اُن سے پہلے خطبات مدراس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اس کے لئے ایسے مستعد ہوئے کہ دن رات کی عرق ریزی کے بعد میرے قیام پاکستان ہی کے زمانہ میں اس کا پورا ترجمہ ختم کر ڈالا، اور خوش تھے کہ ایک اہم اور لائق ثواب کام انجام پاگیا۔ اُن کے ساتھ اُن کے ڈپٹی ڈائرکٹروں میں سے جناب محمد شمیم رضوی، ڈاکٹر اے۔ آر ملک، جناب اکرام قمر، اور منظور احمد صاحبان نے نیشنل بک فونڈیشن اور دارالمصنفین کے درمیان معاہدہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں ہر قسم کا تعاون کیا۔ جس کی شرط یہ قرار پائی کہ نیشنل بک فونڈیشن پندرہ لاکھ پاکستانی روپیہ دے کر دارالمصنفین کی ۱۱۵ کتابوں کا حق طباعت خرید لے، جو صرف پاکستان کے لئے محدود ہو،

اس معاہدہ پر دستخط کرتے وقت پاکستان کے اہم روزنامہ اخبارات، ریڈیو، اور ٹیلی ویژن کے نمایندے موجود تھے، اُن کو مخاطب کرنے کا بھی موقع ملا۔ پاکستان کے ارباب حکومت نے ازراہ کرم وانصاف دارالمصنفین کو اپنے یہاں کے بعض ناشروں کی بیجا حرکتوں سے جس طرح بچایا اس کا دلی شکریہ اس موقع پر ادا کیا۔ جب اس معاملہ کی کارروائی شروع کی گئی تھی، تو ہمارا ہندوستانی سفارت خانہ باضابطہ طور پر پاکستان میں قائم نہ تھا، لیکن کراچی میں معاہدہ پر دستخط ہوا تو اس کی عکسی نقل اپنے سفارتخانہ کو اسلام آباد بھیج دی۔

دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا غیر معمولی اثر پاکستان میں اب بھی موجود ہے، اس ادارہ کے معمار استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ وہاں کی سرزمین میں ابدی نیند سو رہے ہیں، دونوں بزرگوں کی روحوں نے فضا کو ہموار کیا، وہاں کے تمام اخبارات خصوصاً ڈان، حریت، نوائے وقت، جنگ، اخبار جہاں اور چٹان نے یہ صدا بلند کر رکھی تھی، کہ شبلی وسلیمان کے ادارہ کو نقصانات نہ پہونچنے پائیں، وہاں کے ناشروں کی بدعنوانیوں کو ڈان کراچی نے طباعتی قزاقی، اور چٹان لاہور نے چوری اور سینہ زوری قرار دیا،

اسلام آباد کے قیام میں جناب شریف الحسن ڈائرکٹر جنرل پاکستان سنٹر کے حسن سلوک سے متاثر رہا، عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں کے اشعار جو اُن کی نوک زبان پر ہیں، اس سے اُن کی قوت حافظہ کا معترف ہوا، جناب افتخار احمد شروانی ڈائرکٹر جنرل نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کی کرمفرمائیوں سے بہتیری مشکلیں آسان ہوئیں ڈاکٹر علی اکبر جعفری ڈائرکٹر مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

ایران میں لیکن اپنوں کی طرح ملنے میں سبقت کی، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر رشید جالندھری نے ہرطرح کی قدردانی کی، پروفیسر قدرت اللہ فاطمی (ڈائرکٹر آر سی۔ ڈی) نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ جو خاطر و مدارات کی، اس سے سفر میں حضر کا مزہ ملتا رہا۔ اسکی خوشگوار یادیں ہمیشہ باقی رہیں گی، اُن کے ڈپٹی ڈائرکٹر جناب امین احمد نے بھی پوری خاطرداری کی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی (لائبریرین اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ) کی پُرکیف اور پُر از معلومات علمی صحبتوں کی وجہ سے طویل قیام کی گرانی محسوس نہیں ہوئی، اس ادارہ کے افسران اسپشل ڈیوٹی جناب احمد بشیر کو ہر موقع پر خلیق اور ملنسار پایا، یہاں کے فیلو حافظ محمود غازی اور اُن کے چھوٹے بھائی حافظ محمد غزالی کی سعادت مندی اور تواضع راحتِ جان بنی رہی، ہندوستان کے مشہور عالم مولانا محمد سورتی مرحوم کے لائق فرزند اور ندوۃ العلماء کے مشہور استاذ جناب خلیل عرب کے داماد مولانا عبدالرحمٰن سورتی اپنے مذہبی خیالات کا برملا اظہار کرکے محظوظ کرتے رہے، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی (سابق اڈیٹر فکر و نظر) احمد خاں صاحب (ڈپٹی لائبریرین اور اب لائبریرین اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ) محمد فاضل شمسی صاحب (فیلو اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ) اور جناب علی جونپوری (نمایندہ خبر رساں ایجنسی سعودی عرب) نے پذیرائی میں برابر پیش قدمی کی، محمد طیب صاحب (مونوپولی کنٹرول) نے خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، پانچ مہینے کی میزبانی عزیزی مصباح الہدیٰ انفارمیشن آفیسر حکومت پاکستان نے کی۔ اور کسی لمحہ کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا،

واپسی پر مذکورۂ بالا معاہدہ کی تفصیلات کی اطلاع اپنی مرکزی، اور ریاستی حکومتوں کے ساتھ ضلع کے حکام کو بھی دی،

مقالات

افغانستان میں آٹھ روز

از جناب پروفیسر سید حسن صاحب پٹنہ

(۲)

مسجد جامع ہرات کی زیارت کے بعد ہم لوگ پھر ہوٹل موفق کو واپس آگئے اور یہاں نصف ساعت آرام کرنے کے بعد گازرگاہ کو روانہ ہوئے، جہاں خواجہ انصاری کا مزار ہے، قصبہ گازرگاہ ہرات سے تین کیلومیٹر دور شمال کی جانب کوہستانی علاقے میں واقع ہے، وہاں پہنچنے پر درگاہ کے متولی جناب میر محمد افضل اور گورنر جناب غلام علی آئین اور دوسرے علما و فضلا نے ہمارا استقبال کیا، اور ہمیں ایک عمدہ عمارت کے اندر لے گئے جس کے صحن میں متعدد قبریں ہیں، خواجہ انصاری کی قبر ایک چوبی ضریح کے اندر صحن سے کچھ بلند مقام پر بنی ہوئی ہے، قبر کی لمبائی تین میٹر کے قریب ہے، اس پر مخمل کی چادر چڑھی ہوئی ہے، مرقد خواجہ سے ملحق سلطان غیاث الدین غوری نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا جو چنگیز خاں کے حملوں کے دوران میں ویران ہو گیا بعد میں شاہرخ مرزا کے حکم سے اسی مقام پر ایک عالیشان و نفیس عمارت بنائی گئی، جس کو کاشی کاری سے مزین کیا گیا ہے۔ یہ عمارت

ہنوز موجود ہے، اور اس میں لوح مزار و دیگر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ خواجہ انصاری کے مرقد کے پاس نیچے صحن میں ان کے دو بیٹوں شیخ اسماعیل اور عبدالہادی کی قبریں ہیں۔ عبدالہادی باطنیوں کے ہاتھوں سے ہرات میں شہید ہوئے تھے، اُن کی لاش اُن کے گھر میں دفن کر دی گئی تھی، بعد میں ان کے ارادتمند اسے وہاں سے اکھاڑ کر گازرگاہ لے آئے اور یہاں دفن کر دیا۔ مقبرۂ خواجہ کے نیچے سیاہ و سفید سنگ مرمر پر قرن نہم ہجری کے مشہور خطاط سلطان علی کے قلم سے لکھے ہوئے کتبے ہیں، اس صحن میں خاندان تیمور کے شاہزادوں کی چار قبریں ہیں، سلطان حسین مرزا کے بیٹے غریب مرزا کی قبر پر ایک ہفت قلمی کتبہ ہے جو سات سال میں تیار ہوا تھا، اور جو حکاکی و کندہ کاری کے لحاظ سے مشرقی اور اسلامی ہنر کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔

مزارات کے باہر ایک پُر فضا باغ ہے، جسے امیر علی شیر نوائی نے اس زمانے میں لگوایا تھا، جب وہ گازرگاہ میں عزلت نشیں اور اس درگاہ کا متولی تھا، اس باغ میں دو عمارتیں بھی نمکدان کی شکل کی بنوائی تھیں جن میں سے ایک سیلاب میں خراب ہو گئی ہے، دوسری موجود ہے، اسی عمارت میں ہم لوگوں کے لیے شام کی چائے کا اہتمام کیا گیا تھا، جمی ہوئی بالائی یہاں کی خاص چیز ہے، اس کے علاوہ کشمش، بادام، پنیر، روٹی کے ٹکڑے میزوں پر سجا دیے گئے تھے، ایک قسم کی مٹھائی بھی تھی، جو کھوے سے بنی ہوئی تھی اور جو نقل کی شکل کی ہوتی ہے، اور جسے یہاں نقل ہی کہتے ہیں۔

گازرگاہ کی زیارت کر کے ہم لوگ ہوٹل کو واپس ہوئے، راستے میں خواجہ عبداللہ انصاری کے استاد و سرپرست ابواسمٰعیل احمد بن حمزہ صوفی معروف بہ شیخ عمو کی قبر کی بھی زیارت ہوئی جو مزار خواجہ کے شمال میں کوہ زنجیرگاہ کے دامن میں ایک پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ وہاں سے ہم لوگ مغرب کے قبل ہوٹل کو لوٹ آئے اور مغرب کے بعد ہم لوگوں کا

قافلہ پھر گازر گاہ کی طرف روانہ ہوا، کیونکہ وہاں متولی کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت تھی، اور اس کے بعد ایک محفل عرفانی کے انعقاد کا پروگرام تھا، گازر گاہ کے راستے میں جابجا روشنی کی گئی تھی، اور پولیس کے سپاہی تعینات تھے، درگاہ پہنچ کر ہم نے بجلی کی روشنیوں میں مرقد خواجہ پر پھر فاتحہ پڑھا، اس کے بعد نمکدان کی بالائی منزل پر کھانے کو گئے، جہاں ہند...... مشرقی قاعدے سے فرش پر دسترخوان بچھا ہوا تھا اور اس پر کھانے کی تقریباً حسب معمول چیزیں رکھی ہوئی تھیں، البتہ یہاں دو چیزیں نئی تھیں ایک توشولہ، اور دوسرے دہی، دونوں ہرات کی مشہور غذا شمار ہوتی ہیں، مجھے اشتہا نہ تھی، صرف تھوڑا سا شولا، چکھا پسند نہ آیا، البتہ دہی بہت خوب تھا اور اسے میں نے کسی قدر زیادہ کھایا۔

ساڑھے نو بجے رات کو کھانا ختم ہوا تو ہم لوگ ایک خانقاہ میں جمع ہوئے جو مزار خواجہ کے جنوب مشرق میں اسی سے ملحق ہے، خاصی بڑی عمارت ہے۔ اس کی چھت گنبد، اور دیواروں پر طلائے محلول اور لاجورد سے نقش ونگار بنے ہیں اور محرابوں پہ کلام اللہ کی آیتیں خوبصورت حروف میں تحریر ہیں، اسے عہد شاہرخ کی سقف سازی کا نادر نمونہ تصور کیا جاتا ہے مشہور ہے کہ جب اینٹ جمانے اور پلاسٹر لگانے کا کام مکمل ہو گیا تھا، تو ایک رومی نقاش شاہرخ کے دربار میں آیا تھا، اور اس نے ہرات کے نقاشوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا، میں نے سمجھا تھا کہ یہاں مجلس سماع منعقد ہوگی، لیکن اس محفل میں خواجہ انصار کے احوال زندگانی اور مقام عرفانی کے متعلق مختلف علما کی تقریریں ہوئیں، نظمیں پڑھی گئیں اور الٰہی نامہ اور مناجات کے جملے پڑھ کر سنائے گئے، ۱۱½ بجے کے بعد یہ محفل ختم ہوئی اور ہم یہاں سے رخصت ہو کر پھر نمکدان میں جمع ہوئے۔ جہاں متولی درگاہ کی طرف سے

سفر آئین نے تمام مہمانوں کو کاغذ میں لپٹا ہوا ایک ایک پیکٹ تبرک کے طور پر مرحمت
کیا۔ میں نے اسے بعد میں کھول کر دیکھا تو اس میں دو ریشمی رومال تھے ایک اچھا بڑا جس پر
یادگار ہزاروں سال ولادت خواجہ عبداللہ انصاری بناوٹ کے اندر منقوش ہے اور
دوسرا چھوٹا سادہ سفید ہے، یہ دونوں ہرات کے بنے ہوئے ہیں تقسیم تبرک کے بعد ہم
ہوٹل واپس آگئے۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد بقیہ مقامات و مزارات کو دیکھنے کے لیے نکلے۔ ہوٹل
کے باہر فٹ پاتھ پر سب مہمانوں کے جمع ہونے کے انتظار میں کھڑے تھے تو ایک نوجوان شخص
جس کی داڑھی بڑھی ہوئی اور کپڑے کچھ گندے تھے، میرے پاس آیا اور مجھے بغور دیکھ کر اس نے
اردو میں پوچھا کہ کیا آپ ہندوستان سے آئے ہیں؟ جب میں نے اثبات میں جواب دیا
تو اس نے بتایا کہ وہ حیدرآباد دکن کا رہنے والا ہے، اور ام۔ بی۔ بی۔ اس پاس ڈاکٹر ہے
اُس کا نام اکبر علی ہے، وہ ملازمت کی غرض سے ایران گیا تھا، لیکن چونکہ اُس کے پاس
ٹورسٹ ویزا ہے ایران میں ملازمت نہیں مل رہی ہے، اگر عام طرز کا ویزا مل جائے تو اسے
ملازمت مل سکتی ہے، وہ اس قسم کا ویزا ہرات میں مقیم ایرانی قونصل سے حاصل کرنے کی
غرض سے آیا ہے، لیکن دو تین روز سے قونصل سے ملاقات کی کوشش کر رہا ہے، قونصل
خانے کے چپراسی اسے قونصل سے ملنے نہیں دیتے اگر میری وساطت سے اُس کی مشکل حل ہو جائے
تو بہت ممنون ہوگا، میں نے اس کا پاسپورٹ دیکھنے کو مانگا تاکہ یہ اطمینان کر لوں کہ وہ
صحیح کہہ رہا ہے، اُس نے فوراً اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات دکھائے جنھیں دیکھ کر
اُس کی راست بیانی کا یقین ہوگیا، میں نے اُسے دلاسا دیا اور کہا کہ افغانستان میں ایرانی
کلچرل کونسلر (رایزن فرہنگی) ڈاکٹر حسین خدیو جم سے ملا دوں گا جو ہمارے ساتھ

آئے ہوئے ہیں اُن کے ذریعے آپ کا کام ہو جائے گا، چنانچہ جب ڈاکٹر خدیوجم ہوٹل سے باہر آئے تو میں نے ڈاکٹر اکبر علی صاحب کو ان سے ملا کر مدد کرنے کی سفارش کی، انھوں نے ڈاکٹر منصوری کے نام جو ہرات میں ایرانی قونصل ہیں ایک سفارشی خط لکھ دیا، اور یہ بھی وعدہ کیا کہ ملاقات کے وقت منصوری صاحب سے زبانی بھی سفارش کر دیں گے، دوپہر کے کھانے کے وقت منصوری صاحب سے ملاقات ہو گئی اور انھوں نے میرے سامنے ڈاکٹر اکبر علی کی سفارش کر دی۔ ایرانی قونصل نے مدد کرنے کا وعدہ کیا، امید ہے کہ اکبر علی صاحب کو مطلوبہ ویزا مل گیا ہوگا۔

آج کے پروگرام میں سب سے پہلے ہم شیخ یحییٰ ابن عمار سجستانی کے مقبرے کی زیارت کو گئے، شیخ ابن عمار سجستانی کا خواجہ عبداللہ انصاری کی تربیت وتقویت میں بڑا حصہ ہے، جب تک وہ زندہ رہے کوئی شخص خواجہ انصاری پر بحث ومجادلہ میں غالب نہیں آیا، ان کو لوگ خواجہ غلطان کہتے ہیں، ہرات کے لوگ اور زائرین قبر پر فاتحہ ودعا کے بعد مزار کے پیچھے ایک چوکور گڑھے میں سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر زمین پر لوٹ پوٹ کر آگے بڑھتے ہیں، اس طرح لوٹتے ہوئے اگر کوئی مغربی کونے پر پہنچ جائے، تو وہ اپنی مراد حاصل کرے گا۔ اور اگر شمال مغرب کونے پر جا پہنچے تو اُس پر خیرات واجب ہو جاتی ہے، ہم لوگوں کے سامنے دو شخصوں نے لوٹ کر دکھایا۔

خواجہ غلطاں کے مقبرے کی زیارت کے بعد ہم ایک اور بزرگ کے مزار کی زیارت کو گئے، ان کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں، یہ مزار ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے، جس پر چڑھنا میرے لیے بہت دشوار تھا، اس لیے میں نے نیچے ہی سے فاتحہ پڑھ لینا مناسب سمجھا، باقی لوگ موٹروں سے اُتر کر ٹیلے پر چلے گئے، میں نے ادھر اُدھر نظر ڈالی تو سامنے

دو تین مٹی کے مکانات دکھائی دیئے، ایک کے دروازے پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی کسی کام میں مشغول تھیں، میں نے سوچا کہ جب تک ساتھی لوگ مزار کی زیارت کر کے واپس آئیں میں ان مکانات کے طرز تعمیر اور مکینوں کے وضع سکونت کا اندازہ کر لوں، چنانچہ میں نے موٹر ڈرائیور سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو وہ مجھے ساتھ لیجانے پر راضی ہوگیا۔

یہ مکانات بیس پچیس قدم کے فاصلے پر تھے، ڈرائیور نے ان عورتوں سے کچھ کہا، دو عورتیں دوسرے مکان میں چلی گئیں اور میں ڈرائیور کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہوا، اس مکان میں تین چار کوٹھریاں تھیں، جن کی دیواریں مٹی کی تھیں، چھت بھی مٹی کی اور قبہ دار، ایک کوٹھری کا قبہ گر گیا تھا، اس کوٹھری سے بھیڑوں کی بو آرہی تھی۔ غالباً یہاں بھیڑ رکھے جاتے ہوں گے، باقی کوٹھریوں میں کوئی سامان نظر نہیں آیا، ہر طرف خستگی اور افلاس کا ساں تھا، جو عورتیں دروازے پر بیٹھی تھیں، اور مجھے دیکھ کر ہٹ گئی تھیں ان کے لباس سے بھی ان کی غربت کا اندازہ ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سب لوگ فاتحہ پڑھ کر لوٹ آئے اور ہم سب موٹروں میں سوار ہو کر آگے چلے، چند منٹ میں فارسی کے مشہور شاعر اور نامور عارف وصوفی مولانا عبدالرحمٰن جامی (متوفی سال ۸۹۸ھ) کی آرام گاہ پر پہنچے جو ایک کھلے اور پُر فضا مقام پر واقع ہے، مرقد ایک سنگی چوکھٹے کے اندر ہے، جس کے چاروں طرف اشعار تحریر ہیں۔

لوح تربت پر سال ہائے ولادت و وفات مرقوم ہیں۔ مزار پر پستہ کا درخت ہے جس سے قبر پر سایہ رہتا ہے، نیچے صحن میں اور بھی قبریں ہیں، ان ہی قبروں میں سے ایک قبر مقدسۃ اللہ کر بزرگ حضرت مولانا

عبدالرحمٰن جامی کے بھائی مولانا محمد (متوفی ۸۸۸ھ) کی اور دوسری ان کے بھانجے اور فارسی کے مشہور شاعر مولانا عبداللہ ہاتفی کی ہے۔ اسی مقام میں ایران کے باکمال مصور کمال الدین بہزاد (متوفی بسال ۹۴۳ھ) کی قبر بھی ہے۔ مقبرۂ جامی کے جنوب ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، جس کے رواق اور ایوان پر قرآن پاک کی سورتیں بخط طغرا اور جامی کے اشعار بخط نستعلیق لکھے ہوئے ہیں۔ مقبرۂ جامی کے متصل اتر جانب ایک باغ ہے، جسے دسویں صدی ہجری میں لگایا گیا تھا۔

آرام گاہ جامی کے قریب ہی بیس پچیس کیلو میٹر کی دوری پر امام فخرالدین رازی کی آرامگاہ ہے، اس کی وضع مقبرۂ جامی سے مشابہ ہے صندوق مزار کے چاروں جانب امام رازی کا سال ولادت و سال وفات تحریر ہے اس قبر کے اوپر بھی ایک درخت پستہ کا سایہ ہے، مزار کے مغرب میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے، جس کے ایوان و مدخل کی محرابوں پر آیات قرآنی لکھی ہوئی ہیں۔

ان مقبروں کی زیارت کے بعد ہم مصلا، دیکھنے گئے، ایک مسجد نما عمارت تھی جسے ملکہ گوہر شاد نے بنوایا تھا، اب یہ عمارت ویران ہو چکی ہے، صرف ایک مینار باقی رہ گیا ہے۔ اسی کے متصل امیر علی شیر نوائی کا مقبرہ ہے جو ایک باغ میں واقع ہے، اسی باغ میں گنبد سبز کے نیچے ملکہ گوہر شاد کی آرام گاہ ہے، اسی مقام پر ملکہ کے بیٹے بایسنغر مرزا اور پوتے مرزا علاء الدولہ کی بھی قبریں ہیں۔ یہ علاقہ شہر کے بالکل متصل ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب مقابر و مساجد کی زیارت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ہم ہوٹل موفق کو واپس آگئے، ہمیں یہ ہدایت دی گئی کہ ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد اپنے سامان سمیت ہم باغ جمہوریت چلیں گے، جہاں "تحت صفر" میں والی ہرات کی

وقت سے چاشت کی دعوت ہے، پھر وہاں سے سیدھے ہوائی اڈے کو روانہ ہو گئے، چنانچہ اسی ہدایت کے مطابق ہم ساڑھے بارہ بجے "باغ جمہوریت" پہنچ گئے، یہ نہایت دلکشا باغ ہے جس میں سرسبز پیڑ پودے اور خوشنما پھول لگے ہوئے ہیں، اس کے ایک کنارے ایک دو منزلہ عمارت "تخت صفر" نامی ہے۔ اسی عمارت کی بالائی منزل پر ہمیں لیجا کر بٹھایا گیا، جہاں بہت سے مقامی معزز اصحاب بھی موجود تھے، ہمارے سامنے پستہ، بادام اور ٹافی کی تشتریاں میزوں پر رکھی تھیں تاکہ ہم کھانا شروع ہونے سے پہلے ان کا شغل کرتے رہیں، موسیقی اور تفریحی پروگرام بھی تھا، ایک شخص نے چڑیوں کی آوازوں کی نقلیں بڑی خوبی کے ساتھ اتاریں، پھر غزلیں سنائی گئیں اور ایک ریڈیو آرٹسٹ ملیو محبوب نے خواجہ عبداللہ انصاری کی مناجات اور الٰہی نامہ کے کچھ حصے دلکش لہجے میں سنائے، اس کے بعد ہم نچلی منزل میں گئے جہاں ایک ہال میں میزوں پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر اوپر کی منزل میں آگئے، یہاں ہماری تواضع آئس کریم سے کی گئی۔ آخر میں والی ہرات جناب غلام علی آئین نے بیرونی مہمانوں کو نام بنام پکار کر کاٹھ کا ایک بند ڈبا منقش کاغذ میں لپٹا ہوا تحفۃً عنایت کیا، ایک صاحب نے اسے وہیں کھول کر دیکھا تو اس میں شیشے کا ایک گلدان تھا جس میں روغن چڑھایا ہوا ہے اور "بیادگار ہزارہیں سال تولد خواجہ عبداللہ انصاری" تحریر ہے، ہم نے یہ تحفہ شکریے کے ساتھ لیا اور رخصت ہو کر تقریباً ڈھائی بجے ہوائی میدان پہنچ گئے، والی ہرات بھی ہم لوگوں کو الوداع کہنے یہاں تک آئے، لیکن معلوم ہوا کہ کابل کا موسم خراب ہے، طوفانی ہوا چل رہی ہے، ایسی حالت میں طیارہ کو پرواز کرنے کی اجازت نہیں ہے، تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی یہی

ہموار رہا۔ مجبوراً ہم لوگ پھر ہوٹل موفق کو واپس چلے آئے اور طے پایا کہ کل صبح سویرے پھر ہوائی میدان چلے چلیں گے۔ مقررہ پروگرام میں خلل پڑجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام کو کابل میں ایرانی سفارت خانے میں مہمانوں کی پذیرائی کے لیے جس ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا ہم لوگ اس میں شریک نہ ہو سکے۔

جس وقت ہم لوگ ہوٹل موفق کو واپس آئے چار بج چکے تھے ابھی شام ہونے میں خاصی دیر تھی، اس لیے میں نے سوچا کہ اس مہلت میں ہرات کے بازار کی سیر کرلی جائے چنانچہ میں اور ایک عراقی نمایندہ ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری، افغانی میزبان ڈاکٹر امیر محمد اشیر کی رہنمائی میں ہوٹل ہی کے آس پاس جو بازار کا علاقہ ہے اس کو دیکھنے نکلے۔ یہ بازار ایک کشادہ سڑک کے دونوں جانب واقع ہے، دونوں طرف پیادہ رو یعنی فٹ پاتھ بھی ہیں۔ ہم کئی دکانوں میں گئے خصوصاً کپڑوں کی دکانوں میں یہاں بیرونی ممالک کے منسوجات خاصی مقدار میں موجود ہیں، ڈاکٹر العمری نے جاپان اور ایران کے بنے ہوئے اطلس اور ریشمی کپڑے خریدے، ہم ایک کتاب فروش کی دکان میں بھی گئے یہاں زیادہ تر ایرانی مطبوعات فروخت کے لیے موجود تھیں۔ دکانوں میں خریدار ور بھی خاصی تعداد دیکھی فٹ پاتھ پر بھی دست فروشوں کی دکانیں ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے ہمارے ہندوستان کے شہروں میں دیکھی جاتی ہیں۔ بازار کی ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ سب دکانیں ایک قطار میں ہیں اور بیشتر میں شیشے لگے ہوئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں برف باری ہوتی ہے۔

مغرب کے وقت ہم ہوٹل لوٹ آئے، رات گذار کر صبح کو ناشتہ کے بعد ہم ہوائی اڈے کو روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کابل کا موسم ہنوز خراب ہے،

وہاں طیارہ نہیں اتر سکتا۔ اب سب لوگ شش و پنج میں پڑ گئے کہ کیا کیا جائے، قافلہ کے سربراہ ڈاکٹر زدوان فرہادی نے کابل میں وزیر اطلاعات سے بذریعہ وائرلیس رابطہ قائم کرکے رائے پوچھی، انھوں نے مشورہ دیا کہ ہوائی جہاز کا پائلٹ جو کہے اس پر عمل کرنا چاہیے، پائلٹ کی رائے یہ تھی کہ کابل جانا تو ممکن نہیں ہے، قندھار کا موسم بھی خراب ہے، طیارہ قندھار جا سکتا ہے، وہاں پہنچ کر اگر اس وقت تک موسم موافق ہو گیا تو کابل کی طرف پرواز کی جائے گی، چنانچہ ہم لوگ طیارہ میں سوار ہو گئے، اللہ کا نام لے کر پرواز شروع کی گئی، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہمارا طیارہ چھوٹا صرف ایک انجن والا تھا، اس لیے زیادہ بلندی پر پرواز نہیں کرتا تھا، لہذا زمین پر کی چیزیں دھندلی دکھائی دیتی تھیں۔ راہ میں معلوم ہوا کہ ہم چشت کے اوپر سے پرواز کر رہے ہیں، چشت سے میرا روحانی تعلق ہے، میری نانی مرحومہ کے اسلاف حضرت خواجہ مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفا میں سے تھے، میرا ارادہ تھا کہ میں چشت کی بھی زیارت کروں گا، لیکن یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، پھر کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ ہم مزار شریف کے قریب سے پرواز کر رہے ہیں، مزار شریف افغانستان کا مقدس شہر ہے، مشہور ہے کہ یہاں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار مبارک ہے، جس پر ایک بہت ہی حسین اور شاندار عمارت بنی ہوئی ہے، ہر سال یہاں ہزاروں زائرین کا نوروز میں اجتماع ہوتا ہے، یہ شہر بھی قابل دید ہے، کچھ آگے بڑھنے پر یک بیک نظروں کے سامنے پہاڑوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی زرد زرد ٹیڑھی میڑھی ایک چوڑی لکیر نمایاں ہوئی، یہ اس علاقے کی مشہور اور ایرانی تاریخ ادب کی معروف ندی جیحون تھی جسے یونانی زبان میں ادکسس کہتے تھے اور جس کا قدیمی اور موجودہ نام آمو دریا ہے، اس کے داہنے کنارے پر ماوراء النہر کی سرزمین اور سمرقند اور بخارا کے مشہور شہر ہیں

یہی وہ ندی ہے جس کے بارے میں رودکی نے کہا تھا۔

ریگ آموو درشتی ہای آن زیر پایم پرنیان آید ہمی

آمو دریا کا یہ ریگ دور، دور اور خاصی دیر تک دکھائی دیتا رہا۔ اس کی چمکیلی اور زرد ریت اس ماحول میں جاذب نگاہ تھی۔ ندی میں اس وقت پانی کم رہا ہوگا یا بالکل نہیں ہوگا، کیونکہ جو چیز دکھائی دیتی تھی وہ تھی صرف ریت۔ آمو دریا جبال غور سے نکلتی ہے، اور اپنی ساتھی ندی سیحون (سیر دریا) سے مل کر دریاچۂ ارال میں جا گرتی ہے۔

تقریباً دو گھنٹے پرواز کے بعد ہمارا طیارہ قندوز کے ہوائی میدان میں جا اترا اس علاقے کے حاکم نے جسے ہماری آمد کی خبر قبل ہی سے ہو گئی تھی، ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم ہوائی اڈے کی بس میں سوار ہو کر ایک مہمان خانے میں گئے، جو شہر سے باہر ہے۔ یہاں ہماری خاطر بسکٹ، ٹافی اور چائے سے کی گئی۔ یہاں ہم نے تھوڑی دیر اس انتظار میں توقف کیا کہ شاید طیارہ کے لیے کابل تک پرواز کرنے کی صورت نکل آئے۔ لیکن ایک بجے تک یہ خبر ملتی رہی کہ ہنوز موسم موافق نہیں ہوا ہے، اور نہ آج اس کے ہونے کی امید ہے۔ مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم لوگ سڑک کے ذریعے کابل کا سفر کریں، چنانچہ ہم لوگ پھر بس میں بیٹھ کر شہر کے چوک میں پہنچے، جہاں کابل جانے کے لیے ایک بس کا انتظام کرنا تھا، یہاں ہمیں اس کی اجازت ملی کر ساعت تک بازار کی سیر کریں۔

قندوز کابل سے تقریباً تین سو کیلو میٹر شمال میں روس کی سرحد کے قریب ایک تاریخی شہر اور ولایت قندوز کا صدر مقام ہے، یہ ترکستان کے اس حصے میں واقع ہے

جو افغانستان کے اہم ہے، شہر خوبصورت اور سرسبز باغات سے بھرا ہوا معلوم ہوا
بازار میں بھی خاصی رونق دیکھی، دکانیں چوڑی سڑکوں کے دونوں جانب ہیں ان کے
سامنے چوڑے فٹ پاتھ بھی ہیں، دکانوں میں مال و اسباب بھرا ہوا پایا، خریداروں
کی بھی تعداد کثیر تھی۔ دست فروشوں کی بھی کثرت تھی، چوک پر جو ٹریفک کے سپاہی
تھے انھوں نے ہمارا سامان اپنی نگرانی میں رکھ لیا تھا، تاکہ ہم آزادی کو گھوم پھر سکیں،
دو بجے کے قریب ہم لوگ ایک آرام دہ بس میں سوار ہو کر کابل کی طرف
روانہ ہوئے، مجھے یہ خوشی تھی کہ بس کے ذریعہ سفر کرنے سے افغانستان کے کچھ اور
علاقوں کو دیکھنے کا موقع ملے گا جو طیارہ سے ممکن نہ تھا، شہر سے نکل کر ہم ایک عمدہ
پختہ سڑک پر ہو لئے، یہ سڑک روسیوں کی مدد سے سرحد روس سے کابل تک بنی ہوئی
ہے، اور بڑے اونچے پہاڑوں پر سے گذرتی ہے، کچھ دور تک ہم نسبۃً نشیبی
علاقے میں چلتے رہے، ہمارے راستے میں دلفریب قدرتی مناظر تھے، پہاڑوں کا سلسلہ،
بہتے مترنم ندیاں، اُن کے کنارے سرسبز کھیت اور باغ، ہم بغلان کے
صنعتی مقام اور ایک مشہور شہر "پل خمری" سے بھی گزرے آہستہ آہستہ سڑک بلندیوں
پر چڑھنے لگی، اور ایک گھنٹہ میں ہم خاصی بلندی پر پہنچ گئے، ایک جگہ بارش ہو رہی
تھی اور ہماری بس ایک "چائے خانہ" کے پاس ٹھہر گئی، افغانستان کے چائے خانے
مشہور ہیں، اور افغانیوں کی زندگی میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں، یہ چائے
خانے سوشل اجتماعات کے مراکز ہیں، جہاں لوگ جمع ہو کر چائے پیتے کھانا کھاتے اور
اپنی دلچسپی کے موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں، ہم بارش میں بھیگتے ہوئے چائے
خانے میں داخل ہوئے جہاں مٹی کے ایک لمبے چبوترے پر لوگ بیٹھے مٹی یا چینی کے

ایما چائے نوشی میں مشغول تھے نزدیک ہی تو زہی بہت بڑی دیگ روشن تھی جس پر کیتلی رکھی تھی
ں سے گرم گرم چائے لوگوں کو تقسیم ہو رہی تھی۔ افغانستان میں دو قسم کی چائے
ہ، چائے سبز اور چائے سیاہ، چائے سبز وہی ہے جسے ہم گرین ٹی کہتے ہیں، اور چائے
اہ وہ ہے جو ہمارے یہاں مروج ہے، لیکن دونوں کا رنگ ہلکا ہوتا ہے، اور دودھ
، بغیر پی جاتی ہیں۔ مجھے چائے سبز کا ذائقہ پسند نہیں آیا، اس لیے میں نے ایک دفعہ
، کی خاطر پینے کے سوا پھر کبھی نہ پی۔ چائے پینے کے بعد ہم پھر بس میں سوار ہو کر چلے، اب
ی بس اور زیادہ بلندی پر چڑھتی جا رہی تھی یہاں تک کہ ہم اتنی بلندی پر پہنچ گئے
ں ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی سڑک کئی سرنگوں سے گزرتی ہے، سرنگوں کی چھتوں
ں برف جمی ہوئی تھی، بلکہ سوراخوں سے کچھ برف سرنگ کے اندر بھی گری ہوئی تھی سب
یادہ بلند اور برف آلود مقام سالن ہے۔ اس علاقے کو دیکھ کر مجھے ایران کے مغربی پہاڑوں
کا سماں یاد آگیا۔ بغداد سے بذریعہ سڑک آتے ہوئے کرمانشاہ کے نزدیک ایسا ہی
منظر دیکھنے میں آیا تھا۔ جہاں کوسوں تک سڑک کے دونوں کنارے زمین برف سے
پٹی ہوئی تھی۔

ان دشوار گذار منازل کو طے کر کے ہم نشیب کی طرف چلے اور پہاڑوں کے
چکر دار راستوں سے ہوتے ہوئے ہموار سڑک پر آگئے، کابل پہنچتے پہنچتے چراغ روشن
کیے جا چکے تھے، ساڑھے سات بجے کے قریب ہماری بس انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل کی پورٹیکو
میں آکر رک گئی، ہماری جاندار مس نیرپی ناحا اور عثمانی صاحب لپک کر میرے پاس
آئے اور دہلوگوں کے پروگرام کے مطابق کابل نہ پہنچنے سے جو انھیں تشویش لاحق ہوگئی
تھی اس کا اظہار کیا۔ اس تاریخ کو افغانستان ریڈیو اسٹیشن کے ہال میں ایک مشاعرے کا

اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن ہم لوگوں کی عدم موجودگی میں اس پروگرام کو منسوخ کر دیا گیا تھا،
البتہ اس وقت انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل کے بالائی طبقے کے ڈائننگ ہال میں وزیر اطلاعات
کلتور کی طرف سے شاندار الوداعی ضیافت تھی، چنانچہ ہم لوگ اپنے اسباب کمروں میں
رکھ اور منہ ہاتھ دھو کر اس ضیافت میں شریک ہو گئے۔

دوسرے دن، ۲۲ کو تقریب کا آخری جلسہ صبح کو ہوا، اس جلسے کی صدارت مسٹر
معظم حسین نے کی جو حیدرآباد دکن کے رہنے والے ہیں اور یونسکو کی جانب سے مختلف
ممالک میں ٹیچروں کے ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے
مقرر ہیں۔ فی الحال وہ افغانستان میں متعین ہیں، اس جلسے میں باقی ماندہ تین مقالے
پڑھے گئے جس کے بعد سمنار کے سکریٹری نے مہمانوں کی خدمت میں اظہار تشکر کے ساتھ
تقریب کے خاتمے کا اعلان کیا۔ بعد ازاں ہم لوگوں نے دن کا کھانا کھایا پھر ایک دوسرے
کو الوداعی سلام کر کے رخصت ہوئے۔

ابھی دن کے چند گھنٹے باقی تھے، اس لیے میں نے اپنی مہماندار مس خیریہ تاعا سے
درخواست کی کہ وہ مجھے بازار لے چلیں تاکہ میں افغانستان کے کچھ میوے خرید لوں، وہ راضی
ہو گئیں اور ہم دونوں بازار پہنچے تھوڑی خریداری کر کے وہ مجھے انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل
پہنچا کر کل صبح آنے اور مجھے ہوائی اڈے پہنچانے کا وعدہ کر گئیں۔

شام ہونے کو ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت کو ہوٹل سے
باہر جا کر صرف کر دوں، اس ارادے سے میں ہوٹل سے نکل کر نیچے کی طرف چلا، سڑک
اس قدر ڈھلوان تھی کہ مجھے جابجا رک رک کر چلنا پڑا، یہ سڑک نیچے آکر عام شاہراہ
میں مل جاتی ہے۔ یہاں سے ایک دوسری سڑک باغ بالا کو جاتی ہے، میں نے دیکھا کہ

بہت سے لوگ مرد، عورت، بچے، پاپیادہ، یا موٹروں اور سائکلوں پر اس سڑک سے اوپر جا رہے ہیں، اور کچھ نیچے بھی اتر رہے ہیں، بسیں بھی دونوں طرف سے بھری بھری آتی جاتی تھیں، لوگ ان سے اتر اتر کر باغ بالا کی طرف جاتے تھے، آخر میں نے ایک نوجوان آغا سے دریافت کیا کہ اوپر کیا چیز ہے، جسے دیکھنے کے لیے لوگ جا رہے ہیں، اس نے بتایا کہ اوپر بلندی پر ایک بزرگ کا مزار ہے، آج جمعہ کا دن ہے، لوگ وہاں فاتحہ خوانی کیلئے جاتے ہیں، اور وہاں میلا لگتا ہے، میں اس جگہ کچھ دیر تک کھڑا آنے جانے والوں کو دیکھتا رہا، ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں جو موڈرن فیشن کا لباس پہنے تھیں، یعنی بل باٹم یا پینٹ اور چست گنجی، اس کا مطلب یہ کہ امریکی لباس دنیا کے اس گوشے اور کوہستانی ملک افغانستان میں بھی مروج ہو گیا ہے۔!

دوسرے دن کابل سے وطن کو واپسی تھی، خانم شیریں تاج صبح کو ۹ بجے کار لے کر ہوٹل میں آگئیں اور ہم اسباب موٹر میں رکھ کر اور ہوٹل والوں سے رخصت ہو کر ہوائی اڈے پہنچ گئے، جناب عثمانی اور ایک افغانی دوست جناب استاد محمد صالح پروانتا اور مدیر تشریفات خانم گل غوتی رخصت کرنے ہوائی اڈے آگئے تھے، پاسپورٹ و دیگر کاغذات اور کسٹمس چیکنگ کے بعد میں ان دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر لانج میں آگیا، اس وقت تک طیارہ تہران سے نہیں آیا تھا، اس لیے کچھ دیر ٹھہرنا پڑا، تقریباً گیارہ بجے طیارہ آگیا تو سب مسافر سوار ہوئے اور دہلی کی طرف پرواز شروع ہوئی۔ ڈیڑھ گھنٹے میں طیارہ پاکستان کی سرزمین کو عبور کرتا ہوا، پالم ایرپورٹ پر اتر آیا۔ اس طرح افغانستان کی مسافرت تمام ہوئی۔

افغانستان میں میری اقامت کی مدت بہت مختصر رہی، یعنی جمعہ جمعہ آٹھ دن

لیکن اس مختصر مدت میں بھی جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا اس سے میں نے اس ملک کے سماجی و علمی حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، میں نے اتنا احساس تو کیا کہ یہ ملک موجودہ جمہوری دور حکومت میں ترقی و خوشحالی کی طرف گامزن ہے، صدر جمہوریہ افغانستان جناب داؤد خاں عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کی رونق بڑھانے میں ساعی ہیں، سب سے زیادہ خوش نصیبی کی بات میرے لیے یہ ہوئی کہ چند یوروپی دانشوروں کے علاوہ افغانستان کے متعدد دانشمندوں اور اساتذہ کرام سے ملاقات و گفتگو کا موقع میسر آیا، ان افغانی دانشمندوں میں پرانے لوگ بھی ہیں اور نوجوان بھی، پرانے لوگوں میں استاد عبدالحی حبیبی ایک محقق وانشاپرداز کی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں، انھوں نے خواجہ عبداللہ انصاری کے ملفوظات و تالیفات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور طبقات الصوفیہ کو بڑی کاوش و کوشش سے ایڈٹ کیا ہے۔ دوسرے جناب عبداللہ خدمت گار ہیں جو فی الحال پشتو اکیڈمی کے معزز رکن ہیں، شاعر بھی ہیں، اور انشاپرداز بھی، ان کی علمی و ادبی کوششیں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، جناب عبدالوہاب محمود طرزی ملک کے مشہور و معروف محب وطن و قومی رہنما محمود طرزی مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں، ان کے علمی کارنامے معیاری سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے حکیم ناصر خسرو کے کے متعلق بڑی تحقیق و تفتیش سے ایک کتاب مرتب کی ہے، ڈاکٹر امیر محمد اثیر علم طب میں ڈاکٹر ہیں، لیکن انھیں قدرت نے علمی و ادبی ذوق بھی عطا کیا ہے، عبدالقادر بیدل کے کلام کے دلدادہ ہیں اور اس کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ان کا مقالہ بھی بیدل ہی سے متعلق ہے، جناب محمد علم غواص کو ہرات کے مزارات اور تاریخی مقامات کے متعلق وسیع و مفید معلومات حاصل ہیں، انھوں نے ہرات میں اپنے معلومات سے ہمیں مستفید کیا، جناب

غلام حسین مجددی ہندوستان میں افغانستانی سفارت خانے سے مدت تک منسلک رہ چکے ہیں، اس لیے اردو اچھی طرح بولتے ہیں، اُن کا علمی ذوق گفتگو میں ظاہر ہوتا ہے۔ جناب رضا مائل ہروی انجمن تاریخ کے معزز رکن تھے، انھوں نے کئی تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں، جن میں بعض بنیاد فرہنگ ایران کی طرف سے شائع ہوئے ہیں، چند سال قبل اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں پٹنہ بھی آئے تھے۔ سب سے دلچسپ اور قابل توجہ شخصیت جناب استاد محمد صالح پردنا کی دیکھی۔ پہلے دانشکدۂ ادبیات وعلوم انسانی کابل میں استاد تھے، اب متقاعد ہو چکے ہیں، انھیں بے شمار اشعار فارسی یاد ہیں، ہر موقع اور موضوع کے لیے شعر سنا دیتے ہیں، کہتے تھے کہ انھیں تقریباً دس ہزار اشعار یاد تھے، اب سبب کہنسالی کچھ بھولتے جاتے ہیں۔ بذلہ سنج اور خوش مزاج وحاضر جواب ہیں، کوئی موقع ہو فقرہ چست کرنے یا شعر سنانے سے نہیں چوکتے، بڑے علم پرور اور کتاب دوست ہیں۔ ان کا شخصی کتاب خانہ ہے جس میں کچھ سات ہزار قلمی نسخے ہیں ان میں سے بعض نادر ونفیس ہیں، انھوں نے بتایا کہ ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ان کے کتاب خانے میں بعض نادر مخطوطات موجود ہیں، مجھکو دعوت دی تھی کہ ان کے گھر جاکر کتاب خانے کو دیکھوں، لیکن ہرات میں اٹک جانے کی وجہ سے اس کا موقع نہ مل سکا جس کا مجھے بیحد افسوس ہے، ڈاکٹر نبی ہادی ریڈر شعبۂ فارسی، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے گذشتہ سال جب وہ ایک بین الملکی کانفرنس میں شرکت کے لیے کابل گئے تھے، آقاے پردنا کا کتاب خانہ دیکھا، اور اپنے ایک مضمون میں اس کی تعریف کی ہے، کاش اس کتاب خانے کی فہرست شائع ہو جاتی، میں نے آقاے پردنا کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ جلد ایک فہرست مرتب کر کے چھپوا دیں، وہ

سے بہت خلوص سے ملے، اور مجھے کو رخصت کرنے کابل کے ہوائی میدان بھی آئے۔

نوجوان دانشمندوں میں ۲ شخصوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ایک تو ڈاکٹر عبدالغفور روان فرہادی جو سمنار کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہر وقت انتظام و اہتمام میں مشغول رہتے تھے، بہت ہی فعال آدمی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ علمی دنیا میں بھی نام آور ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف ہیں، انگریزی میں بھی مضامین لکھتے ہیں اور فرانسیسی بے تکان بولتے ہیں، انھوں نے خواجہ عبداللہ انصاری کے حالات زندگی و آثار سے متعلق فرانسیسی دانشمند سرژ بورکوئی کی تالیفات کا زبان دری (فارسی) میں ترجمہ کیا ہے۔ پوری تقریب میں ان کی فعالیت نمایاں رہی، اگر انھیں سمنار کا روح رواں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، دوسرے نوجوان جناب ڈاکٹر سید مخدوم ہیں، جو کابل یونیورسٹی میں استاد ہیں، بڑے ذی علم، ذہین اور تیز آدمی ہیں، سمنار میں جتنے موضوعات زیر بحث آئے انھوں نے بیشتر موضوعات پر بحث میں حصہ لیا، وہ بہت ہی مدلل طریقے پر اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، عربی بھی بلا تامل بولتے ہیں، فارسی ادب میں ایران سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔ اس لیے اس زبان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں۔

اس وقت افغانستان میں ۲ زبانیں رائج ہیں، ایک تو پشتو جسے اب سرکاری زبان بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس لیے اس کی ترقی کے لیے تمام وسائل اختیار کیے جا رہے ہیں، ایک پشتو اکیڈمی بھی قائم ہے جو درسی اور علمی کتابوں کو پشتو میں ترجمہ کرا رہی ہے، اس نے خاصی تعداد میں کتابیں شایع کی ہیں۔ دوسری زبان فارسی ہے جو زمانۂ دراز سے اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے، لیکن فارسی کو یہاں دری کہتے ہیں، اور افغانی اسے دری کہنے میں حق بجانب بھی ہیں، کیونکہ اگر وہ اس زبان کو

جو بیشتر لوگوں کی مادری زبان ہے، فارسی کہیں گے تو یہ ایران کی زبان ہوگی، نہ کہ افغانستان کی، پھر فارسی زبان کا اصلی نام تو دری ہے، کیونکہ یہ دراصل کوہستان میں پیدا ہوئی، اور مشرق کے خود مختار حکمرانوں کے درباروں میں پہنچ کر ایک علمی و ادبی زبان کی صورت میں ترقی پذیر ہوئی، الفاظ و محاورات اور لہجے کے اعتبار سے ایرانی فارسی اور افغانی دری میں خاصا فرق ہے۔

میں نے افغانستان کے تعلیمی حالات کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کی، جہاں موقع ملا میں نے بچوں سے دریافت کیا کہ وہ کیا پڑھتے ہیں، اور کہاں پڑھتے ہیں، استالیف میں ایک لڑکا نو دس سال کا مہمان خانے کے باغ میں کھیلتا ہوا ملا، میں نے اس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی پبلک اسکول میں پڑھتا ہے، اور فرانسیسی زبان سے واقف ہے، گازرگاہ میں دو خوردسال لڑکے ہم لوگوں کے نزدیک تماشا دیکھنے آگئے تھے، میں نے ان سے پڑھنے لکھنے کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ وہ مکتب میں پڑھتے ہیں، میں نے دریافت کیا کہ قرآن پاک پڑھتے ہو کہ نہیں، تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور میرے کہنے پر سورہ الحمد زبانی سنایا۔ یہ بھی بتایا کہ اسے علم الحساب بھی سکھایا جاتا ہے، کپڑے کی ایک دکان پر ایک لڑکا ملا، اس نے بھی اسی قسم کا جواب میرے سوالوں کا دیا، میں نے کابل، ہرات اور قندھار میں لڑکیوں کو کتابوں کا بستہ سنبھالے اسکول یا مدرسے سے آتے دیکھا، ان لڑکیوں کی عمر آٹھ دس سال ہوگی، ان لڑکیوں کا اسکولی لباس یہ ہے، نیلے رنگ کا جمپر، اسی رنگ کی شلوار اور سفید دوپٹہ، جو سر سے اوڑھا ہوا تھا، ان اسکولی لڑکیوں کی تعداد بھی خاصی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں بھی تعلیم کی طرف متوجہ ہیں، سمنار کے جلسوں میں کابل یونیورسٹی کے بعض لڑکے اور لڑکیاں

ستار نوازی کا تماشا دیکھنے آجاتی تھیں، میں نے ان سے بھی ان کی تعلیم کے متعلق سوالات کئے' وہ سب رشتۂ ادبیات یا تاریخ سے وابستہ تھے۔ بعض لڑکیاں تعلیم حاصل کر کے سرکاری دفتروں میں ملازمت کرتی ہیں، چنانچہ وزارت اطلاعات وکلتور میں متعدد لڑکیاں ملازم ہیں، اور یہی بیرونی مہمانوں کی رہنما بنائی گئی تھیں۔ مس شیریں تاج، مس عایشہ، مسز طاہرہ، مسز لیلا، مس ملیحہ صیقل، مس ثریا ذکریا، مسز شہلا سمیعی، یہ سب دفتر میں ملازم ہیں، اور میں نے انھیں بہت ہی تیز وطرار، اور شوخ وشنگ پایا، ان کا لباس بھی مغربی وضع کا تھا، میری ملاقات دو شاعرات سے بھی ہوئی، ایک تو عاطفہ عثمانی اور دوسری رؤفہ احراری۔ دونوں نے اپنے شعر بھی لکھ کر یادگار کے طور پر دئے، عاطفہ عثمانی نے یہ دو شعر لکھے۔

زن ای نہال مثمر دنیاے زندگی — زن اے چراغ روشن شب ہاے زندگی
گر عاشقم بر وے تو از بسکہ خواندہ ام — رمز جبین تو معنے زندگی

رؤفہ احراری نے یہ فرد لکھا۔

خون دل بود انکہ رنگ لالہ را ایجاد کرد — اشک خونینم شفق را در افق بنیاد کرد

سمنار میں شریک ہونے والوں کو بہت سی کتابیں بھی بطور تحفہ دی گئیں' ان میں سے کچھ تو انجمن تاریخ کی مطبوعات ہیں، کچھ موسسۂ بیہقی کی، کچھ پشتو اکیڈمی کی اور کچھ کابل یونیورسٹی کی۔ موسسۂ بیہقی کی نو کتابیں ہیں جن میں سے آٹھ خواجہ عبد اللہ انصاری کے احوال وآثار سے متعلق ہیں، ان میں سے ایک منازل السائرین ہے، اور ایک حکیم ناصر خسرو بلخی کے احوال وآثار کے متعلق ہے، پشتو اکیڈمی کی شائع کردہ تیس جلدیں ملیں' ان میں سے ایک مولانا شبلی نعمانی مرحوم و مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

شہور تالیف سیرۃ النبی کا پشتو ترجمہ ہے جس کو عزیز الرحمٰن سیفی نے کیا ہے، یہ کتاب بڑی
لیع پر چھپی ہے، اور چھ جلدوں میں ہے، (مجھے پانچویں جلد نہیں ملی) ان کتابوں کے علاوہ
۔آریانا، مجلۂ ادب، مجلہ عرفان اور انگریزی مجلہ افغانستان کے کئی شمارے بھی تحفتہً
ایت کیے گئے۔

کابل کے اخبار انیس، جمہوریت، اور کابل ٹائمز (انگریزی) نے سمنار کی رپورٹ
ت مفصل طور پر چھاپی، اور ان کی کاپیاں سب مہمانوں کو تقسیم کیں، اخبار انیس سراسر
بان دری میں نکلتا ہے، اخبار جمہوریت میں پشتو اور دری دونوں زبانوں میں خبریں
ہوتی ہیں۔ یہ تینوں روزنامے ہیں۔ ہرات سے روزنامہ اتفاق اسلام شائع ہوتا ہے،
اس نے بھی تقریبات کی مفصل خبریں شائع کیں۔

افغانستان کی ہشت روزہ مسافرت میں صرف پانچ دن کابل میں رہنے کا موقع
ملا، اس کا بھی بیشتر حصہ سمنار میں مشغولیت اور دعوتوں میں شرکت کی نذر ہو گیا، اسلیے
شہر کو اچھی طرح دیکھنے کا وقت میسر نہ ہو سکا۔ ہوٹل انٹرکونٹی نینٹل سے پریس کلب زنالار
محمود طرزی) تک آتے جاتے یا شہر سے باہر استایف کی راہ میں یا دو دن کابل کے
ایک بازار میں مختصر وقت میں خریداری کے موقع پر جو کچھ دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ
کابل اور اس کے گرد و نواح کو قدرت نے حسین مناظر سے آراستہ کیا ہے، شہر ایک
زرخیز وادی میں ہے، جو چھ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع ہے اور دو بلند پہاڑ اس کے
دو جانب کھڑے ہیں، کابل ندی شہر کے مختلف حصوں سے گزرتی ہے، اور اس پر جا بجا
پل ہیں، کابل جدید کی سڑکیں بہت ہی کشادہ اور صاف ستھری ہیں، بہت سی
سرکاری دفتروں اور ہوٹل کی عمارتیں جدید طرز کی ہیں، کابل کے بازار میں اخباس

فروخت فراوانی کے ساتھ دکانوں میں ہیں، اور خریداروں کی بھی کثرت ہے، پہاڑ کے ڈھلوان پر بھی جابجا مکانوں کے جھنڈ ہیں، جو شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح معلوم ہوتے ہیں، رات کو جب روشنی ہوتی ہے تو ان کا دلکش منظر ہوتا ہے۔

افغانستان میں جو مختصر سی اقامت کا موقع ملا اس کو اب یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جو کچھ دیکھا خواب تھا، جو سُنا افسانہ تھا، لیکن افغانی دوستوں کی قدردانی، مہمان نوازی اور مخلصانہ گفتگو ہمیشہ یاد رہے گی۔

صبح الاعشیٰ

از۔ محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے (علیگ)

(۲)

صبح الاعشیٰ نہ صرف مصنفات قلقشندی کی کہکشاں میں کوکب تاباں کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان و ادب کا پورا سرمایہ اس کی نظیر سے عاری ہے، کسی ایک خاص فن پر ممکن ہے، اس سے ممتاز اور فائق تصنیف مل جائے، لیکن مختلف علوم و فنون کا جو سمندر صبح الاعشیٰ کے ضخیم دفتر میں موج زن ہے، وہ بلاشبہ مفقود المثال ہے، اسی باعث اس کتاب کو عربی علم ادب میں لازوال شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، ابو العباس قلقشندی نے یوں تو فقہ، ادب، انساب، رجال اور تاریخ میں بکثرت لائق ذکر کتابیں تالیف کی ہیں، جیسا کہ گذشتہ سطور سے واضح ہو چکا ہے۔ لیکن جس کتاب نے مسلمہ طور پر اس کو بقائے دوام کے دربار میں کرسی زرنگار پر متمکن کیا، وہ صبح الاعشیٰ ہے، یہاں تک کہ اب یہ دونوں نام لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک کے تصور کے ساتھ دوسرا خود بخود ذہن پر ابھر آتا ہے۔ ایک نقاد نے بہت صحیح لکھا ہے،

لا یشك احدٌ فی ان کتاب	بلا شبہ صبح الاعشیٰ متفقہ طور پر سب سے
صبح الاعشیٰ ھو اخطر کتب	اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے باعث
علی الاطلاق وھو الکتاب	قلقشندی زمانہ دراز تک مشہور رہیگا،

الذی یعرف به هذا الرجل	اور اس کی وجہ سے وہ ابدالآباد تک
عبر العصور ویذکر به	تمام مؤلفین کے ساتھ یاد کیا جائے گا
واسمه بین المؤلفین فی سائر	چنانچہ علم و ادب کے میدان میں قلقشندی
الدهور فلا یمر اسم	کا نام صرف صبح الاعشیٰ کے مؤلف
القلقشندی فی مجال من	ہی کی حیثیت سے معروف ہے، اور
مجالات العلم والادب	یہ کافی ہے۔
الا علی انه مؤلف صبح الاعشی	
وکفی۔[1]	

صبح الاعشیٰ کا بنیادی موضوع جو اس کے مولف کے پیش نظر تھا، فن انشاء ہے، لیکن اس انشاء سے مقصود انشاپردازی، محاسن اسلوب اور طرز نگارش نہیں ہے، جیسا کہ اس زمانہ میں معروف ہے، بلکہ اس سے وہ مجموعۂ علم و فن مراد ہے، جس کی واقفیت ایک سرکاری سکریٹری کے لیے اپنے فرائض کی بجاآوری میں لازمی ہے، اور اس لیے قلقشندی نے اہل انشا کی عام علمی و عملی ضروریات کے اقتضا کے لحاظ سے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں ایک ایسا وسیع راستہ اختیار کیا جس کی بدولت اس کی یہ تصنیف نہ صرف فن ادب کا ایک گرانمایہ تحفہ بنی بلکہ مختلف علوم و فنون کا بھی ایک دلآویز گلدستہ بن گئی ہے، یہ کتاب تاریخ و سیر بھی ہے، اور لغت و ادب بھی۔ تفسیر و حدیث بھی ہے، اور فقہ و افتاء بھی۔ عالم اسلام کا جغرافیہ بھی ہے اور اسلام کی تمدنی ترقیوں کا حقیقی آئینہ بھی۔ فن انشاء کے اصول و قوانین، مختلف ممالک اسلامی، ان کے مختلف حالات و کیفیات اور عہد جاہلیت سے آٹھویں صدی ہجری

---

[1] القلقشندی تالیف ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ ص ۵۰۔

تک تمام ممالکِ اسلامی خصوصاً فارس، روم، مصر، مراکش، اندلس، ہندوستان، چین، اور یورپین و افریقی ممالک میں عربی زبان کی تدریجی نشر و اشاعت اور اس کی خصوصیات، دیوان انشاء کا قیام اور اسی مناسبت سے خلافت اسلامیہ کا تعارف، خلافت کے اصول و شرائط، خلفائے اسلام کے مفصل حالات، تمام عالم اسلامی میں ان کا نفوذ و اثر اور پھر اسی ضمن میں مشرق و مغرب کے تمام ممالکِ اسلامیہ کے جغرافی حدود، ان کی حکومتوں کا اجمالی تذکرہ اور خصوصاً مختلف ممالک کے تہذیب و تمدن، معاشرت اور عام طرز بود و ماند کے حالات نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔ یہ تو محض اجمالاً عرض کیا گیا، ورنہ صبح الاعشیٰ کے تمام فوائد و مشتملات کا استقصا و چند سطور میں ممکن نہیں ہے، شیخ محمد عبد الرسول نے کتاب کی آخری جلد کے آغاز میں ایک طویل اور وقیع مقدمہ سپرد قلم کیا ہے، اس کی ابتدائی سطور میں وہ رقمطراز ہیں۔

مهما اطال الكاتب فی	راقم سطور جتنی بھی زیادہ اس کتاب
وصف هذا الكتاب وجوّد	کی توصیف کرے اور اس کی تعریف
فكره واجهد قلمه فی	میں جتنی بھی جودت فکر دکھائے اور
التعريف به وبقيمته العلمية	جتنی بھی اس کی علمی و ادبی خوبیاں بیان
والادبية فانه لا يبلغ	کرنے کیلئے اپنے قلم کو حرکت دے اس
فيه تعداد ما اودع فيه	کتاب کے فوائد اور دقائق کی کثرت
من الفوائد وانطوى تحته	کے مقابلہ میں اس تعریف و توصیف
من الدقائق	کی کوئی حیثیت نہ ہوگی،

اور پھر نقاد موصوف نے کئی صفحات میں صبح الاعشیٰ کے فوائد شمار کرانے کے بعد

بالآخر عاجز ہو کر یہ لکھنے پر اکتفا کیا کہ

لم يدع صغيرة ولا كبيرة	ہر چھوٹی بڑی چیز کا ذکر کر دیا ہو
إلا ذكرها. ولم يغادر	اور ہر غائب و موجود چیز کو اس میں
شاردة ولا واردة إلا	شمار کرا دیا ہے۔
أحصاها۔ ؎	

قلقشندی نے ممالک اسلامیہ کے ذیل میں ہندوستان پر بھی توجہ کی ہے، اور اپنے عہد یعنی آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے جغرافیائی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی خط و خال کو مستند مآخذ سے استفادہ کرکے نمایاں کیا ہے، راقم آئندہ صفحات میں مناسب محل پر صبح الاعشیٰ کے آئینہ میں آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستان کی ایک جھلک پیش کرے گا۔

قلقشندی سے پہلے انشا و کتابت کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی تھیں، جن میں ابن فضل اللہ العمری کی "التعریف بالمصطلح الشریف" اور ابن ناظر الجیش کی تثقیف التعریف بہت مشہور اور نمایاں ہیں، ابن ناظر الجیش کی کتاب دراصل "التعریف" کا تتمہ و تکملہ ہے، قلقشندی کو ان دونوں کتابوں سے نہ صرف پوری واقفیت تھی بلکہ اس نے صبح الاعشیٰ کے مقدمہ میں نہایت شاندار الفاظ میں ان کو اپنے موضوع پر بے نظیر اور بہترین تالیف قرار دیا ہے، لیکن بایں ہمہ اس کا خیال تھا کہ ابھی تک انشا کے موضوع پر کوئی ایسی جامع تالیف نہیں لکھی گئی ہے، جس میں اس فن پر لکھی گئی تمام کتابوں کا استقصا کیا گیا ہو۔ اور جو تمام علوم و فنون کی جامع ہو، مزید برآں قلقشندی نے مذکورۂ بالا دونوں کتابوں کے بعض اہم نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ ان میں کچھ اہم مباحث مثلاً

؎ صبح الاعشیٰ ج ۱ ص ۱۵ و معارف ج ۲۲ عدد ۶،

وصایا، اوصاف اور مراکز ڈاک وغیرہ کو ترک کر دیا گیا ہے، جن کی واقفیت ایک کاتب کے لیے نہایت ضروری ہے، چنانچہ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ کی تالیف میں نصرف ان نقائص کو دور کیا بلکہ انسان کا طائرِ خیال اس موضوع کے جن جن گوشوں تک پرواز کر سکتا تھا، ان سب کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے،

سبب تالیف ذکر آچکا ہے کہ قلقشندی ۷۹۱ھ میں مصر کے شاہی دفتر انشار میں کاتب (سکریٹری) مقرر ہوا تھا، اسی زمانے میں اس نے دیوان انشا رکے رئیس (چیف سکریٹری) قاضی بدرالدین بن فضل اللہ کی تقریظ میں الکواکب الدریہ فی المناقب البدریہ کے نام سے ایک مقامہ لکھا تھا، جس میں فن انشا کی تعریف، اس کی اہمیت و منزلت، طالب علم کے لیے اس کی شدید احتیاج اور اسی ضمن میں دوسرے بہت سے اصولی و فروعی امور سے بحث کی گئی ہے، لیکن غیر معمولی اختصار کے باعث اس مقامہ میں نہایت اغلاق وتعقید اور ابہام و اشاریت پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ قلقشندی نے اس کے اشارات اور مغلق عبارتوں کی شرح و وضاحت کی سخت ضرورت محسوس کر کے صبح الاعشیٰ کے نام سے چودہ ضخیم جلدوں پر مشتمل اپنی یہ شہرۂ آفاق کتاب تالیف کی۔ اس کام سے قلقشندی کو ۲۰ شوال ۸۱۴ھ بروز جمعہ فراغت ہوئی، ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ کا خیال ہے کہ علوم و معارف کی یہ انسائیکلوپیڈیا تقریباً بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد منصۂ شہود پر آئی ہے،

قلقشندی کا طریقۂ تصنیف بھی بالکل منفرد اور جداگانہ ہے اس نے معلومات کے بحرِ ذخار کو نہایت سلیقہ و حسن ترتیب اور کامیابی کے ساتھ ایک کوزہ میں بند کر دیا ہے، مولف کی انفرادیت کی زندہ مثال یہ ہے کہ پوری کتاب ایک مقدمہ، دس مقالات اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، لیکن پھر ہر مقالہ میں مختلف ابواب، ہر باب میں متعدد

فصلیں، ہر فصل میں کئی اطراف، پھر ہر طرف میں متعدد انواع، اور ہر نوع میں کئی کئی مقصد پائے جاتے ہیں۔ اس طرح شاخ سے شاخ اور بات سے بات خود بخود نکلتی اور پھیلتی چلی گئی، اور معارف و حقائق کا گنجینہ، بصائر و عبر کا خزینہ اور دولت گم گشتہ کا دفینہ ہم تک پہونچ گیا۔

مآخذ کتاب | صبح الاعشیٰ کو لعل شب چراغ بنانے کے لیے قلقشندی نے کتنی عرق ریزی، دماغ سوزی اور محنت و جانکاہی سے کام لیا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان مآخذ و مصادر کی طویل فہرست سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جن کے نام اور حوالے کتاب میں بار بار آئے ہیں کسی ماخذ سے اپنے کام کی چیز اخذ کرنے کے لیے جو دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے۔ اس سے موجودہ زمانے کے محققین بھی بخوبی واقف ہیں، قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں سو سے زائد مصادر سے استفادہ کیا ہے، جن کا حصر بیاں دشوار ہے، لیکن چند اہم اور مستند مآخذ کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ المثل السائر لابن اثیر	۲۔ کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری
۳۔ التذکرہ لابی الفضل الصولی	۴۔ کتاب الام امام شافعی
۵۔ العلم والدواۃ محمد بن علی۔	۶۔ الملل والنحل للشہرستانی
۷۔ کتاب قوانین الدواوین ابن مماتی۔	۸۔ العقد الفرید لابن عبدربہ۔
۹۔ حیات الحیوان للدمیری۔	۱۰۔ ادب الکاتب ابن قتیبہ
۱۱۔ صناعۃ الکتابۃ ابوجعفر النحاس۔	۱۲۔ کنز الکتاب کشاجم
۱۳۔ البیان والتبیین جاحظ۔	۱۴۔ کتاب الاوائل لابی ہلال العسکری۔
۱۵۔ الاحکام السلطانیہ ماوردی	۱۶۔ تقویم البلدان یاقوت الرومی۔

. المسالک و الممالک لابن فضل اللہ۔ | ۱۸۔ عجائب المخلوقات لابن اثیر۔
۱۔ فضائل العرب ابن ابی عبیدہ۔ | ۲۰۔ نزہتہ المشتاق ادریسی۔
۔ معالم الکتابتہ لابن شیث۔

ان کے علاوہ صبح الاعشی میں علم جغرافیہ تاریخ انساب اور ادب وانشاء کی بہت سی ایسی کتابوں کے حوالے بھی ملتے ہیں، جن کے مصنفین کے نام قلقشندی نے ذکر نہیں کئے ہیں، مثلاً الروض المعطار، مواد البیان، القانون، تاریخ النیل کتاب الاطوال، رسم العمورۃ، الدر الملتقط، الهناء الدائم تاریخ صفد وغیرہ۔

مقدمۂ کتاب۔ صبح الاعشیٰ کا مقدمہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں مولف نے ان اصول ومبادی سے بحث کی ہے، جن کا پیش نظر رکھنا کتابت انشا کا پیشہ اختیار کرنے سے قبل ضروری ہے،[۱] اس میں قلقشندی نے کتابت کی قدر ومنزلت، ممتاز کاتبین کی توصیف، کتابت کا لغوی واصطلاحی مفہوم، شاعری پر نثر کی ترجیح، کاتبوں کے آداب وصفات، دیوان انشاء کی حقیقت وتاریخ اور اس کے قوانین پر متعدد فصلوں کے تحت بہت شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے،

چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ عہدۂ کتابت (یعنی سرکاری سکریٹری کے فرائض منصبی) دنیا میں خلافت وسلطنت کے بعد سب سے ارفع وافضل منصب ہے، اس کی توصیف میں سلف کے بکثرت اقوال منقول ہیں۔ کتابت حکومت کی بنیاد، مملکت کا ستون، ادب کا قطب، حکمت کی اصل، علم کا نور اور فضل وعدل کا میدان ہے، دنیا کا کوئی بھی پیشہ ایسا نہیں ہے، جو کتابت اتنے فضائل ومحاسن کا

[۱] پورے مقالہ میں جہاں بھی کاتب اور کتابت کے الفاظ آئے ہیں ان سے اس زمانہ کا مروجہ مفہوم [illegible] کا ہے ۔۔۔ یا وزارت کا کام مراد ہے۔

جامع ہو۔ ہر حکومت میں کاتب (یعنی سکریٹری) کو نہایت کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے، سلطنت کے نظم و نسق کو حکمراں اسی وقت بحسن و خوبی سنبھال سکتا ہے، جب اس کا کاتب لائق، باصلاحیت اور دور بین و بیدار مغز ہو۔ جو حکومت کی جانب سے ترغیب و ترہیب وعد و وعید اور امر و نہی کے احکامات مؤثر طور پر لکھ کر وقتاً فوقتاً نافذ کر سکے۔

فن کتابت کی اہمیت اور علوے مرتبت کو مزید ذہن نشین کرتے ہوئے قلقشندی نے مورخین کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے کاتب تھے، حضرت ہارون اور یوشع علیہما السلام دونوں حضرت سلیمانؑ کے ہاں کتابت کی خدمت انجام دیتے تھے، اسی طرح حضرت سلیمانؑ اپنے والد حضرت داؤدؑ کے کاتب تھے، اور آصف بن برخیا اور یوسف بن عنقا دونوں حضرت سلیمانؑ کے دربار میں کتابت کے منصب پر مامور تھے، اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ کے کاتب تھے۔ (۱/۳۹)

کتابت کی متعدد قسمیں اور بکثرت انواع ہیں، لیکن بقول قلقشندی بنیادی طور پر تمام اقسام صرف دو میں منحصر ہیں، کتابت انشا اور کتابت اموال۔ لیکن قدیم زمانے سے عرف عام میں کتابت کا لفظ علی الاطلاق فن انشا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اور کاتب کے لفظ سے عام طور پر اس فن کا ماہر اور واقف کار مراد ہوتا ہے، کاتب انشا کو کئی وجوہ سے کاتب اموال پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ اول الذکر علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور عقل و فطانت کے جس مرتبۂ بلند کا حامل ہوتا ہے، اور جس طرح وہ اختراعِ معانی، جدتِ تعبیر اور تنوعِ فکر کے دلکش

ظاہر پیش کرتا ہے، کاتب اموال کو ان کمالات و محاسن سے کوئی حصہ نہیں ملتا ہے،
ورنہ اس کو اپنے پیشہ ورانہ کام کیلئے ان امور کی ضرورت ہی پڑتی ہے۔ (۱/۵۳)

شاعری پر نثر کی فوقیت | قلقشندی کے نزدیک نثر کو شاعری پر بوجوہ ترجیح حاصل ہے،
اپنی اس رائے کی صحت کو اس نے "فی ترجیح النثر علی الشعر" کے عنوان سے ایک
مستقل فصل میں مختلف مثالوں اور دلائل سے واضح کیا ہے، پہلے تو مؤلف نے
شاعری کے بکثرت "فضائل جمہ" اور "مفاخر ضخمہ" شمار کرائے ہیں، لیکن پھر وہ لکھتا
ہے کہ "اس کے باوجود نثر اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ مرتبت اور ارفع منزلت ہے،
کیونکہ شعر وزن وقافیہ کے ساتھ مقید ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے
قیود و شرائط کی پابندی شاعر کے لیے سد راہ ہوتی ہے، اس کے برخلاف نثر کیلئے
اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، بلکہ اس میں الفاظ اپنے معانی کے تابع ہوتے
ہیں، معنوی اعتبار سے شاعری میں کذب و غلط بیانی اور مبالغہ و اغراق کی
کثرت ہوتی ہے۔ اور نثر کا استعمال عموماً خطبات اور مراسلات جیسے بلند و پاکیزہ
مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے۔ (۱/۶۰)

کاتب کی صفات اور آداب کتابت | صبح الاعشیٰ کے مقدمہ کا تیسرا اور چوتھا باب
خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس میں مؤلف نے کاتب کی صفات، آداب کتابت
اور دفتر انشا کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ کاتب یعنی سکریٹری کے لیے درج
ذیل اوصاف سے متصف ہونا لازمی قرار دیتا ہے۔

(۱) اسلام، یعنی کاتب کا مسلمان ہونا ضروری ہے، (۲) صفت ذکورۃ
یعنی کاتب ہمیشہ مرد ہی ہو سکتا ہے، عورت نہیں، اس کی تائید میں قلقشندی نے حضرت عمر رضی کا

یہ قول نقل کیا ہے، کہ "عورتوں کو کتابت کے پیشہ سے ہمیشہ دور رکھو" (۳) حریت یعنی سکریٹری کا آزاد شخص ہونا شرط ہے، کیونکہ غلامی کا نقص وثوق و اعتماد کے مانع ہے، (۴) تکلیف یعنی کسی معذور و اپاہج یا بچہ کو کاتب کے منصب پر مامور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں پر بھی اعتماد کلی نہیں کیا جاسکتا ہے، (۵) عدالت کاتب کا منصف مزاج ہونا (۶) البلاغۃ (۷) وفور عقل (۸) احکام شرعیہ اور فنون ادبیہ کی کماحقہ واقفیت کیونکہ جاہل حق و باطل کے درمیان تمیز نہیں کرسکتا ہے۔ (۹) عالی ہمتی، شرافت نفس اور قوت ارادہ۔

مزید برآں کاتب کو حاضر جواب، زود حس، شیریں زبان، جرأتمند، امانتدار پاک طینت، جامہ زیب، ریش دراز، ذہین و فطین، دراز قامت، فصیح و بلیغ خوش رائحہ، اور با اخلاق ہونا ضروری ہے۔ (۱/ ۷۸) اسی سلسلہ میں قلقشندی نے عباسی خلیفہ مامون کے مشہور کاتب اور فن انشاء کے امام سہل بن ہارون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر دو شخص تقریر کریں، ان میں سے ایک نہایت خوش شکل، شاندار اور لباس فاخرہ پہنے ہوئے، اور صاحب حسب و نسب ہو، دوسرا گمنام، کم رو اور بد ہیئت ہو تو عوام اوّل الذکر کی بات کو غور سے سنیں گے اور اس کو اہمیت دیں گے، دوسرے کی طرف کوئی التفات کرنا پسند نہ کریں گے، بعینہ یہی معاملہ کاتب کے ساتھ بھی ہے۔ (۱/ ۷۹)

قلقشندی نے آداب کتابت کے تحت اخلاص نیت، تقویٰ، ثواب آخرت خیر خواہی، رازداری، شکر گذاری، وفاداری، کمزور و ضعیف کی دادرسی وغیرہ صفات کو کاتب کے لیے لازمی قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے، کہ حسن کردار اور حسن معاشرہ

دونوں کاتب کے لیے رأس المال کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی سکریٹری اپنے فرائضِ منصبی سے کبھی کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ (۱/۸۰)

غرض قلقشندی نے اس اہم موضوع پر ممتاز اہل علم مثلاً ابن حاجب النعمان، شہاب الدین الحلبی صاحب المثل السائر، ابوہلال العسکری، ابن مماتی، اور صاحب مواد البیان کے مستند اقوال و بیانات کی روشنی میں کاتب کے اخلاق و اطوار اور کتابت کے آداب پر بہت مدلل بحث کی ہے۔ اسی سلسلہ میں مؤلف نے عبدالحمید بن یحییٰ الکاتب کا وہ طویل مکتوب نقل کیا ہے جسے آدابِ کتابت کا سنگِ اساسی یا اولین منشور قرار دیا جا سکتا ہے، صبح الاعشیٰ کے پانچ صفحات پر مشتمل یہ خط نہ صرف معیاری عربی نثر کا ایک نادر نمونہ ہے بلکہ اُن تمام اخلاق حسنہ اور فضائلِ حمیدہ کا گنجینہ بھی ہے، جن سے ہر کاتب کو ہر زمانہ میں متصف ہونا ضروری ہے، عبدالحمید نے اس "وصیت نامہ" میں اس حقیقت کو متنوع الفاظ اور مختلف پیرایے میں بار بار واضح کیا ہے کہ سکریٹری (کاتب) کو کبر و غرور سے نفور اور تواضع و انکسار کا پیکر ہونا چاہئے، مظلوموں کے ساتھ شفقت و عطوفت اور رعایا کے ساتھ ملائمت و نرمی اس کا عام شعار ہونا چاہئے، اس کے کسی بھی قول و عمل سے جلالت منصبی کا اظہار نہ ہو، دراصل ہر کاتب حکمرانِ وقت کا قائم مقام اور حکومت کا ترجمان ہوتا ہے، یہاں تک کہ بادشاہ اسی کے کانوں سے سنتا ہے، اسی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اسی کی زبان سے بولتا ہے اور حد یہ ہے کہ اسی کے ہاتھوں سے پکڑتا ہے، اسی وجہ سے سرکاری سکریٹری کو علمی اور اخلاقی تمام فضائل و کمالات کا حامل اور ہر حیثیت سے ایک کامل انسان (Perfect man) ہونا نہایت ضروری ہے، اگر اس کا کوئی پایہ بھی کمزور ہو گا تو اس کے نتیجہ میں سلطنت وہن و ضعف کا شکار

دفتر انشا کی تاریخ | قدیم زمانے میں مکاتیب و مراسلات کے مستقل سرکاری دفاتر قائم تھے، جن کا عملہ مختلف قسم کے متعدد افراد پر مشتمل ہوتا تھا، ان دفاتر کو دیوانِ رسائل یا دیوانِ مکاتبات اور ان کے مہتم کو "صاحب الدیوان" کہا جاتا تھا، پھر بعد میں جب اس دفتر کی ذمہ داریوں میں مزید وسعت پیدا کر دی گئی تو اس کو دیوانِ انشا سے تعبیر کیا جانے لگا، اور انشا و کتابت نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی۔

اسلام میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مراسلت کا آغاز ہوتا ہے، آپ ہی نے سب سے پہلے نجاشی، کسریٰ، ہرقل اور مقوقس وغیرہ بادشاہوں کو دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ بارگاہ نبوی میں تیس سے زیادہ صحابۂ کرام نے خدمتِ کتابت کی سعادت حاصل کی تھی۔ اسی طرح خلافت راشدہ میں ہر خلیفہ کے متعدد کاتب ہوتے تھے، پھر عہد اموی میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی کہ خلیفۂ وقت کسی منتخب روزگار، فاضل دوراں اور ماہر فن کو دفتر انشا کا کاتب متعین کرتا تھا، چنانچہ عربی زبان کا مشہور آفاق انشا پرداز عبدالحمید بن یحییٰ آخری اموی حکمراں مروان ابن محمد کا کاتب تھا، اور اس نے اپنی جودت طبع اور مہارت فن سے انشا و کتابت کو نہ صرف فنی عروج عطا کیا بلکہ پہلی مرتبہ اس کے اصول و قوانین بھی مرتب کئے۔

پھر جب عباسیوں کا آفتاب دولت طلوع ہوا تو منصب وزارت کے لئے کتابت و انشا کی مہارت لازمی شرط قرار دیدی گئی چنانچہ اس عہد کے ماہر کاتبین ہی بتدریج ترقی کرکے وزارت کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اسی طرح عہد بنی عباس میں منصبِ کتابت کی ظاہری شان و شوکت اور قدر و منزلت میں غیر معمولی اضافہ

ہو گیا تھا، یہاں تک کہ فضل بن سہل کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مامون الرشید کے دربار میں ایک نہایت عمدہ زرنگار کرسی پر بیٹھکر جاتا تھا جس کو خدام اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھتے تھے، صاحب مواد البیان نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں بسا اوقات حکومت کے تمام حاشیہ نشینوں میں کاتب کو حکمران وقت سے سب سے زیادہ تقرب اور امتیاز خاص حاصل ہوتا تھا، بادشاہ اہم امور میں اس سے تبادلۂ خیالات اور اس کے مشوروں سے کسی حال میں بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا، قلقشندی نے اس اجمال کی نہایت شرح و بسط کے ساتھ وضاحت کی ہے، مستند حوالوں اور سلف کے قیمتی اقوال کے امتزاج نے ان تفصیلات کو بہت دلنشین اور موثر بنا دیا ہے، اس کے بعد وہ کاتب دیوان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ بارہ امور اسکے اہم فرائض میں داخل ہیں، خطوط و شکایات پر دستخط کرنا، آنے والے خطوط کا غور و فکر کے بعد جواب دینا، خطوط کے کاغذ، القاب، افتتاحیہ اور اختتامیہ نیز دوسرے مندرجات پر خصوصی توجہ مبذول کرنا، دفتر سے مختلف خطوط و فرامین کے صادر ہونے سے پہلے ان کے لفظ لفظ کو بغور پڑھنا، دفتری امور کی کڑی نگرانی۔ ایسے امور عامہ پر توجہ جن سے بادشاہ اور حکومت کا کوئی فائدہ یا نقصان وابستہ ہو،

کاتب کو اپنے فرائض کے سلسلہ میں کس قسم کے مواد کی ضرورت پڑتی ہے

کاتب یا سکریٹری کو اپنے فرائض سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونے کے لیے کن علوم کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا علمی پایہ کیا ہونا چاہیئے ؟ اور عملی طور پر فن تحریر کے کن دقائق سے اس کی معرفت لازمی ہے ؟ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں اس پر اتنی تفصیل و وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ تیسری جلد تک ساڑھے پانچ سو صفحات سے زائد میں یہ

دلچسپ اور معلومات آفریں بحث پھیلتی چلی گئی ہے، چنانچہ مولف نے کاتب کی لازمی
لی صلاحیت کو حسبِ ذیل انواع میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ لغت، نحو و صرف، علم معانی و بیان و بدیع، قرآن و حدیث، خطب
رسائل اشعار و حکم،

۲۔ انساب عرب و عجم، ان دونوں کے اہم وقائع و اخبار اور جنگیں، رسوم
رواج اور عادات و اطوار کی واقفیت،

۳۔ اقوام عالم کی تاریخ، خصوصاً تاریخ اسلام پر گہری نظر، پھر ہر اسلامی ملک
مستقل علیحدہ علیحدہ تاریخی حالات کا مطالعہ، اور اس میں بھی مصر کے ساتھ خصوصی
تنا، زمانۂ جاہلیت سے عہد ممالیک تک اس پر جو جو تاریخی انقلابات آئے اُن پر
ہر حاصل نظر۔

۴۔ جغرافیائی معلومات

۵۔ عجمی زبانوں مثلاً فارسی، یونانی، سریانی اور عبرانی وغیرہ کی معرفت

۶۔ انسانوں وحیوانات کی مختلف جنسوں کی امتیازی خصوصیات اور انکے نقائص
عیوب وغیرہ سے واقفیت، اس کو قلقشندی نے "فن الوصف" سے تعبیر کیا ہے۔ اور
اس سلسلہ میں کبوتر کے وصف پر پورا زورِ قلم صرف کیا ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ
طائر نامہ بری کے لیے ضرب المثل ہے، اور اس حیثیت سے قلقشندی کے بنیادی
موضوع سے ایک خاص تعلق رکھتا ہے۔

ان علوم و اوصاف کی واقفیت کے ساتھ کاتب کے لیے آلاتِ سفر (مثلاً
مشعل وغیرہ) آلاتِ سواری (مثلاً لگام، زین، کوڑا اور کجاوہ) آلاتِ جنگ،

ت حصار، آلات لہو ولعب، آلات عیش وطرب، قیمتی موتیوں اور مشہور خوشبوؤں
وصاف وخصوصیات کی معرفت بھی ضروری ہے۔ (۱/۲۰۱) قلقشندی نے مذکورہ
علوم اور امور کی جو حیرت انگیز محققانہ تفصیلات صبح الاعشیٰ میں درج کی ہیں اگر
سب کا استقصا کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مثلاً انساب عرب کے
سلہ میں اس نے عرب بائدہ، عاربہ، مستعربہ اور بربر کے تعارف کے ساتھ بے شما
ل اور انکی شاخوں کے نسب ناموں کا پچاس سے زیادہ صفحات میں انبار لگا دیا ہے
طرح انساب عجم پر بحث کرتے ہوئے ۲۰ عجمی اقوام کی اصل پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل
مولف کی دقت نظر، کثرت معلومات اور وسعت مطالعہ کا اندازہ کرنے کے لیے بطور
ہ نمونہ از خروارے چند اہم مباحث کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

ی مہارت | کاتب کے لیے غریب ونامانوس الفاظ سے واقف ہونا بھی بہت ضروری
بعض وقت اس کی ناواقفیت بڑی ذلت وندامت کا باعث ہوتی ہے، اس سلسلہ
قلقشندی نے ابن قتیبہ کے حوالے سے عہد عباسی کا ایک بہت دلچسپ اور عبرت آموز
ہ نقل کیا ہے کہ خلیفہ معتصم باللہ کے پاس کہیں سے ایک خط آیا، جس میں منجملہ اور
ں کے ایک جملہ یہ تحریر تھا "امطرنا مطراً کثر عنہ الکلاء" (یعنی اتنی بارش ہوئی کہ
ں سے ہری گھاس خوب اگی) سکریٹری یہ خط سناتے ہوئے جب اس جملہ پر پہونچا تو
تک خلیفہ نے دریافت کیا "یہ الکلاء کیا چیز ہوتی ہے" کاتب کو خود بھی معلوم نہیں تھا
شدید تذبذب اور پریشانی میں مبتلا ہو گیا اور بالآخر "لا ادری" کہکر اپنی ناواقفیت
ظہار کر دیا۔ خلیفہ نے دفتر انشا کے ایک دوسرے کاتب محمد بن عبد الملک الزیات
بلاکر اس لفظ کا مفہوم پوچھا۔ اس نے کہا "جب گھاس ہری اور شاداب ہوتی ہے"

تو اس کو کلاً کہتے ہیں، اور جب خشک ہو جاتی ہے تو اس پر حشیش کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر کاتب مذکور نے پودے کے اگنے سے لیکر نشو و نما مکمل ہونے تک کے مختلف مراحل کے نام شمار کرانے شروع کر دیے۔ جس سے معصم اتنا متاثر ہوا کہ فوراً زیات کو اپنا وزیر بنا لیا۔ (۱/۱۵۱)

لغت میں تبحر اور مہارت تامہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کاتب کو تمام مذکر و مؤنث اسماء، متباین (جیسے سیاہی وسفیدی، طول وعرض) مترادف (جیسے درندہ کے لیے اسد اور سبع) اور متضاد (جیسے امانت وخیانت کشادگی وتنگی) الفاظ کا علم اور ان کے حقیقی ومجازی معانی پر عبور حاصل ہونا چاہیے، (۱/۱۵۲) اسی طرح جن الفاظ کی متعدد لغات منقول ہیں۔ ان کی واقفیت بھی ہونی چاہیے، مثلاً رطل را کے زیر اور زبر دونوں کے ساتھ درست ہے، نطع میں نون کے زیر اور زبر، طا کے سکون اور نون وطا، دونوں کے زیر کے ساتھ چاروں لغتیں صحیح ہیں، بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن میں ۲۰ ۲۰ لغات منقول ہیں (۱/۱۵۹)

اسی طرح کاتب کے لیے فصیح اور عامی زبان سے واقفیت بھی لازمی ہے، فصیح ایسے قبائل کی زبان کو کہتے ہیں، جن کا اہل عجم کے ساتھ اختلاط ومیل جول نہ ہو، مثلاً قریش، ہذیل، کنانہ، تمیم، حجاز اور نجد وغیرہ اور عامی وہ زبان جس کو عامۃ الناس بولتے ہوں، جیسے جنن کو جیم کے زیر اور قبول کو قاف کے پیش کے ساتھ بولنا غلط العام ہے، (حالانکہ پہلا لفظ جیم اور دوسرا قاف کے زیر کے ساتھ صحیح ہے) قلقشندی نے اس فصل میں بکثرت مثالوں کے ساتھ عرب کے مختلف لب ولہجہ پر بڑی طویل اور دلچسپ بحث کی ہے۔ (۱/۱۶۱)

ایام عرب: زمانہ جاہلیت سے لے کر عہد اسلام تک عرب میں بکثرت مشہور لڑائیاں

ہوئیں۔ جو کی آگ عربوں کی فطرت اور جبلی امتیاز کے باعث سالہا سال تک سرد نہ نہیں ہوتی تھی، ایک سرکاری سکریٹری کے لیے ان تمام لڑائیوں اور ان اشعار سے جن میں ان ایام عرب کا ذکر اشارۃً یا صراحۃً مذکور ہوا ہے، پوری واقفیت ہونی چاہیے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس کو کوئی ایسا خط موصول ہو جس میں عرب کی کسی مشہور جنگ کا حوالہ آیا ہو یا جنگ پر مشتمل اشعار سے استشہاد کیا گیا ہو، اگر کاتب ان وقائع اور ایام سے ناواقف ہوگا، تو وہ اس خط کا شافی اور کافی جواب نہیں دے سکتا۔

قلقشندی نے ابوعبیدہ کی ایام العرب، ابن عبدربہ کی العقد الفرید اور میدانی کی کتاب الامثال سے استفادہ کرتے ہوئے عرب کی بکثرت لڑائیوں، ان کے اسباب وعلل اور فتح وشکست پر روشنی ڈالی ہے، ان میں سے چند مشہور ترین جنگیں یہ ہیں۔

۱۔ یوم خزار۔ یہ عرب کی سب سے مشہور اور بھیانک ترین جنگ شمار ہوتی ہے، خزار مکہ اور بصرہ کے درمیان ایک پہاڑ کا نام ہے۔ یہ جنگ بنو ربیعۃ الفرس اور قبائل یمن کے درمیان واقع ہوئی تھی جس میں بنو ربیعہ نے غلبہ حاصل کرکے قبائل یمن میں خوفناک قتل عام کیا تھا۔

۲۔ یوم عین اُباغ۔ اس جگہ غسان اور لخم کے درمیان جنگ ہوئی تھی جس میں لخم کو شکست ہوئی، اور اس کا سپہ سالار منذر بن ماء السماء قتل ہوا تھا۔

۳۔ یوم الکلاب الاول۔ کلاب بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک جگہ ہے، اس جنگ کا آغاز شراحیل اور سلمہ نامی دو حقیقی بھائیوں کی لڑائی سے ہوا تھا، لیکن پھر ان دونوں کے جانبدار ہو کر دوسرے قبائل بھی جنگ کی آگ میں کود پڑے۔ اس لڑائی میں سلمہ اور اس کے حامیوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

۴۔ یوم ذی قار، عہد جاہلی کی یہ مشہور جنگ ولادت نبوی کے چالیسویں سال شاہ کسریٰ اور بکر بن وائل کے درمیان واقع ہوئی تھی، دراصل کسریٰ نے شاہ حیرہ نعمان بن منذر سے کسی بات پر ناراض ہو کر اس کو قید میں ڈال دیا تھا، جہاں اس کی وفات ہو گئی یہی بنیادی سبب آگے چل کر جنگ کا باعث ہوا، اور اس میں عجمی افواج کو اپنی کثرت اور تیاری کے باوجود شرمناک شکست اٹھانی پڑی تھی، ان لڑائیوں کے علاوہ قلقشندی نے صدر اسلام کی لڑائیوں میں جمل صفین اور مرج راہط کی جنگوں پر بھی اجمالاً روشنی ڈالی ہے، کیونکہ اسلامی تاریخ کی تمام کتابیں ان لڑائیوں کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں، (۱/۴ ۳۹)

عربوں کے رسوم اور عادات جاہلی عرب میں بہت کثرت سے عجیب و غریب رسموں اور معتقدات کا رواج تھا جب اسلام کا آفتاب عالمتاب طلوع ہوا تو یہ تمام رسوم و عادات یکسر ممنوع قرار پا گئیں۔ قلقشندی نے عہد جاہلی کے ان خرافات کو "اوابد العرب" کے لفظ سے تعبیر اور اس کے ۳۳ سے زیادہ اقسام ذکر کئے ہیں جن میں سے کچھ نمایاں یہ ہیں، کہانت، نجوم، قمار، فال، شگون انصاب اور ازلام (یہ بھی شگون کی ایک قسم ہے جو تیر کے ذریعہ لیا جاتا ہے)

اسی طرح عربوں کی قدیم عادات میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام بھی شامل تھے، پہلے کی شکل یہ تھی کہ جب کوئی اونٹنی پانچ مادہ بچے جنتی تو عرب اس کے پانچویں بچے کا کان چیر کر چھوڑ دیتے تھے، اور ایسا برابر اسوقت تک کیا جاتا رہتا جب تک اس اونٹنی کے نر بچہ پیدا نہ ہو جاتا۔ اس کان کٹی مادہ کا دودھ صرف مرد استعمال کر سکتے تھے عورتیں نہیں۔

سائبہ کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے جانور یا غلام کو آزاد کر دیتا تو وہ ہمیشہ

یے حرام ہو جاتا تھا۔ اور وصیلہ یہ تھا کہ جب کوئی بکری ساٹھ بچے دیتی اور ساتواں ہوتا تو اس کو ذبح کر ڈالتے تھے، اگر آخری بچہ مادہ ہوتا تو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیتے تھے، حام کے رواج کی شکل یہ تھی کہ جس نر اونٹ کے دس بچے ہو جاتے اس کو آزاد چھوڑ دیتے تھے، جہاں چاہے، چرے۔ اور اس پر سواری نہیں کی جاتی تھی۔ اور نہ اس کے بال کترتے تھے۔ قرآن کریم نے جہاں جاہلی عربوں کے بہت سے خرافات رسوم پر ضرب کاری لگائی ہے، وہاں مذکورہ بالا چاروں رواج کو بھی یکسر بے اصل و بنیاد قرار دیا ہے۔ (ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام)

اسی طرح عربوں کے بعض مضحکہ خیز معتقدات اور عادات یہ تھے، لڑکیوں کو عار کے خوف سے زندہ درگور کر دینا۔ لڑکیوں کو فقر و محتاجی کے اندیشہ سے مار ڈالنا کسی بچہ پر نظر لگ جانے کا اندیشہ ہو تو اس کو لومڑی اور بلی کے دانت کا تعویذ پہنانا مصائب و آلام کے وقت چادر پھاڑنا، حسد اور جادو سے محفوظ رہنے کے لیے خرگوش کی ہڈی کا تعویذ پہننا کسی وبائی علاقے کے حدود میں داخل ہونے سے پہلے کھڑے ہو کر گدھے کی طرح رینگنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ کہ اب اس وبا کا اثر نہیں ہوگا۔

اسی طرح مختلف مواقع پر آگ روشن کرنے کی رسم بھی عربوں میں رائج تھی، مثلاً اگر وہ کسی شخص کا اپنے پاس دوبارہ آنا پسند نہ کرتے تھے، تو اس کے روانگی کے لیے، پیٹھ پھیرتے ہی، آگ روشن کرتے۔ شکار میں ہرن کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لیے بھی آگ جلاتے تھے، اسی سلسلہ میں قلقشندی نے نار القریٰ

کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے عربوں کی مشہور زمانہ مہمان نوازی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، اس آگ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ بھولا بھٹکا راہگیر گھر کے سامنے آگ روشن دیکھ کر ادھر آجائے، اور اس عرب کو اس کی مہمان نوازی کی سعادت حاصل ہوجائے، ظاہر ہے عربوں کے مذکورۂ بالا تمام رسوم و رواج میں تنہا یہی ایک عادت بس ہے، جس کو لائق صد تحسین قرار دیا جاسکتا ہے،

(باقی)

تحفۃ الحبیب

تالیف

فخری بن امیری ہروی

از

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلطان محمد فخری بن امیری دسویں صدی ہجری کا ایک اہم مصنف اور شاعر گذرا ہے چنانچہ اس کی متعدد تصانیف کا پتہ چل گیا ہے جن میں سے تین چار شائع بھی ہو چکی ہیں، روضۃ السلاطین، لطائف نامۂ فخری اور جواہر العجائب مکمل طور پر اور دیوان کا خلاصہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے، مگر قبل اس کے کہ فخری کی زندگی اور تالیفات وغیرہ کا مختصر خاکہ پیش کیا جائے، ان سطور کے لکھے جانے کے محرک کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا،

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم نے اپریل ۱۹۷۴ء میں مجھے ایک خط بھیجا، اس کے ہمراہ مولوی محمد مبین نقوی کا ایک خط، اور اس کے ساتھ اُن کی ایک یادداشت بھی جو تحفۃ الحبیب کے اُن کے ذاتی نسخے پر مبنی تھی، مولوی صاحب مرحوم کی یہ یادداشت آج سے ۴۴ سال قبل مُرتب ہوئی تھی، اور اس درمیان میں تحفۃ الحبیب اور اس کے مؤلف فخری کے متعلق خاصی تحقیق ہو چکی ہے، اس بنا پر مولوی محمد مبین کی تحریر میں خامیاں نظر آتی ہیں،

لیکن دو باتوں کی وجہ سے میں نے اُن کی یہ یادداشت من وعن شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اوّل یہ کہ اس تحریر کے ذریعہ "تحفۃ الحبیب" کے ایک نئے نسخہ کا سراغ ملتا ہے، (اگرچہ اس وقت معلوم نہیں کہ وہ نسخہ کہاں ہے، باقی بھی ہے یا نہیں،) دوسرے یہ کہ اس یادداشت کے ہمراہ تحفۃ الحبیب کے تمام شعراء (۲۳۶) کی مکمل فہرست ہے، چونکہ یہ فہرست اب تک شائع نہیں ہوئی ہے، اس لئے اس کی اشاعت خاصی مفید ہوگی،

فخری بن امیری کی روضۃ السلاطین کے مقدمے میں سید حسام الدین راشدی نے اس مصنف کی زندگی اور تالیفات کے بارے میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے[1] اور اسکے بارے میں قرار واقعی تحقیقات کر ڈالی ہیں، اس لئے میرے لئے اس سے زیادہ بہتر اور کوئی بات نہ ہوگی، کہ میں اس کا خلاصہ پیش کردوں ویسے فخری کی روضۃ السلاطین پر جو مضمون اختر میاں جونا گڈھی نے "ارمغان علمی"[2] میں شائع کیا تھا، اس میں فخری کی حیات اور کارنامے پر مفصل بحث شامل ہے، گو بقول راشدی وہ ہر طرح کے سقم سے پاک نہیں۔

فخری کا نام سلطان محمد تھا، اور وہ ہرات کا باشندہ تھا، اس کا باپ امیری اپنے دور کا امور فاضل اور شاعر تھا، چنانچہ فخری نے تحفۃ الحبیب اور تقی اوحدی نے عرفات العاشقین میں اُس کے کافی اشعار نقل کئے ہیں[3]، فخری کی پیدائش ۹۰۳ھ[4] میں قیاس کی گئی ہے، وہ

---

[1] حرف آغاز، تذکرہ روضۃ السلاطین وجواہر العجائب، سندھی، ادبی بورڈ، حیدرآباد (۱۹۶۸) ص"
[2] پروفیسر محمد شفیع مرحوم کے لئے یہ کتاب ڈاکٹر سید عبد اللہ نے مرتب کرکے پیش کی، طبع لاہور
[3] دیکھئے عرفات عاشقین نسخہ بانکی پور، پٹنہ ذیل مولانا امیری خراسانی در روضۃ السلاطین: مقدمہ ص ۳۴،
[4] دیکھئے روضۃ السلاطین (مقدمہ) ص ۱۷،

ایک مدت تک اپنے وطن ہرات میں رہا، اور وہاں بعض امرا، اور بادشاہوں کی مدح کی، اور بعض کے نام کتابیں تالیف کیں جن میں شاہ اسمٰعیل صفوی (م: ۹۳۰) امیر درمیش خان[۱] والی ہرات (م: ۹۳۱) شاہزادہ سام میرزا[۲] (۹۲۳-۹۷۵) میرزا کمال الدین[۳] شاہ حسین اصفہانی وزیر شاہ اسماعیل (م: ۹۲۵) اور خواجہ حبیب[۴] اللہ ساؤجی (م: ۹۲۷) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں،

ایسا خیال ہوتا ہے کہ خواجہ حبیب اللہ کی حیات تک فخری ہرات میں مقیم رہا ہے، اس کے بعد اُس نے سندھ کا رُخ کیا ہے۔ یہاں وہ شاہ ارغون (م: ۹۲۸) کے بیٹے شاہ حسن ارغون (م ۹۲۸-۹۶۲) کے دور فرمانروائی میں پہنچا، راشدی صاحب کی تحقیق کے مطابق فخری ۹۴۷ سے قبل[۵] سندھ آگیا تھا، شاہ حسن کے نام فخری نے دو کتابیں لکھیں یعنی روضۃ السلاطین اور صنائع الحسن، شاہ حسن کی وفات کے بعد وہ عیسیٰ خان ترخان (۹۶۲-۹۷۲) کے دربار سے وابستہ ہوا، اس کی مشہور تالیف جواہر العجائب شاہ حسن کی بیوہ حاجی ماہ بیگم کے نام پر ہے،

سندھ سے فخری اکبرآباد آگیا، اور ماہم انکہ بیگم سے وابستگی پیدا کی، اس کے نام جواہر العجائب کا دوسرا اڈیشن معنون کیا، اُس نے سلیمہ سلطان بیگم حرم اکبر بادشاہ کی بھی مداحی کی ہے، تقی اوحدی کے بقول فخری سنہ ۹۷۰ھ تک ہندوستان میں رہا ہے، اُسے حج کی

---

[۱] شہزادہ سام میرزا کی طرف سے سنہ ۹۲۷ھ میں ہرات کا نائب مقرر ہوا تھا، اس کے حالات کے لئے دیکھئے عالم آرائے عباسی [۲] شاہ اسمائیل صفوی کا بیٹا اور خراسان کا حاکم تھا، وہ فارسی کے مشہور تذکرہ تحفۂ سامی کا مؤلف بھی ہے، [۳] وہ شاہ اسماعیل صفوی کا وزیر تھا جو سنہ ۹۲۹ھ میں مقتول ہوا، دیکھئے عالم آرائے عباسی، [۴] شاہ اسماعیل کے زمانے میں خراسان کا وزیر تھا، نہایت علم دوست اور ادب پرور شخصیت کا مالک تھا، دیکھئے روضۃ السلاطین (مقدمہ۔ حاشیہ ص ۲۰۰) [۵] ایضاً ص ۲۷ (بقیہ حاشیہ ص آئندہ پر)

سعادت نصیب ہوئی تھی، مگر یہ معلوم نہیں کہ اس نے یہ فرض کس تاریخ میں ادا کیا،

فخری کی حسب ذیل تالیفات قابلِ ذکر ہیں،

(۱) ہفت کشور، اس کتاب کا موضوع تاریخ ہے لیکن اس پر افسانوی رنگ غالب ہے،
یہ کتاب شاہ اسماعیل صفوی کے نام پر لکھی گئی، اس کے نسخے تاشکند اور مدینہ منورہ میں ملتے ہیں
ایتھے، ریو، سپہ سالار کے یہاں بھی اس کے مخطوطے محفوظ ہیں، بظاہر ۹۲۷ھ سے قبل کی تالیف
اور فخری کی ابتداے جوانی کی مشق ہے۔

(۲) لطائف نامۂ فخری؛ میر علی شیر نوائی نے مجالس النفائس نام کا ایک تذکرۃ الشعرا
ترکی میں لکھا تھا اس کا متعدد فاضلوں نے فارسی میں ترجمہ کیا، ان میں ایک فخری کا لطائف نامہ ہے،
لیکن اس مترجم نے اس میں قابلِ قدر اضافے بھی کئے ہیں، برٹش میوزیم میں اس کا ایک قیمتی
نسخہ موجود ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اورنٹیل کالج میگزین میں (اگست ۱۹۳۱ء
تا فروری ۱۹۳۳ء) چھاپ دیا ہے، اس کے متعدد نسخے ملتے ہیں،

(۳) تحفۃ الحبیب جس کے بارے میں ہم خصوصیت سے گفتگو کر رہے ہیں، ایک بیاض ہے
جس میں ہم طرح اور ہم ردیف غزلیں جمع کی ہیں۔ اور ایک طرح در ردیف میں کم از کم چار
غزلیں ضرور اکٹھا کر دی گئی ہیں، تحفۃ الحبیب خواجہ حبیب اللہ ساؤجی کے نام پر لکھی گئی، قرین
قیاس ہے کہ یہ مجموعہ لطائف نامہ سے تقریباً ایک سال بعد ۹۲۹ھ میں مرتب ہوا، گلشن معانی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۹) ؁۵ اکبر کی دایہ جیجی بیگم ماہم انگہ بڑی شخصیت کی مالک تھی، اس کے ذکر سے اس دور کی تاریخیں پُر ہیں، ؁۶ سلیمہ سلطان بیگم بابر بادشاہ کی نواسی ہوتی تھی، اکبر کے حکم سے اس کا نکاح بیرم خاں سے ہوا، اور آخر الذکر کے قتل کے بعد وہ خود اکبر کے عقد میں آگئی، اس کی وفات ۱۰۲۱ھ میں ہوئی، اس کے حالات اکبر نامہ، منتخب التواریخ، اقبال نامۂ جہانگیری وغیرہ میں ملتے ہیں،

نے اپنے نسخہ کی بنیاد پر لکھا ہے، کہ اس میں ۲۳۹ شعراء کا کلام شامل ہے لیکن مولوی محمد مبین مرحوم کے نسخے میں اُن کی تعداد ۲۳۴ تھی، اس بیاض کے متعدد نسخے ملتے ہیں، دو خدا بخش خاں کے کتب خانہ بانکی پور پٹنہ میں ہیں، یہ ضخیم بیاض نہایت اہم ہے، لیکن ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے،

(۴) تذکرۃ روضۃ السلاطین حسبِ ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے،

۱۔ وجہ تسمیہ شعر و احوال بہرام گور، و ابتدائے نظم فارسی،

۲۔ دربیان احوال پادشاہان چغتائی، اوزبک و سلاطین ایشاں،

۳۔ دربیان احوال پادشاہان چغتائی از اولاد و امجاد امیر تمور،

۴۔ دربیان احوال پادشاہان عراق و روم،

۵۔ دربیان احوال بعضے از ملوک ہندوستان و دیگر اطراف

۶۔ دربیان احوال امراء،

۷۔ در ذکرِ جمیل حضرت نواب (شاہ حسن ارغون)

یہ کتاب شاہ حسن ارغون (م: ۹۶۲) کے نام پر مرتب ہوئی، سال ترتیب ۹۵۸ھ کے قریب ہوگی، یہ کتاب زیادہ ضخیم نہیں، لیکن نہایت مفید ہے، اس لئے کہ اس میں اکثر ایسے واقعات مذکور ہیں، جو کسی اور ذریعے سے نہیں ملتے، سید حسام الدین راشدی صاحب کے اعتبار سے سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۸ء میں اس کا ایک انتقادی متن مع ایک عالمانہ و محققانہ مقدمے و حواشی کے شائع کیا ہے،

(۵) صنائع الحسن، فارسی علم بدیع پر یہ کتاب شاہ حسن مذکور کے نام پر ۹۵۸ھ کے بعد مرتب ہوئی، اس کے محدود نسخے ملتے ہیں، دو نسخے آکسفورڈ اور ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم کے پاس ایک نسخہ تھا جس پر انھوں نے ایک مضمون

بھی شائع کیا تھا،

(۶) جواہر العجائب سنہ ۹۶۲ھ کی تالیف ہے اور فخری کی سب سے مقبول کتاب ہے، اس کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے، کہ کئی بار یہ طبع ہو چکی ہے، دو بار نولکشور نے چھاپی ہے، ایک بار سید شمس اللہ قادری کی ترتیب سے رسالہ اُردو میں طبع ہوئی ہے، آخری بار راشدی صاحب نے روضۃ السلاطین کے ساتھ ایک ہی جلد میں سنہ ۱۹۶۸ء میں اس کا انتقادی متن مع مفید تعلیقات کے شائع کیا ہے،

جواہر العجائب شاعرہ عورتوں کا مختصر سا تذکرہ ہے جو موضوع کی مناسبت کی بنا پر شاہ حسن ارغون کی بیوہ حاجی ماہ بیگم کے نام جو بعد میں عیسٰی خاں ترخان کی زوجیت میں آئی، معنون ہوا، لیکن فخری جب ہندوستان پہنچا تو اس نے پہلا دیباچہ بدل کر حضرت ماہم بیگم کے نام معنون کی اور آخر میں اس کی مدح میں ایک نیا قصیدہ بھی شامل کیا،

اگرچہ یہ تذکرہ مختصر ہے لیکن اُس کی معلومات نہایت گرانقدر ہیں، دراصل فارسی گو شاعرات کا یہ سب سے قدیم تذکرہ ہے،

(۷) دیوان فخری کہنہ مشق شاعر تھا، چنانچہ اس کا دیوان بھی مرتب ہو چکا تھا، دیوان کا ایک نسخہ تقی اوحدی نے آگرے میں دیکھا تھا، مگر اب وہ ناپید ہے، سید حسام الدین راشدی نے تحفۃ الحبیب اور مک مرتضائی کی رو سے فخری کی ۱۰۱ غزلیں جمع کر دی ہیں، جو روضۃ السلاطین اور جواہر العجائب کے ساتھ اسی مجموعہ میں شامل ہیں،

فخری کی طرف ایک اور بیاض بستان خیال منسوب ہے، میر الٰہی ہمدانی نے گنج الٰہی میں اور بعد کے مؤلفین و محققین نے اپنی اپنی تحریروں میں اسے فخری ہی کی تالیف قرار دیا ہے، مگر راشدی صاحب نے بستان خیال کو کیتاش قلی ابدال رومی کی تالیف بتایا ہے،

اب میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم کا خط جو میرے نام ہے، اور پھر مولوی محمد مبین نقوی صاحب کا خط جو پروفیسر رضوی کے نام ہے، مع فہرست شعرائے تحفۃ الحبیب کے شائع کر رہا ہوں، اور جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں، مبین صاحب کی تحریر بطور یادگار کے شائع کی جا رہی ہے لیکن اُن کی مرتبہ شعراء کی فہرست اہمیت کی حامل ہے۔

ادبستان۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ ۔ ۳

۲ر اپریل ۱۹۷۳ء

عزیز محتشم زاد اللہ شرفکم

اخبار ہماری زبان مورخہ ۲۲ر مارچ ۱۹۷۳ء سے یہ خوش خبری ملی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ۱۵ر مارچ کو آپ مجلس کے ممبر منتخب کیے گئے، مبارک باشد ۳۰۳ شعرائے فارسی کی ہم طرح غزلوں کا ایک قلمی مجموعہ موسوم بہ تحفۃ الحبیب مولوی محمد مبین نقوی الٰہ آبادی مرحوم کے پاس تھا، انھوں نے اس نایاب مخطوطہ کی کیفیت اور فہرست مندرجات بڑی تفصیل سے لکھ کر مجھ کو بھیجی تھی، یہ آج سے بیالیس سال پہلے کی بات ہے، مولوی صاحب مرحوم نے اس بارے میں جو خط مجھ کو لکھا تھا، وہ میں آپ کو اس خیال سے بھیج رہا ہوں کہ شاید ادبیات فارسی کی تحقیق کے سلسلے میں آپ اس سے کچھ کام لے سکیں

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے، والسلام

خیر اندیش

سید مسعود حسن رضوی

فضیلت مآب زادت الطافکم! تسلیم، اس معاملے میں قابل عمل مشورہ دیجیے، میرے پاس ایک نایاب قلمی مجموعہ شعرائے فارسی کی ہم طرح (یعنی ہم قافیہ و ردیف و بحر)

نوروں کا ہے جو ملا فخری ابن محمد امیری نے جمع کیا تھا، اور اسے دستور عالی نژاد حبیب اللہ آصف کے حکم سے اس کے جمع کرنے کا خیال ہوا تھا، جیسا وہ کہتا ہے :-

مثنوی :-

بحمد اللہ ایں دولتم دست داد — بالطاف دستور عالی نژاد
معین شہنشاہ ترک و عرب — حبیب اللّٰہش نام وآصف لقب

اور جمع کرنے کے بعد دستور معظم کی نظر سے بھی گزرانا تھا، جیسا کہ ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے :

شتا بندہ مامور فرماں شدم — بدان بزم عالی شتاباں شدم
چو ہمرہ مرا بخت واقبال بود — دہم داد دربان واحسان نمود
یکے بزم دیدم چو خلد بریں — درآں بزم سیمیں بران حور عین
نشستہ سلیماں صفت آصفے — بہر سو پری پیکرانش صفے
مرا دید وخواند از کرم سوئے خویش — نوازش کناں گفت پیش آئے پیش
بیا بنگرم تا چہ آوردۂ — چہ کار از کمال وہنر کردۂ
خرد چوں از و بر من ایں لطف دید — سلیمان و مورش بخاطر رسید
چو پیش آدم از مقام قرار — بر افلاک سودم سر افتخار
ندرے سخن پردہ بر داشتم — ز دانش بہ پیش نظر داشتم
تماش ز آغاز و انجام دید — ندا و تامل بنور سخن رسید
خور بہشیہ دستور با صلاح جاہ — زباں مبارک تحسیں کشاد
چنیں گفت دستور والا گہر — (دوسرا مصرع جلد بند نے کاٹ ڈالا ہے مگر یہ ظلم اور کہیں نہیں کیا ہے)

زہر گلشن گلبنے خواستی　　تکو بوستانے بیاراستی

اس مجموعے کا نام نہایت خوشخط (یعنی نستعلیق) لکھا کے ممدوح کے نام کی مناسبت سے تحفۃ العجیب جامع نے رکھا تھا، میں نے اسے اپنا خون بہ کے حاصل کیا، اور بعد کلام اللہ کے سب سے زیادہ اس ایک تحفہ نایاب سے فائدہ اٹھایا، اب مجھے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں، اور چاہتا ہوں کہ یورپ کے کسی قدر داں کے ہاتھ فروخت کر دوں، بشرطیکہ قیمت معقول ملے، اس کی امید نہیں کہ اس انمول تحفے کی قیمت ہندوستان میں کوئی حسب دل خواہ دیسکے، حالت اور کیفیت اس کی یہ ہے:۔

حجم ہزار صفحوں سے زیادہ ہے، فولس کیپ کاغذ سے بڑی تقطیع ہے۔ دو سو چھتیس شعرائے معروف کا کلام یعنی پوری پوری غزلیں ہیں، مگر غیر معروف شعرا کا کلام بھی کچھ کم نہیں لاعلمہ دکلا ادری کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے، خط ایرانی ہے مگر نہایت واضح اور جلی جس روشنائی سے کتابت ہوئی تھی، وہ بھی اب معدوم ہے۔ شروع اور اخیر کا ایک ایک صفحہ میں نے رو رو کے نکال دیا، کیونکہ جاہلوں کی قدر ناشناسی سے وہ دونوں بیکار ہوگئے تھے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن شعرا کا کلام لیا گیا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا نام تو تذکروں میں ہے، مگر پوری غزلیں سوا اس مجموعے کے اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتیں، علی الخصوص بادشاہوں کا تبرک بہت ہے، شاہزادوں کا کیا ذکر ہے،

یہ تحفہ نایاب شاہ جہانگیر کے زمانے کے بعد جمع کیا گیا ہے، کیونکہ جہانگیر کی کئی غزلیں اس میں لی گئی ہیں، مگر ہندوستان کا نہ تو کاتب ہے، نہ جامع نیضی فیاضی کی کوئی غزل اس میں نہیں، اس سے مرزا غالب کا وہ قول صحیح سمجھا جا سکتا ہے، کہ فیضی کی اکثر جگہ ٹھیک نہیں

لہ واضح ہو کہ یہ قیاس سراسر غلط ہے۔ "نذیر"

نکل جاتی ہے۔ "بہت سے ایسے الفاظ کی سند ملتی ہے جنھیں ہندوستانی لغت لکھنے والے اپنی تنگ نظری سے غلط سمجھتے ہیں، بہتیرے ایسے محاورات ملتے ہیں، جن کے غلط معنی ہندوستانیوں نے لکھے ہیں، وہ الفاظ بھی ہیں جن کے متعلق جاہلوں نے فضول بحثیں کی ہیں، مولانا آزاد کی رائے کی تائید کہیں ہوتی ہے، کہیں نہیں ہوتی، حالی کی حماقتیں اور صہبائی کی زبردستیاں اس سے ثابت کرنے والا خوب خوب ثابت کر سکتا ہے، شعرائے ایران کا باہمی موازنہ جیسا اس مجموعے کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے، اور کسی کتاب سے ممکن نہیں، کوئی شاعر اس میں ایسا مذکور نہیں جو مستند نہو، کوئی کلام ایسا نہیں لیا گیا جس میں عیب ہو، غالباً جامع وہی فخری ہے جس کی تاریخ فخری ہے، مجکو تلاش سے اب تک فخری کا کوئی نسخہ نہیں ملا، ورنہ معلوم ہوجاتا کہ یہ کون فخری ہے، مگر یہ محقق ہے، کہ ایران کا معتبر شاعر ہے، بہتیرے غلط نسخے اس مجموعے سے صحیح کئے جا سکتے ہیں، اگرچہ یہ خوش نویس بھی غلط نویسی کے الزام سے نہیں بچ سکتا، یہ مجموعہ ایک جگہ رہن تھا، راہن کے لاوارث مرنے پر مرتہن نے میرے ہاتھ بیچ ڈالا، اب میں نے اس کے واسطے کیا دیا ہے، اس کا جواب ذرا مشکل ہے، کیونکہ جو کچھ دیا ہے، وہ اتنا ہے کہ مرتے مرتے بھی نہ دیتا، مگر ایسی کتاب پر جان تو کیا ہے ایمان تک قربان کرنے کو تیار ہوجاتا، میں کسی حالت میں اسے مکان سے دور لے جانے پر ان شاء اللہ تعالیٰ آمادہ نہونگا، زوجہ کے زیوروں کے صندوق میں مقفل رکھتا ہوں، صرف مولوی جلال الدین صاحب کو اس کی زیارت کرادی ہے، ہاں اگر کوئی صاحب میرے مکان پر دیکھنا چاہیں گے تو ضرور دکھا دوں گا، مگر اس شرط پر کہ اس کتاب سے ایک لفظ بھی نقل نہ کریں،

ایک دیوان حافظ قلمی بھی دنیا سے نرالا میرے پاس ہے، وہ بھی فروخت کرونگا، اس کا حال یہ ہے کہ حافظ کے جو قصائد معدوم سمجھے جاتے ہیں، وہ سب اس میں موجود ہیں، اصلی

ثابت کر دینا میرا کام ہے، جو غزلیں حقیقۃً الحاقی ہیں، اُن کا پتہ اس سے بخوبی چلتا ہے، ایک شرح لمعہ[1] بھی ہے، یہ وہ نسخہ ہے جو اب سوا میرے دنیا میں کسی کے پاس نہیں، چودہ علماے عراق کے پاس یہ نسخہ وقتاً فوقتاً رہن کیا گیا، ان سب کی مہریں اور رہن کی تاریخیں اس میں موجود ہیں، اس نسخے کو میں نے لکھوا لیا ہے، اب اصل کی ضرورت نہیں، مگر علما و مجتہدین کا تبرک ہے اور بقول مولانا امجد حسین مرحوم کے نایاب ہے، اسلئے یہ بھی سونے میں تلے گا، توجہ اگر ونگا ورنہ جانی[؟] کے ساتھ تحفۃ الحبیب کے شعرا کی فہرست منسلک ہے، اسے قائم کر کے مشورہ مفید سے سرفراز فرمائیں، یہ عرض اس خیال سے کی گئی ہے، کہ جوہر را جوہری می شناسد، فقیر حقیر محمد مبین نقوی،

محلہ چک شہر الٰہ آباد، ۱۵ر اکتوبر ۳۲ء،

عرض ثانی یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب یہ کتابیں میرے مکان پہ دیکھنا چاہیں اور اس دیکھنے سے یہ غرض ہو کہ وہ مجھ سے معاملہ کریں تو یہ تحریر اُن کو عنایت کر دیجیے گا جتنا لکھا ہوا اُس کا ایک ایک لفظ بلکہ نقطہ خواہ وہ اوپر ہو یا نیچے صحیح ثابت کر دوں گا، مگر خواہ مخواہ میرا وقت ضائع نہ کیا جائے، "مبین"

الف ممدودہ	آبی، آذری، آصفی، آگہی، آہی،
الف مقصورہ	ابن حسام۔ ابن یمین، ابوالخیر، ابو نصر بهنه، احمد، اسعدی، کمال اسماعیل اسیری، میرزا اصغر مشهدی۔ اصیلی۔ افسری۔ خواجہ افضل، امیر حسن علی جلائر۔ امیر محمود برلاس امیری۔ امیر سلطان ابراہیم صدر امینی۔ سید میر جاج اُنسی، انیسی، اوحدی، اہلی ترشیزی۔
ب	بابر قلندر۔ عبدالباقی باقی۔ بدیع الزماں میرزا بدیعی۔ بساطی، بہشتی حصاری عبداللہ مروارید بیانی، بیضائی حصاری بیکسی۔
ت	تابعی۔ تابی۔

---

[1] مسودہ میں یہ لفظ صحیح پڑھا نہیں جاتا ہے،

ش | انسری شانی (شانی تخلص ہے)

ج | عبدالرحمان جامی۔ جانی بندری۔ باباجزوی۔ جلال طبیب، جلال عضد۔ جلالی رفیقی جمشید معمائی۔

ح | حافظ سعد شمس الدین حافظ شیرازی۔ بنائی حالی۔ سلطان علی حالی اوبہی حبیب کاشی حریمی۔ ملک حسام ابن سلطان سکندر ہندی۔ خواجہ حسن قندھاری۔ حسن دہلوی حسن شاہ۔ امیر حسینی سادات حکیمی طبیبی۔ حلوائی سمرقندی۔ حیدر کلوچ۔ درویش حیدر تونی حیرتی۔

خ | خاتمی۔ خادمی۔ امیر خسرو۔ ناصر خسرو۔ خسروی خلاقی بخاری۔ افصح المتکلمین خواجوے کرمانی۔ خواجہ خوانندہ۔ خواجہ خیابانی۔ خیال۔ خیالی۔

د | داعی۔ دائمی استرآبادی۔ درویش دہکی۔ سلطان علی دوائی۔ دوست مرقو دستی۔ دوستی کاتب۔ دیوانہ ختاپوری۔

ذ | سید ذوالفقار شروانی۔

ر | محمد قورچی رائی۔ قاضی عبدالرحمن رحمانی۔ روح عطار[۱]۔ ریاضی سمرقندی۔

ز | مولانا زین۔

س | سالمی۔ سائلی۔ نواب شاہ حسین میرزا سپاہی۔ سرودی مروی۔ سعد۔ سعدی سلامی۔ خواجہ سلمان۔ سلمان ساوجی۔ سہیلی۔ سید نعمت اللہ[۲] سید ودلی۔ سیفی بخاری۔

---

[۱] یہ بھی تخلص ہے،

نہ تنہا روح عطارش اسیر زلف مشکیں شد   بہر موے اسیرے ہست ہمچون روح عطارش

[۲] سید نعمت اللہ کبھی سید کبھی ولی تخلص کرتے تھے،

ش | حسن شاہ شاعر۔ شامی۔ امیر شاہی سبزواری۔ شرف خیابانی۔ شرف یزدی۔ شمس حاجی شیرازی۔ درویش مقصود تیر گر آشوقی۔ شہاب معمائی شہیدی۔

ص | امیر محمد صالح۔ صائم) دیوان۔ صبحی اوبہی۔ صدر لاجوردی۔ صفائی اندجانی۔ صفائی کرمانی۔ صفی۔ میرینی۔

ض | ضعفی۔ ضیلو استرآبادی۔ محمد قاسم ضیائی۔

ط | طالب جاجرمی۔ مولانا محمد طاقی۔ طالعی۔ مولانا طوسی۔

ظ | ابو طاہر طاہری کاتب۔ ظہوری ارلات۔ ظہیر۔

ع | عابدی۔ بایسنقر میرزا عادلی۔ ملا میر عربانی۔ عارف و الد ابوسعید ورانی۔ عارفی۔ عالم بیہقی۔ قاضی عبدالرحمٰن۔ عبید زاکانی۔ عبیدی۔ عراقی۔ عصمت اللہ عصمت۔ عضد بخاری۔ امیر عطاء اللہ عطائی۔ علمی قانونی۔ عماد فقیہ۔ خواجہ محمد عہدی نبیرہ خواجہ رحمداد۔

غ | شاہ غریب میرزا غریبی۔ غیاث قافیہ۔ غیاثی بلخی۔

ف | شیخ ابوالوجد فارغی۔ فاضلی امیر علی شیر خانی۔ فخری۔ خواجہ ابوالبرکہ فراقی۔ فروغی سمرقندی۔ فرہاد۔ فریدون۔ فضلی ہروی۔ فغانی۔ فکری۔ ملی فیضی۔

ق | قاسم۔ قاسم انوار۔ قاسمی۔ قبولی قندری۔ قیدی۔

ک | کاتبی۔ کامران میرزا۔ احمد شاہ حسین کامی نوکرزی۔ قاسم کاہی۔ کمال ججندی۔ خواجہ کمال الدین حسین ابن خواجہ نظام الملک طوسی۔ کوکبی۔

لہ ماوح ہمایوں بادشاہت۔ اوراست سہ

ظل حق شاہ ہمایوں کہ غبار قدمش   طعنہ بر مشک تر و عنبر سارا زدہ است

گ | گردانی - محتی -

ل | شهاب الدین لسانی -

م | مانی تبریزی - مجنون رفیقی - مجنون قلندر سمرقندی - محمد ابن حسام - محمد بدخشی -
محوی - محیی - مرادی کوکلتاش - مراقی - مسعود قمی - مسیحی - مشفقی - مغربی - مفلسی -
مقبول - ملک باخرزی - امیر منصور ترقراولم - منصور ساده - موبد هند - مهدی -
میر الگر کوب - شیخ میرک - میرکی شیرازی - میرم -

ن | نادر سمرقندی - نادری مروی - ناصر بخاری - ناصری - ناظری - صدر نامی لاجرد مشهدی
نثاری تونی - نورغوریانی بخزی - سلطان محمود نذائی - نرگسی - حکیم نزاری - سید نسیمی - نصیری
امیر حسن علی شیخ نظام - قاسم نظمی - نورکمال نودی - نوری سمرقندی - میرزا علی نویدی نیشاپوری
نویدی هروی - نیازی بخاری -

و | واحدی شیرازی - غیاث الدین رنگرز وافی - وحید تبریزی - وصفی - امیر احمد جامی،
وفائی سمرقندی - ولی آملی - شاه نعمت الله سید ولی - (هر دو تخلص)

ه | عبدالله هاتفی - هادی محتسب - هادی مشهدی - هاشم کمان گر - شاه جهانگیر هاشمی
هلالی - همام تبریزی - همایون[1] بادشاه - همتی مروی - آقا شهاب الدین هندی - هوائی -

ی | امیر محمد یوسف یتیمی - یوسف هند - یوسفی طبیب - سلطان یعقوب - شاه بیگ یقینی -
یقینی کاتب -

جمله شعرا ، ۲۳۶ -

---

[1] همایون بادشاه می گوید -

میتم شد غم تو در دلم چه چاره کنم عجب غمیست مگر دل ز سنگ خاره کنم

متنبی کی شخصیت اور شاعری

از جناب شفیق احمد خاں ندوی لکچرر عربی اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

چوتھی صدی ہجری میں دولت عباسیہ کا آفتاب اقبال عین نصف النہار پر ضوفگن
ا، اس کے حدود سلطنت کی وسعت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ دور دراز کے بکثرت علاقوں
، مرکزی اقتدار کی گرفت سے نکل کر اپنی علحدہ چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں
شبہہ سیاسی حیثیت سے یہ انقلاب خلافتِ بغداد کی کمزوری کا باعث ضرور ہوا،
لن شعر و ادب اور علم و فن کو اس سے بے انتہا عروج نصیب ہوا، کیونکہ سلطنت آل بویہ
ولت سامانیہ، حمدانیہ، فاطمیہ اور غزنویہ کی باہمی مسابقت سے علم و ادب کا
یلاب سا آگیا تھا، ان حکومتوں کے ادب نواز حکمرانوں کے دربار باکمال شعرا کی
زاسنجیوں سے پرشور تھے، علمی و ادبی ترقی کے اسی عہد زریں میں ابو الطیب متنبی نے
پنے فکر و شعور کی آنکھیں وا کیں، شعرائے مولدین کے طبقہ میں جن شاعروں نے اپنی
عظمت اور بقائے دوام کے یادگار نقوش چھوڑے ہیں اُن میں ابو تمام، بحتری، بشار
اور ابو نواس کے ساتھ متنبی کا نام بھی ممتاز اور سرفہرست ہے، بلکہ کچھ نقادوں نے
اس کو بعض حیثیتوں سے دوسرے ہم عصر شعراء پر فوقیت و ترجیح دی ہے،

متنبی کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت کے پیش نظر اہل سیر و تنقید نے اس کے
ساتھ خصوصی اعتنا کیا ہے، علامہ ثعالبی نے تو اپنی شہرۂ آفاق تصنیف یتیمۃ الدہر

میں اس پر تقریباً سو صفحے لکھ ڈالے ہیں، اور اب عربی زبان میں متنبی پر مستقل اور نہایت وقیع
کتابیں منصۂ شہود پر آگئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ متنبی کے شاعرانہ کمال اور اس کے محاسن کلام
کے اثرات بہت دور رس ثابت ہوئے، آج تک اہل علم برابر اس کو خراج تحسین پیش
کرتے آرہے ہیں، عرصہ ہوا مصری رسالہ "الہلال" میں الکتب التی افادتنی کے عنوان
سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا، جس میں تقریباً سب ہی اظہار خیال کرنے والوں
نے متنبی اور اس کے دیوان سے اپنی شیفتگی اور اس کے غیر معمولی اثرات کا نہایت شاندار
الفاظ میں ذکر کیا تھا، دیوان متنبی کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا
ہے کہ ابتک اس کی چالیس سے زیادہ شروح کی تحقیق ہو چکی ہے۔ ذیل کے مضمون میں ہم
متنبی کی شخصیت اور محاسن کلام کا اجمالی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حیات و شخصیت ابو الطیب احمد بن حسین المتنبی ~~۳۰۳ھ~~ ۹۱۵ء میں بمقام کوفہ ایک نہایت غریب
اور فلاکت زدہ سقہ کے گھر پیدا ہوا، اور وہیں ابتدائی نشو و نما پائی، پھر اس کا باپ اپنے
بیٹے کی تعلیم و تربیت کے خیال سے اس کو لیکر شام چلا گیا، جہاں متنبی کی صلاحیتوں کو آزادی
کے ساتھ پھلنے پھولنے کا موقع ملا، وہ فطرۃً عالی ہمت، مہم جو اور جاہ و شرف کا دلدادہ
تھا، والیِ انطاکیہ ابو العشائر کے توسط سے حلب پہنچا، جہاں ایک عرصہ تک مشہور
حکمراں سیف الدولہ کی اور اس کے بعد کچھ دنوں مصر کے ملک کافور اخشیدی کی مدح
کرتا رہا، عضد الدولہ کے دامن دولت سے بھی کچھ عرصہ وابستہ رہا، بالآخر رمضان
۳۵۴ھ ۹۶۵ء میں معز الدولہ کے دربار کو بغداد جاتے ہوئے کسی پرانی رنجش کے باعث فاتک
ابن ابوجہل نے اس کا چراغ حیات گل کر دیا، اس وقت متنبی کی عمر ۵۱ سال کی تھی،

ذہانت بچپن ہی سے متنبی کی ذہانت کے چرچے شروع ہو گئے تھے، وہ نثر ہو یا نظم جو کچھ بھی سنتا

دبجز و یاد ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں اس کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ اس نے ابوعبید
ی لغت کو صرف ایک بار دیکھکر اول سے آخر تک زبانی سنا دیا تھا،

وہ بچپن ہی سے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتا تھا، سن رشد تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک ادرالکلام شاعر بن گیا، اس کے ساتھ ہی لسانیات اور لغت پر بھی عبور حاصل کرلیا یک مرتبہ اس کے ایک استاد شیخ ابو علی فارسی نے پوچھا فِعلیٰ کے وزن پر کتنے جمع آتے ہیں؟ متنبی نے برجستہ حجلیٰ اور ظربیٰ دو وزن بتائے۔ شیخ کا بیان ہے کہ میں تین دن تک لغت کی کتابوں میں اس وزن پر کسی تیسرے لفظ کی تلاش میں سرگرداں رہا مگر نہ پا سکا۔

تعلیم و تربیت | ۳۲۱ھ میں متنبی اپنے باپ کے ساتھ شام پہنچا، اس وقت وہ سن شباب کو پہنچ چکا تھا، اس کے بعد تقریباً پندرہ سال تک وہ شام میں تعلیم حاصل کرتا رہا، ساتھ ہی معاش کے لیے شامی امراء کی قصیدہ خوانی کر کے پیٹ پالتا رہا، عربی زبان کے محاورات و امثال سیکھنے کے لیے اس نے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا،[1]

اسی اثناء میں اس کے والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا، جس کے باعث اس کی زندگی نہایت بے کیف ہوگئی، اب وہ محض ایک پیشہ ور قصیدہ گو بن گیا، امراء کی ثناء خوانی کر کے روزی حاصل کرتا، نامساعد حالات، افلاس و متواتر مصائب نے اس کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، مگر اس کے عزم و ہمت کی بلندی اور حب جاہ میں کوئی فرق نہ آیا، وہ کہتا ہے:

---

[1] یتیمۃ الدہر ثعالبی ج ۱

ضاق صدری وطال فی الرزق قیامی وقل عنہ قعودی
ابداً اقطع البلاد ونجمی فی نحوس وھمتی فی سعودی

[مصائب سے میرا دل تنگ ہو گیا، اور طلب رزق میں قیام اور تھکن کی کثرت سے مجھ پر عیش و عشرت حرام ہو گیا، گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس حال میں پھرتا ہوں کہ میری قسمت نحوست کے گرداب میں پھنسی ہے، لیکن عزم وہمت ہیں کہ ہر آن کامیابی کی جانب مائل کیے جا رہے ہیں]

شام میں اس نے تقریباً ۴۴[1] قصائد لکھے جن میں ۳۲ میں امرائے شام کی مدح سرائی تھی ان قصائد میں ممدوحین کے علاوہ اس نے خود اپنی تعریف اور زمانہ اور اہل زمانہ کی سرد مہریوں کا شکوہ کیا ہے، پانچ قصائد میں زیادہ تر اپنی خواہشات کا ذکر، اپنی ذات پر فخر اور دنیا والوں پر عتاب ہے، یہ قصائد آمال و آلام کے آئینہ دار ہیں، ایک قصیدہ میں اچھے پڑوسیوں اور شریف لوگوں کے مفقود ہو جانیکا رونا روتے ہوئے کہتا ہے کہ زمانہ میں شرافت کا جنازہ ہی نکل چکا ہے ؎

ولم ار مثل جیرانی ومثلی لمثلی عند مثلھم مقام
بارض ما اشتھیت رأیت فیھا فلیس یفوتھا الا الکرام

علی حمزہ بصری متنبی کی سیرت و شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ متنبی نے کبھی نماز، روزے اور تلاوت قرآن سے کوئی خاص واسطہ نہیں رکھا، لیکن جھوٹ اور دیگر بدکاریوں سے بھی وہ محفوظ رہا، دیگر اہل نظر نے اس کے اخلاق و کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کو پاک باز کردار کا حامل بتایا ہے، کیونکہ وہ عیش و طرب کی مجلسوں

---

[1] جوزف الہاشم: المتنبی ص ۲۴

سے دور رہا، شراب وکباب سے بھی اس کو نفرت تھی، تصنع اور تکلف سے بھی وہ بیزار تھا، شہر کی چمک دمک کے مقابلہ میں دیہات کے حسن سادہ کو زیادہ پسند کرتا تھا ایک جگہ کہتا ہے؛

حسن الحضارة مجلوب بتطرية حسن البداوة حسن غير مجلوب

ابن فورجہ کا بیان ہے کہ متنبی بڑا بہادر، بے باک، صاف گو، تلخ زبان اور آداب مجلس سے پوری طرح واقف تھا، اس میں سوائے حرص اور بخل کے کوئی ایسی بات نہ تھی جو باعثِ ننگ وعار ہو،

حقیقت یہ ہے کہ متنبی کی پوری زندگی کبر ونخوت سے بھری ہوئی تھی، جیسا کہ اس کے تخلص سے بھی ظاہر ہے، خود متنبی کے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخلص اس کو لوگوں کی طرف سے بطور طنز کے ملا تھا جو بعد میں اس کے نام کا جزء قرار پا گیا، ایک بار جب وہ خود کو جود وکرم کا پروردہ اور دنیائے شعر وسخن کا امام مطلق بتاتے ہوئے دشمنوں کے حق میں ہلاکت ووبال اور زہر ہلاہل بتا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خدا میری قوم کو سمجھے کہ اس نے میرے ساتھ وہی نامناسب معاملہ اختیار کر رکھا تھا جو حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ انکی ناکارہ قوم کا تھا ؎

انا ترب الندى ورب القوافي وسمام العدى وكيد الحسود

انا في امة تداركها الله غريب كصالح في ثمود

تو لوگوں نے اس کو متکبر اور بناوٹی نبی (متنبی) کے نام سے پکارنا شروع کر دیا، جو رفتہ رفتہ مشہور ہو گیا[۱]

دعوئ خلافت | ناتجربہ کاری اور عنفوان شباب ہی میں حب جاہ نے اسکو خلافت و

---

[۱] احمد سعید البغدادی: امثال المتنبی وحیاتہ ص ۳۰

امامت کی ہوس نے دیوانہ کر دیا، چنانچہ اس نے خلافت کا دعویٰ کر دیا، بعض مریدین بھی اردگرد جمع ہوگئے، امیر حمص کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے متنبی کو قید کرا دیا، جیل خانہ سے متنبی نے امیر حمص کی شان میں ایک قصیدہ لکھ بھیجا جس کا مطلع یہ ہے،

دعوتك لما براني البلى		أوهن رجلي ثقل الحديد

اس قصیدہ نے امیر حمص کو پگھلا دیا، اس نے اس کے صلہ میں صرف اتنا کیا کہ اس کو قید سے رہا کر دیا،

ادعائے نبوت | بہت سے مورخین نے لکھا ہے کہ جوانی کی عمر سے متجاوز ہو کر اس نے شام کے مشہور قبیلۂ بنو کلب میں جاکے نبوت کا بھی دعویٰ کیا تھا، بہت سے حوارین بھی فراہم ہوگئے تھے، اپنی چرب زبانی اور قادر الکلامی کی بنا پر اس نے ایک مصحف بھی گڑھ لیا تھا، اخشیدیہ کے نائب لولو (والی حمص) نے فوج کے ذریعہ اس کی اور اس کے سینکڑوں متبعین کی سرکوبی کی اور اس کو مقید کر دیا، ساتھی فرار ہوگئے اور وہ ایک طویل مدت تک قید میں رہا، پھر توبہ کر کے رہائی حاصل کی،[1]

حقیقت یہ ہے کہ اس نے عنفوانِ شباب میں خلافت کا دعویٰ ضرور کیا تھا، نبوت کا دعویٰ کبھی نہیں کیا،

متنبی کی وجہ تسمیہ | ثعالبی نے ابن جنی کا بیان نقل کیا ہے کہ اس نے ابوالطیب سے سنا، وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے متنبی کے لقب سے محض میرے اس شعر کی وجہ سے پکارا جاتا ہے ؎

انا في امة تداركها الله		غريب كصالح في ثمود

کیونکہ اس شعر میں خود کو حضرت صالحؑ جیسے جلیل القدر نبی سے مشابہت دی ہے۔[2]

---

[1] تاریخ بغداد و [2] ابومنصور الثعالبی: یتیمۃ الدہر ج ۱ ص ۹۳

یاقوت نے "معجم الادبا" میں متنبی کے معاصر شاعر ابوحسین ناشی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ناشی ۳۲۵ھ میں کوفہ کی جامع مسجد میں کچھ اشعار لکھوا رہا تھا، ابوالطیب وہاں موجود تھا، وہ اس وقت تک متنبی کے لقب سے جانا نہیں جاتا تھا، متنبی خود کو اس لقب سے ملقب کرنا پسند نہیں کرتا تھا، تحقیق کرنے پر وہ کہتا تھا کہ یہ لقب تو "نبوة" سے مشتق ہے، جس کے معنی المرتفع من الارض (بلند ٹیلا) کے ہیں،

ان تمام حقائق کی بنا پر صحیح یہی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس نے محض خلافت کی بیعت کا اعلان کیا تھا، نبوت کا نہیں، اس کی بود و باش بھی بچپن ہی سے باغی و سرکش قبائل میں رہی تھی، یہ قبائل اس کی معجز نمائی اور قدرت کلام کے گرویدہ تھے، ان ہی میں سے کسی نے اپنے ایک شعر میں اس کو پیغمبر شعر و سخن کہا، اور یہ کہا کہ اس کے معجزات معانی آفرینی میں ظاہر ہوئے ہیں ؎

هو فی شعره نبی ولکن ظهرت معجزاته فی المعانی

انطاکیہ اور جنوبی شام میں | وہ بے کسی و بے بسی کے عالم میں حمص سے حلب پہنچا، وہاں سے غیر مطمئن ہو کر انطاکیہ روانہ ہو گیا، اور وہاں کے شرفا و امرا کی مدح سرائی کر کے اپنا پیٹ پالتا رہا،

غرض اس طرح ایک عرصہ تک وہ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، پھر انطاکیہ میں سیف الدولہ کے گورنر ابوالعشائر کے ہاں پناہ گزیں ہوا، ابوالعشائر کی مدح میں کئی قصائد لکھے جن میں سب سے مشہور یہ قصیدہ ہے ؎

مالی لا امدح الحسین ولا أبذل مثل الود الذی بذله

ابوالعشائر نے اس کی ہر ممکن قدر افزائی کی، اور متنبی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مؤثر

انداز میں سیف الدولہ کے حضور تعارف کرایا، سیف الدولہ نے متنبی کو اپنے دربار گہربار میں بلالیا، چنانچہ اب متنبی انطاکیہ سے حلب آگیا،

سیف الدولہ کے دربار میں | ۹۴۸ء (۳۳۷ھ) میں متنبی سیف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوا، بے شبہہ یہ متنبی کا دور زریں تھا، نو سال (۳۴۵ھ) تک وہ مسرور و مطمئن تھا، اپنے آقا سیف الدولہ کی تعریف و توصیف اور اس کے لشکر، فتوحات اور کارناموں کے تذکرہ میں رطب اللسان رہا، یہیں سے اس نے فن حرب اور شہسواری کی تربیت حاصل کی، یہاں وہ ایک مخلص دوست، جانباز ساتھی، جان نثار مجاہد، یگانہ روزگار ادیب اور جادو بیان شاعر کی حیثیت سے خلوت و جلوت میں سیف الدولہ کا دستِ راست رہا، ڈاکٹر ذکی المحاسنی لکھتے ہیں:۔

کذالک بدأ ابو الطیب یحیا الطور الثانی من سیرته فبقی فی حلب من سنة ۳۳۷ حتی سنة ۳۴۵ و فی هذا الطور قال أروع شعره فی تصویر المعارک والوقائع وقد ازداد معرفة بالسلاح والحرب منذ لزم سیف الدولة[1]

یہاں وہ سیف الدولہ کی تعریفوں کے پل باندھتا رہا اور سیف الدولہ مسرور ہو کر اسے مال و متاع سے نوازتا رہا،

کم و بیش نو سال کے بعد متنبی ان تمام تنعمات سے اکتا گیا، حب جاہ اس کی فطرت تھی، وہ کسی نہ کسی طرح مصر کا والی بننا چاہتا تھا، چنانچہ اب خوب سے خوب تر کی جستجو میں اس کا دل زیادہ سرگرم عمل رہنے لگا، جیسا کہ وہ اشارہ بھی کر رہا ہے۔

---

[1] الدکتور ذکی المحاسنی: ابو الطیب ص ۱۰۲

ولکن قلبی بین جنبی مالہ مدی ینتھی بی فی مرادا حدّا

دوسری بات یہ کہ سیف الدولہ بذات خود ایک عالم اور بلند پایہ نقاد سخن تھا، وہ حقیقت سمجھنے لگا، اس کا دربار شعراء ادبا کا مرکز تھا، متنبی اپنے فن پر نازاں ہوگیا، معاصرین کی تحقیر و تذلیل کرنے لگا، جوابا دوسرے لوگ بھی اس سے جلنے لگے، ایک بار اس نے یہ کہا کہ شاعر تو درحقیقت متنبی ہی ہے، باقی سب لوگ متشاعر (نقلی شاعر) ہیں، اسی طرح جس طرح تلواریں بہت ہیں مگر سیف الدولہ (حکومت کی تلوار) بس ایک ہے ؎

خلیلی انی لا اری غیر شاعر فکم منھم الدعوی ومنی القصائد

فلا تعجبا ان السیوف کثیرۃ ولکن سیف الدولۃ الیوم واحد

تو اس شعر پر تمام درباری ادبا چراغ پا ہو گئے۔

باہمی رقابتیں بڑھتے بڑھتے اس درجہ تک پہنچ گئیں کہ ایک بار بھرے دربار میں مشہور شاعر ابن خالویہ سے متنبی کی سخت جھڑپ ہوگئی، ابن خالویہ نے اپنی کنجیوں کا گچھا متنبی کو ماردیا، سیف الدولہ دیکھتا رہا، کوئی بازپرس بھی نہ کی، متنبی کو اس سے شدید صدمہ لاحق ہوا، اور وہ کچھ دن خاموش رہا، پھر ایک دن (دمشق کے قصد سے) وہ سیف الدولہ کو چھوڑ کر رخصت ہوگیا،

متنبی نے سیف الدولہ کی شان میں تقریباً ۸۰ طویل قصائد اور ۱۶۷۵ اشعار لکھے، متقدمین و متاخرین میں شاید ہی کسی شاعر نے اتنا بڑا نذرانۂ عقیدت کسی بادشاہ کے حضور پیش کیا ہو، خزانۃ الادب میں عبد القادر بغدادی لکھتے ہیں کہ "صرف چار سال میں سیف الدولہ نے ۳۵ ہزار دینار سے زیادہ متنبی کو دیے"

ملک کافور کے دربار میں ۳۴۶ھ میں متنبی مصر کے ملوک و سیاہ فام بادشاہ کافور اخشیدی

کے دربار سے وابستہ ہوا، کافور کے ہاں وہ برابر کسی نہ کسی ریاست کا والی بننے کا آرزو مند رہا،
چنانچہ اشاروں کنایوں سے گذر کر پھر وہ واضح طور پر حرفِ مطلب زبان پر لے آیا
کہتا ہے ؎

ابا المسك هل في الكأس فضل أناله   فاني اغنى منذ حين وتشرب

اے ابوالمسک کافور کیا آپ کے پیالے میں کچھ بچا کھچا بھی نہیں ہے؟ میں ہوں کہ ایک عرصے
محض گا رہا ہوں اور آپ تنہا نوش فرما رہے ہیں،

اس کے بعد کہتا ہے ؎

وهبت على مقدار كفي زماننا   ونفسي على مقدار كفيك تطلب

اذا لم تنط بي ضيعة او ولاية   فجودك يكسوني وشغلك يسلب

آپ نے زمانہ کو میری ہتھیلی کے بقدر عطا کیا، میں تو آپ کی ہتھیلی کے بقدر کا طلبگار ہوں
اگر آپ نے کسی جائداد یا ولایت کے منصب سے سرفراز نہ کیا تو آپ کا جود بخشا مجھکو مالامال کرے گا،
پھر بھی آپ کا ولایت سے مجھکو محروم رکھنے کا کام سوگوار رکھے گا۔

کہا جاتا ہے کہ کافور شروع شروع میں اس بات پر راضی تھا کہ وہ اس کو کسی صوبہ کا گورنر بنا دیگا مگر پھر کچھ ایسی باتیں پیش آئیں کہ وہ اس کے اخلاص پر شک کرتے ہوئے ٹال مٹول
متنبی کافور کے دربار میں ساڑھے چار سال تک رہا، اس عرصہ میں اس نے کافور کی مدح میں وشل قصائد کہے جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۴۰۳ ہے،

متنبی ۹۶۲ء میں مصر سے فرار ہو گیا، اس وقت اس نے جو قصیدہ کہا ہے وہ آج بھی حسرت و یاس کی زندہ تصویر ہے، اتفاق سے وہ عید کا دن تھا، لوگ خوشیاں منا رہے تھے لیکن متنبی حسرت کے عالم میں کہہ رہا تھا ؎

عید بأیۃ حال عدت یا عید — بما مضی ام لامر منک تجدید
اما الاحبۃ فالبیداء دونھم — فلیت دونک بیدا دونھا بید

اے عید تو کس حالت میں پھر اس بار آئی ہے؟ یا ماضی لیکر یا کوئی نیا پیغام؟ آج تو میرے اور میرے محبین کے درمیان دوری کی زبردست خلیج حائل ہے، کاش کہ میرے اور تیرے درمیان بھی دوری کی خلیج حائل ہوتی اور تو آج آتی ہی نہیں۔

سیف الدولہ کی پیشکش | ربیع الاول ۳۵۱ھ میں متنبی کوفہ پہنچا، جب مصر سے اسکے فرار کی خبر سیف الدولہ کو ملی تو اس نے اپنے ایک لڑکے کو ہدایا و تحائف کے ساتھ متنبی کے پاس بھیجا اور اسے دوبارہ حلب واپس آنے کی درخواست کی، متنبی کی خودداری نے اسے گوارا نہ کرتے ہوئے محض ایک مدحیہ قصیدہ جواباً ارسال کر دیا،

ابن العمید الکاتب سے ملاقات | ۳۵۴ھ میں متنبی مشہور ادیب ابن العمید کے پاس پہنچا، ابن العمید نے اسکے ساتھ نہایت عزت و اکرام کا سلوک کیا، اس نے متنبی کو عضد الدولہ کے یہاں جانے کا مشورہ دیا، یہی نہیں بلکہ اس نے عضد الدولہ سے متنبی کا شاندار تعارف بھی کرایا، متنبی عضد الدولہ کے دربار سے صرف چھ ماہ وابستہ رہا، اس قلیل عرصہ میں اسکو خاصا اطمینان حاصل رہا جس کی وجہ سے اس نے کئی شاندار قصیدے کہے، جب متنبی نے پہلا قصیدہ پیش کیا، تو عضد الدولہ نے اسے عود، عنبر، مشک، قیمتی ریشمی چادر، مشکی گھوڑا، عمامہ، ہندی تلوار (جس کا دستہ سونے کا تھا) اور پانچ سو دینار عطا کئے، اس مختصر سے دور میں متنبی کے کلام میں درباداری کم اور ادبیت زیادہ نمایاں رہی،

قتل کے اسباب | شعبان ۳۵۴ھ میں متنبی نے عضد الدولہ سے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے عراق جانا چاہتا ہے، عضد الدولہ نے اس کو شیراز میں رکنے کو کہا اور نہ اس کے عراق ہی پہنچنے کیلئے

اسے کوئی انتقام کیا، کافور کے دربار سے متنبی عراق ہی کے ارادہ سے نکلا تھا، دوسرے روز عراق کے سفر پر نکل پڑا، رمضان ۳۵۴ھ میں وہ شہر واسط میں اپنے دوست ابو نصر جبلی کے یہاں قیام پذیر ہوا، اس دوران اس نے بدشگونی و مایوسی سے بھرپور اشعار کہے، درج ذیل شعر سے اس کی قنوطیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

بم التعلل لا اهل ولا وطن　　　ولا نديم ولا كاس ولا سكن

شاید اسی مفہوم کو مرزا غالب نے اپنے انداز میں یوں کہا ہے ؎

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ　　　نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ

نہ رقص پری پیکراں بر بساط　　　نہ غوغائے رامش گراں در رباط

کئی روز کے بعد متنبی ابو نصر کے پاس سے رخصت ہوا، بدویوں کی ایک جماعت فاتک ابن ابوجہل اسدی کی سرکردگی میں اس کے پیچھے لگ گئی کیونکہ اس نے فاتک کے بھانجے "ضبہ" کی ہجو کرتے ہوئے اس کی ماں (جو فاتک کی بہن تھی) کو گالی دی تھی، راستے میں یہ لوگ متنبی پر ٹوٹ پڑے، اس حملہ میں متنبی کا لڑکا قتل ہو گیا، حملہ آوروں نے اس کا سارا مال لوٹ لیا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ فاتک کو دیکھ کر متنبی نے بھاگنا چاہا، مگر اس کے غلام "مفلح" نے متنبی کا مشہور شعر

الخيل والليل والبيداء تعرفني　　　والسيف والرمح والقرطاس والقلم

یاد دلایا، اس پر متنبی لوٹ پڑا اور دست بدست لڑتا ہوا مارا گیا، مفلح بھی قتل کر دیا گیا، بعض لوگوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ شاید عضد الدولہ کی آخری ناگواری متنبی کے قتل کا باعث بنی لیکن درحقیقت فاتک اور ضبہ کی ہجو گوئی ہی اس کے دردناک قتل کی بنیاد کہی جا سکتی ہے

بغداد کے پاس نعمانیہ میں[1] قتل کے بعد متنبی کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی، دوسرے روز ابو نصر جبلی نے آکر تجہیز و تکفین کی، یہ حادثہ ذاجیہ ۲۸ رمضان ۳۵۴ھ میں پیش آیا تھا، (باقی)

[1] جرزیف الہاسم: ابو الطیب المتنبی ص ۹

ادبیات

دارالمصنفین

از

جناب محمود الرحمن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی

"دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ اور نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان کے درمیان تاریخی سمجھوتے پر یہ نظم کہی گئی"

اے کہ تو ہے علم و دانش کا چمن — اے کہ تو وجہ فروغ انجمن
اے کہ تو ہے مظہر فکر و نظر — ہے ہر اک ذرہ ترا رشکِ گہر
اے کہ تجھ میں خونِ شبلی موجزن — اے کہ تجھ میں ہے نہاں سید کا فن
اے کہ تجھ سے بزمِ اردو ضوفشاں — تو شعور و آگہی کا اک نشاں
اے کہ تو تاریخ کا اک سنگِ میل — تیری ہر تحریر ہے بانگِ خلیل
تجھ سے ہے تحقیق کو حاصل فروغ — تو نے واضح کر دیا صدق و دروغ
اے کہ تو ہے بے نظیر و بے مثال — تیری مطبوعات ساری لازوال
سیرتِ سرکار ہے اک شاہکار — قابلِ صد احترام و افتخار
منضبط تاریخ کے اوراق ہیں — جلوہ گر ماضی کے سب اسباق ہیں
محترم اجداد کی تحریر ہے — دورِ رفتہ کی حسیں تصویر ہے
ہے یہ سرمایہ عظیم و معتبر — آشنا ہیں اس سے سب اہلِ نظر

ہو مبارک اہلِ پاکستان کو　　پا لیا ہے گنجِ عرفان کو

فاؤنڈیشن سے ہوا عہد و قرار　　نقشِ مستقبل ہو گا یاں آب نشانہ

سب کتابیں چھپ کے نکلیں گی یہاں　　ہو گا روشن علم و دانش کا جہاں

پائیں گے ہم عہدِ رفتہ کا سراغ　　ہوں گے پُر اپنی روایت سے دماغ

شکر آیا کا خزینہ مل گیا
علم و فن کا اک دفینہ مل گیا

ترجمہ غزلِ خسرو

از ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری، صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

" ڈاکٹر ولی الحق انصاری صاحب نے ناظرینِ معارف کے لئے حضرت امیر خسرو کی مشہور غزل ع
ع از چشمِ تو کم بہت ز تو جاں شکار تر" کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو ان کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے (مکاں ف)

تیری نگہ سے تجھ سے جو ہے جاں شکار تر　　دنیا میں دل کہاں مرے دل سے فگار تر

شیریں لبوں سے نکلے ہے تیرے جو تلخ بات　　آبِ حیات سے ہے مجھے سازگار تر

نالاں ہے تجھ سے خلق، کہاں تک جفا کے ساتھ　　میں ہر جفا پہ تیری ہوں کچھ شرمسار تر

دل چھڑتا ہوں سامنے پھر بھی نہیں یقیں　　دنیا میں کون تجھ سے ہے بے اعتبار تر

سمجھا رہا تھا دل کو کہ الفت سے ہوشیار　　بولی یہ عقل مجھ سے بھی رہ ہوشیار تر

الفت میں پند ہوتا ہے دشمن کا ناگوار　　ہے پندِ دوست اس سے بھی کچھ ناگوار تر

دل پوچھتا ہے کیوں نہیں پہلا سا بیقرار　　باور کرے تو کہتا ہوں ہے بیقرار تر

گھستا ہوں سنگِ در پہ ترے جبہۂ جبیں　　پاتا ہوں اپنے بخت کو کچھ بے عیار تر

خسرو کے اس سوال کا تو ہی جواب دے
ہے کس وجہ سے آنکھ میری سوگوار تر

مطبوعات جدیدہ

حضرت مولانا داؤد غزنویؒ - مرتبہ- پروفیسر سید ابوبکر غزنوی مرحوم تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۰۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت عـــ/ پتہ- مکتبہ غزنویہ، ۴ شیش محل روڈ، لاہور

مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم جمعیتہ اہل حدیث کے ممتاز عالم اور پنجاب کانگریس کے مشہور رہنما تھے، مجلس خلافت اور ترک موالات کے زمانہ سے وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں سرگرم عمل تھے، برسوں پنجاب کانگریس کے سکریٹری وصدر، صوبائی اسمبلی کے ممبر اور جمعیۃ علمائے ہند کے نائب صدر رہے، مگر ۴۶ء میں بعض وجوہ سے جن کی تفصیل اس کتاب میں درج ہے، مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، اور تقسیم کے بعد امرتسر سے لاہور منتقل ہو گئے اور وہاں بھی قومی وسیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں، ان سرگرمیوں کے ساتھ وہ علمی، تعلیمی اور تحریری خدمات بھی انجام دیتے رہے، زیر نظر کتاب میں ان کے خدمات وکمالات کے ساتھ ان کی سیرت وشخصیت کا جائزہ ہے، یہ ۲ حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ان کے علم وفضل زہد و اتقا، درس وتدریس، خطابت وصحافت اور وعظ وارشاد اور ملی وسیاسی خدمات سے متعلق مختلف ارباب علم وقلم کے تاثراتی مضامین ہیں، اس میں مولانا محی الدین قصوری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا محمد حنیف ندوی، ڈاکٹر سید عبداللہ آغا شورش کاشمیری، اور رئیس احمد جعفری وغیرہ کے مضامین کے ساتھ مولانا عبدالماجد

دریابادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، اور مفتی محمد حسن مرحوم کی مختصر تحریریں بھی ہیں، دوسرے حصہ میں لائق مرتب نے جو مولانا مرحوم کے فرزند ہیں ان کے حالات و سوانح قلمبند کئے ہیں، اس میں ان کے خاندان تعلیم و تربیت، تصنیفات، علمی، تعلیمی، صحافتی، جماعتی اور سیاسی خدمات، اخلاق و عادات، مذہبی خیالات اور فقہی عدم تشدد وغیرہ کا ذکر ہے، آخر میں اردو و فارسی میں ان کے پسندیدہ اشعار کا ایک انتخاب بھی دیا گیا ہے، مولانا کے لائق فرزند نے یہ کتاب بڑی محنت سے مرتب کی تھی، مگر دنیا کی زندگی بھی کتنی ناپائدار ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد ہی سعادت مند فرزند بھی اپنے والد ماجد سے جا ملے، امید کہ یہ کتاب خاص خاص حلقوں میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی

قرآن مجید منظوم ترجمہ (۲ جلد) از۔ جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم،

کاغذ کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ہر جلد ۱۲۰، مجلد قیمت فی جلد ۱۵ روپے

ناشر قزلباشان پوسٹ بکس نمبر ۸۰۹، صدر کراچی نمبر ۳ (پاکستان)

آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم اردو کے بلند پایہ شاعر تھے، ان کی یادگاروں میں قرآن مجید کا ایک منظوم ترجمہ بھی ہے، اسکے بعض اجزا مرحوم کی زندگی میں چھپے تھے، اب ان کے عزیز اور قدرداں تھوڑے وقفہ سے دو دو پارے کا ترجمہ ایک جلد میں شائع کر رہے ہیں، زیر نظر دونوں جلدیں شروع کے چار پارے کے ترجموں پر مشتمل ہیں، نظم تو درکنار قرآن مجید کا نثری ترجمہ بھی آسان نہیں ہے، اس لیے اس کے منظوم ترجمے کی کوشش سے متعلق یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ سعی حاصل ہے کہ نہیں، مگر آغا صاحب کو اپنی شاعری کی قدرت پر کچھ ایسا اعتماد تھا کہ اس مشکل کام کو آخر پایۂ تکمیل تک پہونچا کر رہے، انھوں نے یہ احتیاط کی ہے کہ جہاں لفظی ترجمہ کی مکمل پابندی نہیں ہو سکتی ہے وہاں اصل و زوائد میں امتیاز

کے لیے اضافہ کو قوسین کے اندر دیا ہے، اردو میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بہت مقبول ہے، اس منظوم ترجمہ میں اسی کو پیش نظر رکھا گیا ہے، پہلے کالم میں قرآنی آیتوں کے نیچے حضرت شاہ صاحب کا ترجمہ دیا گیا ہے، اور دوسرے کالم میں آغا صاحب کا منظوم ترجمہ درج ہے، جس جذبہ سے یہ ترجمہ منظوم کیا گیا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا صلہ عطا فرمائے، اور قارئین کو اس کی قدر دانی کی توفیق دے،

حج و مقامات حج ۔ مرتبہ ۔ مولانا محمد رابع ندوی تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۷۰، قیمت صہ پتہ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ ۔

حج اسلام کا بنیادی رکن اور ملت ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار ہے، یہ ہر مسلمان پر زندگی بھر میں بشرط وسعت ایک ہی دفعہ فرض ہے، اس کے ارکان و مناسک مختلف جگہوں میں ایک طویل عرصہ تک بجالانے پڑتے ہیں، اس لیے حجاج کی واقفیت و رہبری کے گوناگوں اہتمام کے باوجود بھی ان کی ادائیگی میں سہو کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے حج سے متعلق متعدد کتابیں اور سفرنامے لکھے گئے ہیں، لائق مصنف کو حج و زیارت کی سعادت متعدد بار میسر آئی ہے، اور ان کو اپنے خال مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معیت میں حجاز مقدس میں بارہا ہفتوں اور مہینوں قیام کرنے کا موقع بھی ملا ہے، ان کو ملک عرب سے بھی بڑی واقفیت ہے چنانچہ اس سے پہلے وہ "جزیرۃ العرب" کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھ چکے ہیں، اور اب انھوں نے حج اور اس کے سلسلہ کے مقامات کے متعلق یہ مفید و پر از معلومات کتاب لکھی ہے، اس میں حج کی اہمیت و فضیلت، حج و عمرہ کی ادائیگی کی صورتوں، ان کے جملہ ارکان و مناسک

اور مسنون دعاؤں کے علاوہ سفر حج کے قوانین وضوابط، ساتھ لے جانے والے اسباب وسامان، جہازوں، بندرگاہوں، جدہ، مکہ، مدینہ اور دوسرے اہم مقامات کے متعلق تمام ضروری معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اس لیے عام سفرناموں اور حج پر لکھی ہوئی کتابوں کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ مفید ہے، جا بجا مختلف مقامات کے نقشے اور عمارتوں کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں،

قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں۔ مرتبہ جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت اچھی صفحات ۱۰۰ قیمت لعہ
ناشر مکتبہ الحسنات رام پور۔ یوپی۔

قرآن مجید کی جن آیتوں میں یہود کا تذکرہ ہے زیر نظر کتاب میں ان سب کو مختلف عنوانات کے تحت نقل کرکے ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی گئی ہے، اس سے یہود کی سرگذشت اور ان کی عظمت واقبال اور زوال وادبار کی مفصل داستان سامنے آجاتی ہے، نیز ان کی فتنہ انگیزی، بغاوت، سرکشی، نقض عہد، آیات الٰہی کی تکذیب اور خدا کے رسولوں کے انکار و قتل کے لرزہ خیز واقعات کی بھی اس میں تفصیل آگئی ہے، مصنف یہود کے اس آئینہ میں احکام الٰہی اور قرآن مجید کے سلسلہ میں مسلمانوں کی موجودہ روش پر ان کو بھی تنبیہ و ملامت کرتے گئے ہیں، یہ کتاب علمی وتحقیقی حیثیت سے چاہے زیادہ بلند پایہ نہ سمجھی جائے تاہم اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے،

بدایوں کے چند ادبا و شعراء مرتبہ جناب بشیر علی صدیقی۔ تقطیع خورد، کاغذ بہتر کتابت وطباعت معمولی۔ صفحات ۴۴، قیمت عہ
پتہ: مصنف۔ محلہ وحید گنج، محلہ سوتھہ بدایوں"

یہ جناب مبشر علی صدیقی کے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں بدایوں کے معروف و غیر معروف ادیبوں اور شاعروں کے ادبی و شعری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، دوسرے میں وہاں سے چھپنے والی یا وہاں کے اہل قلم کی بعض ادبی کتابوں، اور تیسرے میں وہاں سے شائع ہونے والے رسالوں اور اخبارات کا ذکر کیا گیا ہے، یہ سب مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں، اور اخباروں و رسالوں میں چھپ بھی گئے ہیں، کتابی صورت میں شائع کرتے وقت حشو و زوائد اور مکررات کو حذف کر دینا چاہئے تھا، کتابت و طباعت بھی خراب ہے، اور قیمت بھی زیادہ ہے،

ہم ایک ہیں :- مرتبہ جناب عرش ملسیانی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت، اچھی، صفحات ۲۴۰، قیمت، عہ، پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند

اس کتاب میں قومی یکجہتی، اور ملک کے مختلف فرقوں اور قوموں کی یگانگت اور باہمی رواداری کا ذکر مختلف پہلوؤں سے ہے، ہندوستان قدیم زمانہ سے مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، لیکن اس کثرت اور رنگا رنگی کے باوجود یہاں وحدت اور یک رنگی کی شان ہمیشہ موجود رہی ہے، لائق مصنف نے پہلے ہندوستان کے گذشتہ عہد کی مختصر تاریخ بیان کرکے قومی یکجہتی کا تاریخی و تہذیبی پس منظر دکھایا ہے، پھر زبان، موسیقی، مصوری، رقص اور تعمیرات میں ملک کے تمام فرقوں کے ایک دوسرے کے دوش بدوش حصہ لینے کا تذکرہ ہے، لسانی میل جول کے سلسلہ میں اردو زبان کے کردار اور ہندوؤں کی اردو خدمات کا خاص طور سے جائزہ لیا گیا ہے، اسی ضمن میں ہندی زبان کے متعلق مسلمانوں کی خدمات کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے، ایک مستقل عنوان

کے تحت زیارت گاہوں اور میلوں ٹھیلوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپی کا ذکر ہے، آخر میں اُن صوفیوں اور سنتوں کے مختصر حالات اور زریں اقوال تحریر کئے گئے ہیں جنھوں نے خدا کی بندگی، خلق کی خدمت اور انسانیت و اخوت کا درس دے کر سب کو پیار اور محبت کی تلقین، صلح و آشتی کا پیام اور اتحاد و یکجہتی کی دعوت دی ہے، ممکن ہے کہ مصنف کے ہر خیال سے اتفاق نہ کیا جائے لیکن یہ کتاب قومی یکجہتی کو فروغ دینے اور نفرت و اختلاف کو دور کرنے کے لئے لکھی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ قوم و وطن کی ایک مفید خدمت ہے،

تذکرہ حضرت سید شاہ اسمٰعیل قادری: مرتبہ جناب محمد معین الدین اختر صاحب (ایم۔اے۔عثمانیہ) تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات: ۱۲۸، قیمت: للعہ ۵۰ پیسے (۱) ادبی ٹرسٹ بک ڈپو۔ کمارا بینک بلڈنگ عابد روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ (۲) معین منزل ۹۴/۳/۷۹-۴-۲۰-خانہ باغ روڈ، خلوت مبارک، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲،

یہ جنوبی ہند کے ایک مشہور بزرگ حضرت سید شاہ اسماعیل قادری کا تذکرہ ہے مصنف کو تلاش کے باوجود ان کے حالات کم ملے ہیں، البتہ انھوں نے اس میں شاہ صاحب کے شجرۂ نسب خوارق، تصرفات، عرس و نیاز اور درگاہ و مزار کے متعلق بعض معلومات جمع کر دئے ہیں، اور درگاہ کی متعدد عمارتوں کے عکسی فوٹو بھی دئے ہیں، عرس کی جو تفصیل دی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے بزرگوں کے مزاروں اور عرسوں کی طرح یہاں بھی غیر شرعی رسمیں مروج ہیں، بعض خامیوں کے باوجود یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے،

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی، تحقیقی، ادبی، تنقیدی، تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت، تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱- مہاجرین جلد دوم قیمت: ۱۳-۹

۲- سیر الصحابہ جلد ۶ " ۹-۴

امام حسین کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں واقعۂ محزنۂ کربلا کی غم انگیز تفصیل۔

۳- سیر الصحابہ جلد ۷،

۴- تابعین: ۹۶، اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۱۲-۵۰

۵- تاریخِ اسلام اول (عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ)

قیمت: ۱۲-۵۰

۶- تاریخِ اسلام دوم (خلافتِ بنی امیہ) ۱۱-۰۰

۷- تاریخِ اسلام سوم (خلافتِ عباسیہ اول)

قیمت: ۱۴-۰۰

۸- تاریخِ اسلام چہارم (خلافتِ عباسیہ دوم)

قیمت: ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت ۵-۰۰

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں۔

قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغِ اردو لکھنؤ)

۱۲- دینِ رحمت قیمت: ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۴-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیاتِ سلیمان: یعنی جانشینِ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، دینی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب درخشاں اور تحقیق کے لحاظ سے حیاتِ شبلی کا تتمہ، دلکش، دلچسپ، قابلِ مطالعہ، اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے۔ قیمت: ۲۷-۵۰

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب اور ان کی نگرانی میں دارالمصنفین کے رفقاء محققین نے اُن کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

سنہ ۱۹۳۴ء   سنہ ۱۹۳۷ء، سنہ ۱۹۳۸ء، سنہ ۱۹۳۹ء

سنہ ۱۹۷۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،   "منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ"

۱۱۹ (۵)

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ نومبر سنہ ۱۹۷۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ـ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ ۱۵ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

مجلسِ ادارت

جلد ۱۱۹ ماہ نومبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

پچھلے مہینہ ذکر آیا تھا کہ پاکستان میں دارالمصنفین کی کتابوں کے حق طباعت کا جو معاہدہ وہاں کی وزارت تعلیم کے ایک ادارہ نیشنل بک فاونڈیشن سے ہوا تھا، اس کی نقل اسلام آباد کے اپنے سفارت خانہ میں جمع کر دی تھی، وہاں سے یہ تسکین بخش خط موصول ہوا ہے کہ یہ بہت ہی خوش آیند صورت حال نمودار ہوئی ہے، اس کے لئے راقم کو مبارکباد بھی دی گئی ہے، معاہدہ کی نقل اپنی مرکزی حکومت کی وزارت خارجہ کے پاس بھی ارسال کی تھی، وہاں بھی اس پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے، ہمارے ارباب حکومت نے اس معاہدہ کی تائید کرنے میں کشادہ دلی کی جو قابل قدر اسپرٹ دکھائی ہے، اُس کے لئے دارالمصنفین ان کا شکر گذار ہے،

دارالمصنفین پاکستان کی حکومت کے حسن سلوک کا بھی ممنون ہے جب سے اُس کی خبر ہندوستان کے اخباروں میں چھپی ہے، اس پر اچھے اچھے اداریے بھی لکھے جا رہے ہیں، اس سلسلہ میں دونوں حکومتوں کی طرف سے جو رواداری اور فراخدلی کا اظہار ہوا ہے وہ دونوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی ایک نیک اور مبارک فال ہے، اس خاکسار نے پاکستان کے طویل قیام میں یہ محسوس کیا کہ وہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں یہ عام احساس ہو چلا ہے کہ دونوں ملکوں کے اختلافات سے نقصانات زیادہ اور فوائد کم ہوئے، ہمارے ملک میں بھی یہ خیال بڑھتا جا رہا ہے کہ اگر دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی طرح رہیں تو اسی میں دونوں کی فلاح و بہبود ہے، اختلافات نہ ہوتے تو دونوں بھائی بھائی بن کر اس تک ایشیا کی بڑی مؤثر قوت بن جاتے،

حدیث شریف میں ہے کہ بدگمانی انسان کی رگوں کے خون میں شیطان بن کر اس طرح دوڑتی پھرتی ہے کہ اس کو خود اس کی خبر نہیں ہوتی، یہی بدگمانی کسی ملک یا دو ملکوں کی رگوں میں دوڑتی پھرے تو اُن کے خون کا کینسر بن جاتی ہے اس برصغیر کی سیاست میں ہندو مسلم کا مسئلہ بدگمانیوں کی بھینٹ چڑھتا رہا جس کی بدولت بلوے، فسادات، خونریزی اور آخر میں ملک کی تقسیم ہوئی، اس کے بعد بھی یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا کئی لڑائیاں بھی ہوئیں، آخر میں پاکستان کی بھی تقسیم ہوگئی پھر بھی اس برصغیر کے شہریوں کو ذہنی اور سیاسی سکون کی حقیقی روحانیت کی تلاش ہے یہ کہاں مل سکتی ہے؟ محبت کے میکدہ میں ہندوستان کے ایک صاحب دل شاعر نے کہا ہے :۔

اک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے   سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

اس برصغیر کو دلِ عاشق مل جائے تو کیا عجب کہ یہ زمانہ کی طرح پھیل کر رہے،

ہندو مسلم اتحاد خواہ یہ ہندوستان کے اندر ہو، یا ہندوستان، پاکستان، اور بنگلہ دیش کے درمیان ہو ایک بے پناہ قوت بن سکتی ہے آج سے پچاس برس پہلے مولانا محمد علیؒ نے یہ لکھا تھا کہ جو ہندو مسلمانوں کے آج کل کے جدال و قتال سے متاثر ہو کر کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ دونوں کبھی نہ ملیں گے، وہ یہی نہیں کہ اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ پر ایمان نہیں رکھتے اور اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر کے بار بار دہرائے ہوئے سبق کو بھول جاتے ہیں بلکہ وہ اسے بھی یاد نہیں رکھتے کہ فطرت انسانی یہی ہے کہ سب بنی آدم ایک ہو جائیں جس طرح وہ نسلاً درحقیقت ایک دوسرے کے بھائی ہیں، اسی طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ ماں جائے بھائی کا سا برتاؤ بھی کرنے لگیں گے، اس سے پہلے مولانا محمد علیؒ نے کوکناڈا کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی تو اس میں فرمایا تھا لے اتفاق! تو ضرور آئیگا ہندو مسلم کو باہم ملا دیگا اُن کو متحد کر دیگا لیکن آج ہمارے سامنے نہیں جو تیرے انتظار کی تکلیف اٹھا رہے ہیں، تو آئے گا ضرور لیکن کب؟ ایک عرصہ کی مصیبتوں، تکلیفوں صبر آزما التجاؤں، ہمت شکن انکاروں کے بعد"

مولانا محمد علی کی یہ پکار اُن کی زندگی میں صدا بصحرا رہی لیکن اب مصیبتوں کے طوفان، صبر آزما انتظار اور ہمت شکن انکاروں کی گھڑیاں شاید ختم ہو رہی ہیں، پاکستان نے ہندوستان سے مختلف مسائل پر سمجھوتہ اور ہندوستان کے ایک اغوا شدہ ہوائی جہاز کو محفوظ واپس کرکے جو بلند حوصلگی دکھائی ہے یا خود ہندوستان کے اندر موجودہ ایمرجنسی میں اردو نوازی، مسلمانوں کی جان، مال، آبرو اور درگاہوں کے تحفظ اور سرکاری ملازمتوں میں اُن کی حق تلفی کے اعتراف میں جو فراخدلی دکھائی جا رہی ہے، وہ مستقبل کے لئے بہت ہی نیک شگون ہے، مسلمانوں کے دلوں کی تسخیر کے سلسلہ میں حکومت اور ہندوؤں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے،

ع :- جھک جھک کے شیشے ملتے ہیں ہنس ہنس کے جام سے

مسلمانوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے کردار کی بلندی، اور سیرت کی پاکیزگی کا ایک اعلیٰ معیار پیش کرکے یہ ثابت کر دکھائیں کہ وہ ایک اچھے مسلمان ہونے کے ساتھ سچے ہندوستانی بھی ہیں،

ع :- ایسا کچھ کرکے چلو تم کہ بہت یاد رہو،

۱۱ر نومبر کو مولانا ابوالکلام آزاد کی سالگرہ اس سال لکھنؤ میں زیادہ اہتمام سے منائی جا رہی ہے ہندو مسلم اتحاد سے متعلق اُن کے جو قلبی احساسات تھے، وہ اُن کی اس تقریر سے ظاہر ہوئے تھے، جو انھوں نے ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے ایک خصوصی اجلاس میں کی تھی، اس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے، اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا، مگر اُس سے دست بردار نہ ہوں گا، کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو ہندوستان کا نقصان ہوگا، اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے"

سوراج مل چکا، عالمِ انسانیت کو نقصان سے محفوظ رکھنے کی فضا بھی سازگار ہوتی جا رہی ہے۔

مقالات

عہدِ بعثت کے یثرب (مدینہ) پر ایک نظر

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

سیرت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے عربی میں ایک اہم کتاب لکھی ہے جس میں بہت سے ایسے تاریخی اور جغرافیائی پہلو واضح کیے ہیں جن پر سیرت نگاروں کی نظر نہیں پڑی یا انکی حقیقت پورے طور پر واضح نہ ہو سکی۔ ذیل کی سطروں میں اس کا ایک باب پیش کیا جا رہا ہے' ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں رفیق مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام کے قلم سے ہے' امید ہے کہ اس سے ان پیچیدگیوں کے حل کرنے میں مدد ملے گی جن سے سیرت کا مطالعہ کرنے والوں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ 'ایڈیٹر'

مکی اور مدنی معاشروں کا فرق | شہر یثرب کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے (جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول، (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دار الہجرۃ اسلام کی عالمی دعوت کا مرکز اور ظہور اسلام کے بعد قائم ہونے والے پہلے اسلامی معاشرہ کا گہوارہ بنایا) ہمیں اس کی تمدنی، معاشرتی، اقتصادی صورتحال، قدیم قبائل کے باہمی تعلقات اور وہاں کے یہود کی معاشرتی، اقتصادی اور جنگی اہمیت اور اس زرخیز شہر کے معیارِ زندگی کو سمجھنا ہوگا، جہاں متعدد مذاہب، ثقافتیں اور معاشرے

دوش بدوش تھے، جبکہ مکہ مکرمہ کا ایک رنگ، ایک طرز اور ایک ہی مذہب تھا، اس سلسلہ یہاں پر قارئین کے سامنے کچھ تفصیلات پیش کی جاتی ہیں جن کی مدد سے وہ زمانۂ بعثت کے شہر یثرب کی نوعیت اور صورتِ حال کا کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہود | اس تاریخی حقیقت کو ترجیح حاصل ہے کہ یہود کی اکثریت جزیرۃ العرب میں عموماً اور شہر یثرب میں خصوصاً پہلی صدی مسیحی میں آئی، مشہور یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے:-

"سنہ ۷۰ء میں جب یہودی رومی جنگ کے نتیجے میں فلسطین اور بیت المقدس برباد ہوگئے، اور یہود دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے تو یہود کی بہت سی جماعتوں نے بلاد عرب کا رخ کیا، جیسا کہ یہودی مورخ جوزیفس کا کہنا ہے جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھا اور بعض مواقع پر اس نے یہودی ٹکڑیوں (Units) کی قیادت بھی کی تھی، عربی ماخذ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔"[1]

مدینے میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے (جن میں بالغوں کی تعداد دو ہزار سے اوپر تھی) قینقاع، نضیر، قریظہ۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ قینقاع کے لڑنے والوں کی تعداد سات سو تھی، نضیر کے آدمیوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی جبکہ قریظہ کے بالغوں کی تعداد سات سو اور نو سو کے درمیان تھی۔"[2]

ان تینوں قبائل کے باہمی تعلقات کشیدہ رہتے تھے اور کبھی لڑائیاں بھی ہوتی تھیں، ڈاکٹر ولفنسن کہتا ہے:-

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب فی الجاہلیۃ وصدر الاسلام، اسرائیل ولفنسن (ابو ذؤیب) ص ۹ (قاہرہ، ۱۹۲۷ء) [2] یہ اندازہ سیرت ابن ہشام کے ان اعداد و شمار سے کیا گیا ہے جو جنگوں اور واقعات کے تذکرے میں آئے ہیں، جیسے بنی نضیر کی جلا وطنی، بنی قریظہ کا قتل وغیرہ۔

"بنی قینقاع اور بقیہ یہود میں عداوت چلی آتی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ بنی قینقاع بنی خزرج کے ساتھ "یوم بعاث" میں شریک تھے، اور بنی نضیر اور بنی قریظہ نے بنی قینقاع کا بڑی بے دردی سے کشت وخون کیا تھا، اور ان کا شیرازہ بری طرح سے منتشر کر دیا تھا، حالانکہ انھوں نے گرفتار ہونے والے تمام یہود کا فدیہ بھی ادا کر دیا تھا، چنانچہ "یوم بعاث" کے بعد یہودی قبائل میں باہمی نزاع چلی آ رہی تھی، جب قینقاع اور انصار کے درمیان جنگ ہوئی تو انصار کے مقابلے پر ان کا کسی یہودی نے بھی ساتھ نہیں دیا۔"[1]

قرآن مجید نے بھی یہود کی باہمی عداوت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ	اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ تم آپس میں
دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ	خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنے وطن
مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ	سے نہ نکالو گے پھر تم نے اقرار کیا اور تم
تَشْهَدُوْنَ ۔ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۤءِ	مانتے ہو، پھر تم ہی اپنوں کو قتل کرتے ہو،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲۶) قینقاع، نضیر، اور قریظہ بڑے قبیلے تھے جن کے ماتحت شاخیں بھی تھیں، جیسے بنی ہدل قریظہ کے تابع تھے، جن میں سے بعض بڑے صحابی بھی ہوئے اور جیسے بنی زنباع جو بنی قریظہ کی شاخ ہے، بعض یہودی جماعتوں کے نام اس معاہدے میں بھی آئے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان ہوا تھا، جیسے بنی عوف، بنی النجار، بنی ساعدہ، بنی ثعلبہ، بنی جفنہ، بنی الحارث، بنی الشطیبہ، غرض اس معاہدے میں ان جماعتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے کہ ان بطانۃ یہود کانفسھم (یہود کے خواص اور انکے معتمد علیہ کا معاملہ بھی انہیں کی طرح ہوگا) اسی لیے سمہودی، مصنف "وفاء الوفاء" کا کہنا ہے کہ یہود بیس قبیلوں سے زیادہ تھے۔" (وفاء الوفاء ۱/۱۱۶)۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] الیہود فی بلاد العرب ص ۱۲۹۔

تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ — اور اپنے ایک فرقے کو ان کے گھروں سے

فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ — نکالتے ہو، ان پر چڑھائی کرتے ہو،

عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ — گناہ اور ظلم کے طور پر اور اگر وہ تمہارے

يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ — پاس قید ہوکر آئیں تو تم فدیہ دیتے ہو،

مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ [1] — حالانکہ ان کا نکال دینا بھی تم پر حرام ہے،

یہود مدینہ کی مختلف بستیوں اور محلوں میں رہتے تھے، جو انہیں کیلئے مخصوص تھیں، بنو قینقاع کو جب بنو نضیر اور بنو قریظہ نے مدینہ کے نواحی محلے سے بھگایا تو وہ شہر کے اندر ایک خاص محلے میں رہنے لگے، بنو نضیر مدینہ سے دو تین میل کی دوری پر وادی بطحان کی بلندی پر رہتے تھے، جو کھجوروں اور کھیتوں سے مالا مال تھی، بنو قریظہ مدینہ کے جنوب میں چند میلوں پر واقع مہزور کے علاقے میں رہتے تھے، [2]

مدینہ میں یہود کی مخصوص بستیاں تھیں جن میں قلعے اور مستحکم عمارتیں بنی ہوئی تھیں، ان میں وہ مستقل طور پر رہتے تھے، انھیں یہودی حکومت بنانیکا موقع نہیں ملا، بلکہ وہ قبائلی سرداروں کی حمایت وحفاظت کے تحت چین سے رہتے تھے، اور اس حمایت کے بدلے میں انھیں سالانہ محصول ادا کرتے تھے، جس کے سبب وہ بدوؤں کے حملوں سے بھی محفوظ رہتے تھے، اس خطرے کے پیش نظر یہودی معاہدوں پر مجبور رہتے تھے، چنانچہ ہر یہودی سردار اعراب اور رؤسائے عرب میں سے کسی نہ کسی کو اپنا حلیف بنائے رکھتا تھا، [3]

مذہبی امور | یہودی اپنے کو ایک مستقل مذہب اور آسمانی شریعت کا حامل سمجھتے تھے، چنانچہ وہ

---

[1] سورۃ البقرہ/۸۴، ۸۵ [2] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ للدکتور محمد سید الطنطاوی ص ۱۱، [3] تلخیص از "تاریخ العرب قبل الاسلام" ج ۶، ص ۲۳ : ڈاکٹر جواد علی ([illegible])

اپنے مدرسوں میں (جن کو مدراس کہتے تھے) اپنے دینی اور دنیوی امور، شرعی احکام، تاریخ اور اپنے انبیاء اور رسولوں کے حالات پڑھتے اور پڑھاتے تھے۔ اسی طرح مخصوص عبادتگاہوں میں وہ اپنی عبادات اور دینی شعائر انجام دیتے تھے، وہ انہی جگہوں پر اپنے تمام دینی اور دنیوی امور کے سلسلے میں مشورہ اور تبادلۂ خیالات کے لیے جمع ہوتے تھے۔ یہودی اپنے مخصوص دینی قوانین پر عمل کرتے تھے، جن میں سے کچھ انھوں نے اپنی کتابوں سے اخذ کیے تھے، اور کچھ ان کے کاہنوں اور عالموں نے اپنی طرف سے ایجاد کرلیے تھے۔ اسی طرح وہ اپنی عیدیں، الگ مناتے تھے، کچھ خاص دنوں جیسے یوم عاشورا میں روزے رکھتے تھے۔"[1]

اقتصادیات | دوسری قوموں سے ان کے بیشتر مالی معاملات رہن اور سود پر قائم تھے، اور مدینہ جیسے زراعتی علاقے کے پیش نظر انھیں اس کا سنہرا موقع بھی حاصل تھا کیونکہ کسانوں کو کھیتی کے موقع پر اکثر قرض کی ضرورت پیش آتی ہے۔[2]

رہن کا نظام صرف زر و مال تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ مجبوری کی حالت میں عورتیں اور بچے بھی رہن رکھ لیے جاتے تھے، چنانچہ کعب بن الاشرف کے قتل کے سلسلے میں امام بخاریؒ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے:-

قال له محمد بن مسلمة	محمد بن مسلمہؓ نے کعب سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں
قد اردنا ان تسلفنا وسقا	کہ تم ایک وسق یا دو وسق غلہ ہمیں قرض
او وسقين، فقال نعم، ارهنوني	دو، اس نے کہا کہ بشرطیکہ تم میرے پاس
قالوا اى شيء تريد؟ قال	کچھ رہن رکھو، انھوں نے پوچھا کہ تم
ارهنوني نساءكم قالوا كيف	کیا چیز چاہتے ہو؟ کعب نے کہا تم میرے پاس

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۸۰-۸۱ [2] ایضاً

ترهن نساءنا وانت اجمل العرب، قال: فارهنوني ابناءكم، قالوا كيف نرهنك ابناءنا فيسب احدهم فيقال رهن بوسق او وسقين، قال هذا عار علينا ولكن نرهنك اللامة[1]

اپنی عورتوں کو رہن رکھ دو، انھوں نے کہا کہ ہم اپنی عورتوں کو تمھارے پاس کیسے رہن رکھ دیں جبکہ تم عربوں میں خوبصورت ترین انسان ہو۔ اس نے کہا کہ تب اپنے بیٹوں کو رہن رکھ دو، اس پر انھوں نے کہا کہ ہم تمھارے پاس اپنے بیٹوں کو کیسے رکھ دیں کہ آگے انھیں طعنہ دیا جائے کہ وہ ایک یا دو وسق کے بدلے رہن رکھے گئے تھے، اور یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہوگی، البتہ ہم تمھارے پاس ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں۔

اس قسم کے رہن کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ راہنوں اور مرتہنوں کے درمیان نفرت و عداوت پیدا ہو جائے، خصوصاً اس وقت جبکہ عرب اپنی عورتوں کے سلسلے میں غیرت و حمیت کے لیے شہرت رکھتے تھے۔

مدینہ کی اقتصادیات پر یہود کے اس تسلط کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کا معاشی دباؤ بہت بڑھ گیا، اور منڈیوں میں من مانی کرنے لگے۔ اپنی مصلحت و منفعت کے مطابق مصنوعی قلت پیدا کر کے چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی سے کام لینے لگے، اس لیے مدینہ کی اکثریت ان کی دھاندلی اور حد سے زیادہ سود خوری اور نفع اندوزی کی ایسی شرمناک حرکتوں کی وجہ سے ان سے نفرت

---

[1] بخاری نے اسے کتاب المغازی میں باب "قتل کعب بن الاشرف" میں ذکر کیا ہے۔ ابن ہشام نے بھی تھوڑے فرق کے ساتھ یہ قصہ السیرۃ النبویہ ج ۲ ص ۵۱ پر نقل کیا ہے۔

کرنے لگی تھی جن سے ایک عرب آدمی دور رہتا ہے۔[1]

ان کے جبلی حرص وہوس اور توسیع پسند سیاست کے پیش نظر DE-LACY, O'LEARY نے اپنی کتاب "عرب قبل محمد" میں لکھا ہے کہ

"اصل بدوی باشندوں[2] اور نوآباد یہودیوں کے تعلقات، دیں صدی مسیحی میں بہت خراب ہو گئے تھے، کیونکہ ان یہودیوں نے اپنی کاشت کے علاقے ان بدوؤں کی چراگاہوں تک وسیع کر لیے تھے۔[3]"

اوس وخزرج (مدینہ کے عرب باشندے) اور یہود کے تعلقات ذاتی نفع اور استحصال پر مبنی تھے، یہودان دونوں قبیلوں کو لڑانے پر بھی اپنے فائدے کی صورت میں بہت خرچ کرتے تھے، جیسا کہ اوس وخزرج کی متعدد لڑائیوں میں انھوں نے کیا تھا جن کے نتیجہ میں یہ دونوں قبیلے تباہ ہو رہے تھے، ان کے پیش نظر صرف یہی رہتا تھا کہ مدینہ پر ان کا مالی تسلط برقرار رہے، آنے والے نبی کے سلسلے میں یہود کی گفتگوؤں نے بھی اوس وخزرج کو داخلِ اسلام ہونے پر آمادہ کر دیا تھا۔[4]

دینی وثقافتی حالت بلادِ عرب کے یہود کی زبان فطری طور پر عربی ہی تھی لیکن وہ خالص نہیں رہ گئی تھی، بلکہ اس میں تھوڑی سی عبرانی کی بھی آمیزش ہو گئی تھی، کیونکہ انھوں نے عبرانی کا استعمال پوری طرح نہیں چھوڑا تھا، وہ اپنی عبادتوں اور تعلیمی امور میں اسکا استعمال کرتے رہتے تھے۔[5]

---

۱ بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۹، ۲ ان سے عرب قبائل مراد ہیں، جیسے اوس وخزرج اور دوسرے عرب جو مدینہ کے اطراف میں ان کے پڑوسی تھے ۳ Arabia before Mohammad (London, 1927). ۴ بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ: للدکتور محمد سید الطنطاوی ص ۱۰۱-۱۴۳ ۵ مکۃ والمدینۃ فی الجاہلیۃ وعہد الرسول: احمد ابراہیم الشریف ۲۰۳

یہود کے دینی و دعوتی پہلو کے بارے میں ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے :۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود کو عرب میں اپنا دینی اقتدار مستحکم کرنے کے وسائل حاصل تھے، اور وہ اگر چاہتے تو حاصل کردہ اقتدار سے کہیں زائد اثر و نفوذ حاصل کر سکتے تھے، لیکن تاریخ یہود کا ہر جاننے والا جانتا ہے کہ یہود نے دوسری قوموں کو اپنے دین کے قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں کیا اور بعض وجوہ سے اشاعت دین یہود کے لیے ممنوع رہی ہے۔"[1]

لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اوس و خزرج اور دوسرے عرب قبائل سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد نے یہودیت کو اپنی مرضی سے یا رشتہ داری، یا یہودی ماحول میں پرورش پانے کے سبب اختیار کر لیا تھا، عرب کے یہود میں سب قسمیں پائی جاتی تھیں، یہ بھی معلوم ہے کہ ممتاز یہودی تاجر اور مشہور شاعر کعب بن الاشرف (جو نضری کی نسبت سے بھی معروف ہے) قبیلۂ طئے کا ایک فرد تھا، اس کے باپ نے بنی نضیر میں شادی کی تھی، چنانچہ کعب ایک پرجوش یہودی کی صورت میں پروان چڑھا، ابن ہشام لکھتے ہیں کہ

"اس کا آبائی تعلق قبیلہ طئے پھر بنی نبہان سے تھا، اس کی ماں بنی نضیر سے تھی۔"[2]

عربوں میں ایک رسم یہ تھی کہ جس کا لڑکا زندہ نہ رہتا تھا وہ یہ نذر مانتا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا تو اس کو یہودیوں کے سپرد کر دے گا، کہ وہ اس کو اپنے میں شامل کر لیں، چنانچہ بہت سے عرب اس طرح بھی یہودی بن گئے تھے، سنن ابوداؤد میں حسب ذیل روایت ملتی ہے :۔

عن ابن عباسؓ قال: کانت	جس عورت کا بچہ زندہ نہ رہتا تھا وہ
المرأة تکون مقلاة فتجعل علی	نذر مانتی تھی کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے

---

[1] الیہود فی بلاد العرب: اسرائیل ولفنسن ۲، [2] ابن ہشام ج۱ ص ۵۱۴

نفسها ان عاش لها ولد ان	یہودی بنا دے گی، چنانچہ جب بنو نضیر
تھوّدہ، فلما اجلیت بنو النضیر	جلا وطن ہوئے تو ان میں سے انصار کے
کان فیھم من ابناء الانصار	لڑکے بھی تھے، اس لیے وہ کہنے لگے کہ ہم
فقالوا لاندع ابناءنا، فانزل	اپنے بیٹوں کو نہیں چھوڑیں گے اس پر
اللّٰہ تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ	یہ آیت اتری لَآ اِكْرَاهَ فِي
قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ[۱]	الدِّيْنِ

اوس وخزرج اوس وخزرج (مدینہ کے عرب باشندوں) کا سلسلۂ نسب یمن کے قبیلۂ ازد سے ملتا ہے۔ جہاں سے یثرب کی طرف ہجرت کی لہریں مختلف وقفوں میں اٹھتی رہیں جس کے کئی اسباب تھے، ان میں یمن کی غیر یقینی صورت حال حبش کا حملہ، سد مارب کے انہدام و شکستگی کے بعد آبپاشی کی دقت وغیرہ بھی ہیں، اس طرح اوس وخزرج مدینہ میں یہود کے بعد آئے اوس کے قبائل مدینہ کے جنوب و مشرق میں آباد ہوئے جو عوالی کا علاقہ کہلاتا ہے، خزرج کے قبائل وسطی اور شمالی علاقے میں آباد ہوئے، جو مدینہ کا نشیبی حصہ ہے، ان کے بعد مغرب میں حرۃ الوبرۃ تک اور کچھ نہیں ہے۔[۲]

خزرج چار قبیلوں پر مشتمل تھے، (۱) مالک (۲) عدی (۳) مازن (۴) دینار سب کے سب بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے جنھیں تیم اللات کہا جاتا ہے، بنو نجار کے قبائل مدینہ کے اس وسطی حصے میں آباد ہوئے جہاں اب اس وقت مسجد نبوی واقع ہے، اوس مدینہ کے زرخیز زراعتی علاقوں میں مقیم ہوئے، اور یہود کے اہم قبیلوں اور جماعتوں کے پڑوسی بنے، خزرج جہاں ٹھہرے وہ زیادہ سرسبز علاقہ نہ تھا، ان کا صرف ایک بڑا

---

[۱] سنن ابو داؤد کتاب الجہاد باب لاسیر یکرہ علی الاسلام ج ۲ [۲] مکہ والمدینہ ۱۰۳

بڑا یہودی قبیلہ قینقاع ہی پڑوسی تھا۔[1]

اب اوس وخزرج کے افراد کی یقینی تعداد معلوم کرنا بہت دشوار ہے لیکن حالات وحوادث پر نظر رکھنے والا ان کی جنگی قوت کا اندازہ ان جنگوں سے کرسکتا ہے جن میں وہ ہجرت نبوی کے بعد شریک ہوئے، چنانچہ فتح مکہ کے دن ان کے لڑنے والے افراد کی تعداد چار ہزار تھی۔[2]

مدینہ میں ہجرت کے وقت عربوں ہی کو بالادستی اور اقتدار حاصل تھا، یہود اپنے ان حریفوں کے مقابلے میں متحد اور منظم نہیں تھے۔ ان کے مختلف قبیلوں میں پھوٹ تھی، کچھ قبیلے اوس کے ساتھ معاہدہ کیے ہوئے تھے اور کچھ خزرج کے ساتھ تھے، لڑائی کے وقت وہ اپنے ہم مذہبوں کے مقابلے پر عربوں سے زیادہ سخت گیر واقع ہوئے تھے، بنی قینقاع اور بنی نضیر اور بنی قریظہ کی باہمی عداوتیں کے نتیجے میں بنی قینقاع اپنے کھیت چھوڑ کر صنعت وحرفت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔[3]

اسی طرح اوس وخزرج کے درمیان بھی بہت سی جنگیں ہوئیں، جن میں سے پہلی جنگ سمیر تھی، آخری جنگ بعاث تھی جو ہجرت سے ۵ سال پہلے ہوئی تھی۔[4] یہود، اوس وخزرج کو باہم لڑانے کے لیے سازشیں کرتے اور اختلاف اور مقابلے کی آگ بھڑکاتے رہتے تاکہ عرب ان کی طرف سے غافل رہیں، عرب بھی اس بات کو محسوس کرتے تھے، اسلیے ان کو ثعالب (لومڑی) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت سے جو واقعہ لکھا ہے اس کا خاص

---

[1] مکہ والمدینہ ۳۱۱ [2] الامتاع ۱/۳۶۴ [3] مکہ والمدینہ ۳۲۲ [4] فتح الباری ۶، ص ۸۵، جنگ بعاث کی تفصیلات اور اسباب ومحرکات کے لیے ملاحظہ ہو کامل ابن الاثیر۔

روشنی پڑتی ہے۔ اس واقعہ میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک کبیر السن یہودی شعث بن قیس نے ایک جگہ اوس و خزرج کو اسلام قبول کرنے کے بعد ایک مجلس میں بیٹھے لطف و محبت کی باتیں کرتے ہوئے سنا۔ اس کو یہ منظر دیکھکر سخت تکلیف ہوئی اور وہ برداشت نہ کرسکا، اس نے ایک یہودی نوجوان کو جس کے انصار سے تعلقات تھے اشارہ کیا کہ وہ اس مجلس میں شریک ہوجائے، پھر کسی تقریب سے جنگ "بعاث" اور اس سے پہلے کی جنگوں کا ذکر چھیڑ دے اور ان موقعوں پر کہے ہوئے اشعار پڑھے، تاکہ دونوں قبیلوں کے زخمہائے کہن تازہ ہوجائیں اور حمیت جاہلیت اپنا رنگ دکھائے،

یہ سازش بے نتیجہ نہیں رہی اور ان دونوں قبیلوں کی جو حریفوں اور دشمنوں کی طرح لڑتے تھے، رگِ حمیت بھڑک اٹھی، قریب تھا کہ تلواریں میانوں سے نکل آئیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کے ساتھ تشریف لے آئے، اور اپنے ارشادات سے ان کی ایمانی چنگاری کو فروزاں اور اُن کے دینی جذبہ کو بیدار کر دیا، اُن کو فوراً احساس ہوا کہ وہ ایک گہری سازش کا شکار ہوگئے، ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہوگیا، اوس و خزرج باہم بغلگیر ہوئے اور ایسا معلوم ہوا کہ کچھ نہیں ہوا تھا۔[1]

طبعی اور جغرافی کیفیت | یثرب ہجرت نبوی کے وقت مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا، جن میں یہودی اور عرب قبائل رہتے تھے، اور ہر علاقہ کسی نہ کسی قبیلے کے حصے میں تھا، ان علاقوں کی دو قسمیں تھیں، ایک قسم زراعتی زمینوں اور مکانات اور ان کے رہنے والوں پر مشتمل تھی، اور دوسری قسم میں "آطام یا اُطُم"[2] یا گڑھیاں اور قلعہ بند محلے تھے، یہودی ان گڑھیوں (آطام) کی تعداد ۵۹ تھی۔[3] ڈاکٹر ولفنسن ان آطام (گڑھیوں) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

---

[1] ملاحظہ ہو ابن ہشام ج ۱ ص ۵۵۵-۵۵۶ [2] ماخوذ از تاریخ الیہود فی بلاد العرب: اسرائیل ولفنسن ۱۱۶
[3] وفاء الوفا فی اخبار دار المصطفیٰ للسمہودی ۱/۱۱۶

یثرب میں آطام گڑھیوں کی بڑی اہمیت تھی، جہاں دشمن کے حملے کے وقت قبیلے کے لوگ پناہ لیتے تھے، اور خاص طور پر عورتوں، بچوں اور معذور لوگوں کو اس وقت ٹھکانا ملتا تھا جب مرد لڑنے کے لیے چلے جاتے تھے، یہ گڑھیاں گودام کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں جن میں غلے اور پھل جمع کیے جاتے تھے، کیونکہ وہ کھلی جگہوں پر لوٹ اور غارتگری کا نشانہ بن سکتی تھیں، اس کے علاوہ ان میں مال اور ہتھیار بھی رکھے جاتے تھے، یہ دستور تھا کہ سامان سے لدے ہوئے تجارتی قافلے گڑھیوں کے قریب ہی اترتے تھے، اور ان ہی گڑھیوں کے دروازوں پر بازار بھی لگتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان گڑھیوں میں عبادت گاہیں اور "مدراس (یہودی مدارس) بھی ہوتے تھے، اس لیے کہ جو عمدہ اور وافر سامان وہاں رہتا تھا اس سے اسی کا پتہ چلتا ہے، وہاں دینی کتابیں بھی رہتی تھیں، چنانچہ وہاں بحث و مشورہ کے لیے یہودی سردار جمع ہوتے، جہاں وہ کسی اہم معاملے کو پختہ کرنے یا عہد و معاہدہ کے وقت کتب مقدسہ کی قسمیں کھاتے تھے"[۱]

ڈاکٹر مذکور اطم کی تشریح کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ

" عبرانی زبان میں اس کے معنی بند و مسدود کر دینے کے ہوں گے، دیواروں کے ساتھ جب یہ لفظ آتا ہے تو اس کے معنی ان کھڑکیوں کے ہوتے ہیں جو باہر سے بند مگر اندر سے کھولی جا سکتی ہوں، اس کا استعمال فصیل یا زبردست حفاظتی دیوار کے لیے بھی ہوتا تھا...... اس طرح ہم فرض کر سکتے ہیں کہ یہود اطم کو چھوٹے قلعہ کے معنی میں استعمال کرتے تھے، اس میں باہر سے روشندان ہوتے تھے جو باہر سے بند اور اندر سے کھلے تھے۔[۲]

---

[۱] الیہود فی بلاد العرب ۱۱۶-۱۱۷ [۲] ایضاً ۱۱۷

یثرب انہی محلوں اور قلعہ بندیوں کا نام تھا جو در اصل قریب قریب کی بستیوں کا مجموعہ تھا جن سے شہر بن گیا تھا، قرآن نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔

مَآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ	جو کچھ دیا اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں
اَهْلِ الْقُرٰى (حشر-۷)	والوں سے

نیز دوسری جگہ فرمایا گیا :-

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِیْ	وہ تم سے اکٹھے نہیں لڑتے مگر یہ کہ
قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ	قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کے پیچھے ہوں،

مدینہ طیبہ میں حرات کی بھی بڑی اہمیت تھی، حرہ لابہ[1] جلے ہوئے سیاہ پتھروں کے اس علاقے کو کہتے ہیں جن کو آتشیں سیال مادہ نے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اور جو بالکل بے ترتیب اور سخت نوکیلے اور آڑے ترچھے میلوں کی مسافت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان پر نہ پیدل چلنا آسان ہے اور نہ اونٹوں اور گھوڑوں کا گذرنا، مدینے کے دو حرے مشہور ہیں، ایک جانب مغرب جس کو "حرة الوبرة" کہتے ہیں اور ایک جانب مشرق جو حرہ واقم کے نام مشہور ہے، علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے اپنی کتاب المغانم المطابة فی معالم الطابة میں متعدد حرات کا ذکر کیا ہے، جو مدینے کے گرد پھیلے ہوئے ہیں[2]، ان دونوں حرات (حرة الوبرة اور حرہ واقم) نے مدینے کو ایک قلعہ بند شہر بنا دیا ہے، جس پر صرف شمالی جانب سے فوج کشی ہو سکتی تھی، (اور یہی وہ جانب ہے جس کو غزوۂ احزاب میں خندق کھود کر محفوظ کر دیا گیا تھا) جنوبی جانب گھنے نخلستانوں اور باغات اور گنجان آبادی

---

[1] لابہ اور لاوا (Lava) متقارب الصوت اور متقارب المعنی لفظ ہیں، یہ اس آتش گیر مادہ کو کہتے ہیں جو کسی کوہ آتش فشاں سے یا طبقات الارض کی کسی تبدیلی سے ابل کر بہتا ہے [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۸-۱۱۴

کے ایک دوسرے سے ملے ہوئے مکانات سے ایسی گھری ہوئی ہے کہ ادھر سے بھی بیرونی حملہ مشکل ہے، ہجرت کے لیے مدینے کے انتخاب میں مدینے کے اس قدرتی استحکام اور فوجی خصوصیت کو بھی دخل تھا۔[1]

حرۂ واقم جو مدینے کے مشرق میں تھا، وہ حرۃ الوبرہ سے زیادہ آباد تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب کو ہجرت فرمائی تو حرۂ واقم میں یہود کے اہم قبائل جیسے بنو نضیر و بنو قریظہ وغیرہ رہتے تھے، ان کے ساتھ اوس کی اہم شاخیں بنو عبد الاشہل، بنو ظفر، بنو حارثہ بنو معاویہ بھی وہیں مقیم تھے، واقم بنی الاشہل ہی کے علاقے میں تھا جس کے نام پر حرۃ واقم تھا۔[2]

دینی حالت اور معاشرتی حیثیت مدینہ کی عرب آبادی بیشتر معاملات میں قریش ہی کے تابع رہتی تھی، اور اہل مکہ قریش کو کعبہ کا متولی، دینی رہنما اور عقیدہ و عمل میں لائق تقلید مثال سمجھتے تھے، وہ جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی بت پرستی کے تو تابع تھے ہی لیکن خاص طور پر انہی بتوں کو پوجتے تھے جنھیں قریش اور اہل حجاز پوجتے تھے، الایہ کہ قبائل کی بعض علاقائی بتوں سے زیادہ وابستگی تھی، اس طرح مناۃ اہل مدینہ کا سب سے محبوب و پرانا بت تھا اور اوس و خزرج اس کو مقدس ترین سمجھتے تھے اور اسے خدا کا شریک ٹھیراتے تھے، یہ بت جبل قدید کے مقابل مشلل کے مقام پر واقع تھا، جو ساحل کی طرف مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے، لات اہل طائف کا محبوب بت تھا، عزیٰ اہل مکہ کا قومی بت تھا، اس لیے ان شہروں کے لوگ اپنے اپنے ان بتوں سے جذباتی تعلق رکھتے تھے، اہل مدینہ میں سے جو کوئی لکڑی یا کسی چیز کا بت اپنے گھر میں رکھتا تو اسے 'مناۃ' ہی کے نام سے پکارتا جیسا کہ بنی سلمہ کے ایک سردار عمرو بن الجموح نے اسلام لانے سے پہلے بنا رکھا تھا۔[3]

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو کتاب کا باب "شہر یثرب کی خصوصیات" ۔ منزل الوحی للدکتور محمد حسین ہیکل ، ۵۱۱

[2] ماخوذ از بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب از علامہ محمود شکری الآلوسی ۱/۳۴۶ - ۲/۲۰۸

امام احمدؒ نے عروہ کے حوالے سے حضرت عائشہؓ سے ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ الآیۃ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا "انصار اسلام لانے سے پہلے مناۃ کے نام پر تلبیہ پڑھتے تھے اور جس کی وہ مشلل کے پاس پوجا کرتے تھے اور اس کے نام پر حج شروع کرنے والا صفا و مروہ کا طواف صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ جب لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ ہم زمانۂ جاہلیت میں صفا و مروہ کے طواف میں حرج سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی" ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ الآیہ

ہم مدینے میں کسی اور بت کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہ لات و مناۃ یا عزیٰ و ہبل کی طرح مشہور رہا ہو اور لوگ اس کی عبادت کرتے اور اس کیلئے مدینہ کے باہر سے آتے ہوں، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ میں بتوں کی کثرت نہ تھی، اس لیے کہ مکہ کے ہر گھر میں ایک خاص بت ہوتا تھا، مکہ میں بتوں کو لوگ پھیری میں لیکر نکلتے اور بیچتے تھے، بہرحال مکہ بت پرستی میں مقتدیٰ اور رہنما کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور مدینے کی حیثیت ذیلی تھی۔

اہل مدینہ سال کے دو دنوں میں کھیل کود کا تیوہار مناتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لائے تو اہل مدینہ سے فرمایا قد ابدلکم اللہ تعالیٰ بھما خیراً منھما یوم الفطر والاضحیٰ [1] (اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان دونوں سے بہتر دن عطا کئے ہیں، یوم فطر اور عید الاضحیٰ) بعض شارحین حدیث نے ان دو دنوں کے متعلق بتایا ہے کہ وہ نوروز اور مہرجان کے دن تھے، جنھیں شاید ان لوگوں نے اہل ایران سے لیا تھا، [2]

---

[1] اس میں صحابہ سے اور کئی روایتیں بھی منقول ہیں [2] صحیحین [3] بلوغ الارب

اوس وخزرج کی شرافت نسب کا اعتراف قریش کو بھی تھا جو عرب عاربہ سے تعلق رکھنے والے بنو قحطان کی شاخ میں سے تھے، قریش ان سے شادی بیاہ کا تعلق بھی رکھتے تھے، چنانچہ سید قریش ہاشم بن عبد مناف نے بنی النجار میں شادی کی تھی، انکی شادی سلمہ بنت عمرو بن زید سے ہوئی تھی، جو بنی عدی بن النجار سے تھیں جو خزرج کی ایک شاخ ہے، اس کے باوجود قریش اپنے کو مدینہ کے عرب قبائل سے برتر سمجھتے تھے۔

غزوۂ بدر کے دن جب عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ نے مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی اور ان کے مقابلے پر انصار کے کچھ نوجوان نکلے تو انھوں نے پوچھا تم کون ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم انصار ہیں، تو انھوں نے کہا کہ ہمیں تم سے مطلب نہیں۔ پھر ان میں سے ایک آدمی نے آواز دی کہ اے محمدؐ ہمارے مقابلے پر ہمارے ہم قوم اور ہمارے ہمسر افراد بھیجئے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبیدہ بن الحارثؓ! تم بڑھو، حمزہ تم بڑھو، علی تم کھڑے ہو، تو جب یہ لوگ ان کے قریب گئے اور اپنے نام بتائے تو قریش نے کہا کہ ہاں یہ شریف ہماری جوڑ کے ہیں۔[۱]

اس کی وجہ یہ ہے کہ قریش کاشت کاری کو (جس کے اہل مدینہ اپنے علاقائی حالات کی وجہ سے عادی تھے) کسی قدر حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اس کا اظہار ابوجہل کے اس جملے سے بھی ہوتا ہے جسے عفراء کے دو انصاری لڑکوں نے قتل کیا تھا، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس نے جاں کنی کے عالم میں کہا لو غیر اکار قتلنی[۲] (کاش کاشتکار کے علاوہ کسی نے مجھے قتل کیا ہوتا)۔

---

[۱] ابن ہشام ج ۱/۶۲۵ [۲] علامہ محمد طاہر پٹنی نے مجمع البحار میں اس کے معنی کسان اور کاشت کار دیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہ اہل عرب کے نزدیک کم درجہ کا پیشہ ہے، ابوجہل کا مطلب یہ تھا کہ عفراء کے لڑکے کسان ہیں، اسلیے اگر کسی اور نے قتل کیا ہوتا تو یہ عار نہ لگتا۔ ج ۱ ص ۶۸

اقتصادی اور تمدنی حالت مدینہ اپنی زمین کی نوعیت کے لحاظ سے ایک زرعی علاقہ تھا، اس لیے اس کے باشندوں کا انحصار زراعت اور باغبانی ہی پر تھا، اس کی اہم پیداواروں میں کھجوریں اور انگور تھے، کیونکہ وہاں ان کے بہت سے باغ تھے[1]، جن میں بہت سے ٹٹیوں والے اور بہت سے بے ٹٹی کے تھے، اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت دو تنے کے اور ایک تنے کے ہوتے تھے،[2]

کھیتی میں مختلف غلے اور سبزیاں ہوتی تھیں، کھجوریں قحط اور خشک سالی کے وقت لوگوں کی بیشتر غذائی ضرورت پوری کرتی تھیں، اور ضرورت کے وقت سکہ کی طرح ان سے بیع وشرا میں مدد لیجاتی تھی، اس طرح کھجور کے باغ اہل مدینہ کی زندگی میں بڑے خیر وبرکت کا سرمایہ تھے، ان سے وہ غذا بھی حاصل کرتے اور صنعت وتعمیرات اور ایندھن اور جانوروں کو کھلانے کے کام میں بھی لاتے تھے،[3]

---

[1] بیرحاء کے بارے میں ابو طلحہؓ کی حدیث ملاحظہ کریں جسے شیخین نے روایت کیا ہے،

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینے میں ایسے گھنے باغ بھی تھے کہ گوریا (کنجشک) جیسی چھوٹی چڑیا بھی گھس کر نکل نہیں پاتی تھی، ابو طلحہ انصاریؓ کے قصے میں ہے کہ وہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ تنے میں ایک گوریا باغ سے باہر نکلنے کے لیے ادھر ادھر اڑنے لگی، چنانچہ اس عجیب منظر کو وہ کچھ دیر تک دیکھتے رہے، اسی قصہ میں آگے ہے کہ اس غفلت کی وجہ سے انھوں نے اس باغ کو صدقہ کر دیا (ملاحظہ ہو موطا امام مالک)

[2] ملاحظہ ہو سورۃ الانعام ۱۴۱ اور الرعد ۴

[3] ملاحظہ ہو بخاری کتاب العلم (باب طرح الامام المسالة علی الناس لیختبر ما عندھم من العلم) اور اس کی شرح ابن حجر کی فتح الباری یا عینی کی عمدۃ القاری میں ملاحظہ ہو۔

مدینے کے کھجوروں کی بہت سی قسمیں تھیں جن کا احاطہ مشکل ہے[1]، اہل مدینہ کو طویل تجربے سے کھجوروں کی پیداوار کی افزائش اور عمدگی کے بہت سے طریقے معلوم تھے جن میں نر و مادہ کی تمیز اور ان کے زیروں کا استعمال بھی تھا جس کو "تابیر" کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے[2]۔

باغبانی اور زراعت کا مطلب یہ نہیں کہ مدینہ میں کوئی تجارتی سرگرمی تھی ہی نہیں، البتہ مکہ کی طرح اس کی گرم بازاری نہ تھی۔ کیونکہ بے آب و گیاہ وادی مکہ کے لوگوں کا انحصار قدرتی طور پر تجارت اور موسم سرما و گرما کے تجارتی سفروں پر تھا،

مدینے کی بعض صنعتیں یہودیوں ہی کے ساتھ مخصوص تھیں جنہیں شاید وہ یمن سے لائے تھے، بنی قینقاع کے لوگ عام طور پر سناری اور زرگری کا پیشہ کرتے تھے، اور یہود مدینہ میں سب سے زیادہ مالدار تھے، ان کے گھر مال و دولت اور سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھے[3]،

مدینہ کی زمین آتش فشاں علاقوں (حرات) کی موجودگی کی وجہ سے بہت زیادہ زرخیز واقع ہوئی ہے، جس کی وادیوں میں سیلاب کا پانی بھی خوب بہتا ہے، اور زمینوں کے ساتھ کھیتوں اور باغوں کو بھی سیراب اور شاداب کرتا جاتا ہے، ان میں سب سے مشہور وادی عقیق تھی، جو مدینے کی تفریح گاہ تھی اُس میں پانی بافراط رہتا تھا، اور باغوں کی کثرت تھی، مدینے کی زمین کنویں کھودنے کے لیے بھی بہتر تھی، جن کا باغات میں عام رواج تھا،

---

[1] کھجور سے متعلق عربی میں الفاظ کا جو وسیع ذخیرہ پایا جاتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کی زندگی میں عموماً اور اہل مدینہ کی زندگی میں خصوصاً کھجور کو کیسی اہمیت و مرکزیت حاصل تھی، مثال کے طور پر ابن قتیبہ کی "ادب الکاتب"، ثعالبی کی "فقہ اللغۃ" اور ابن سیدہ کی "المخصص" ملاحظہ ہوں، بہت سے اہل علم نے کھجور پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ [2] تابیر کا مطلب مادہ کھجور کے خوشوں کو چیر کر نر کھجور کے ذیرے ڈالنے کے ہیں (شرح مسلم للنووی)، [3] الیہود فی بلاد العرب ص ۱۲۸

باغات کے گرد چہار دیواری بھی ہوتی تھی، ایسے باغ کو اہل مدینہ "حائط" کہتے تھے،[1]

اسی طرح مدینہ کے بہت سے کنویں اپنے پانی کی فراوانی و شیرینی کے لیے مشہور تھے، وہاں نہریں اور رہٹ کا نظام بھی تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے باغوں تک پانی پہنچاتے تھے،[2]

غلوں میں اولیت جو اور پھر گیہوں کو حاصل تھی اور سبزیوں اور ترکاریوں کی بہتات تھی، کھیتی کے معاملات کی کئی قسمیں تھیں، مثلاً مزابنۃ، محاقلہ، مخابرہ، معاومۃ۔[3] ان شکلوں میں بعض کو اسلام نے باقی رکھا اور بعض کو منع کر دیا یا اس کی اصلاح کر دی،

مکہ اور مدینہ میں جو سکے رائج تھے، وہ ایک ہی تھے، اور ہم ان کا تفصیل سے مکہ کے سلسلہ

---

[1] صحیح بخاری (کتاب المغازی) میں کعبؓ بن مالک کی ابتلاء کا واقعہ دیکھئے جس میں آیا ہے کہ "جب مجھ پر لوگوں کی سختی اور بے اعتنائی بڑھ گئی تو میں حائط ابی قتادہ کی دیوار پر چڑھا جو میرا چچیرا بھائی تھا" الخ

[2] ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث پڑھیں جسے مسلم نے روایت کیا ہے، اور جس میں ایک باغ کے سیراب کرنے کا ذکر آیا ہے، اور اسی میں "شراج" (پانی کی نالیاں) اور "مساحاۃ" (پھاوڑے) سے آب رسانی کا بھی ذکر ہے

[3] صحاح میں حرث و مزارعہ کے ابواب دیکھئے، مزابنۃ درخت میں لگی ہوئی کھجوروں کو نقد کھجوروں سے بیچنے کو کہتے ہیں، محاقلہ خوشوں میں لگے ہوئے غلے کو نقد غلے یعنی جو کو جو کے بدلے اور گیہوں کو گیہوں کے بدلے تول کر لینے کو کہتے ہیں، مخابرۃ اور مزارعۃ کچھ یکساں ہیں، یہ زمین کی پیداوار کی تہائی یا چوتھائی پر معاملہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن مزارعۃ میں بیج مالک کے ہوتے ہیں، اور مخابرۃ میں بیج کاشتکار کے، اہل لغت کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ وہ ایک ہی ہیں، مزارعۃ و مخابرہ کی صحت میں خلف و سلف کا اختلاف مشہور ہے، (ماخوذ از شرح مسلم للنووی) معاومۃ کئی سال کی فصلوں کو بیچ دینے کو کہا جاتا ہے، جیسے درخت کے پھل دو تین سال یا زیادہ کے لیے بیچ دیے جائیں۔

میں ذکر کر چکے ہیں[1]، اہل مکہ کے مقابلے میں اہل مدینہ کو ناپ تول کے پیمانوں سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا کیونکہ وہاں کے باشندوں کا سرمایہ غلے اور پھل ہی تھے، مدینے میں استعمال ہونے والے پیمانے یہ تھے، مد، صاع، فرق، عرق، وسق۔[2] وزن کے لیے یہ چیزیں تھیں: درہم، شقاق، دانق، قیراط، نواۃ، رطل، قنطار اور اوقیہ۔[3]

مدینہ اپنی زرخیزی کے باوجود غذائی طور پر خودکفیل نہ تھا، اس لیے وہاں کے باشندے باہر سے بھی غذائی اشیاء درآمد کرتے تھے، وہ میدہ کا آٹا، گھی اور شہد شام سے لاتے تھے، جیسا کہ ترمذی نے قتادہ بن نعمانؓ سے روایت کیا ہے جس میں آیا ہے کہ مدینے کے لوگوں کی غذا کھجوریں اور جو تھے، اور جب آدمی خوشحال ہوتا تو جب شام سے ضافط (تاجر)[4] میدہ[5]

---

[1] اسکا خلاصہ یہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں بالعموم رومی اور ایرانی سکے چلتے تھے، ان میں بڑا سکہ دینار اور چھوٹا درہم کہلاتا تھا، علامہ محمود شکری الآلوسی (مصنف بلوغ الارب) کی تحقیق کے مطابق دراہم کی دو قسمیں تھیں: (۱) بغلیہ (۲) طبریہ۔ بغلیہ یہ جو سیاہ رنگ کا ہوتا تھا ایران کا نقش ہوتا تھا اور وہ آٹھ دوانیق کا ہوتا تھا، طبریہ کی نسبت شام کے مقام طبریہ کی طرف ہے، یہ رومی سکہ تھا اس کا وزن چار دوانیق کا ہوتا تھا، امام ماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں مزید تفصیل دی ہے، جہاں تک دنانیر کا تعلق ہے جو سب سے بڑا سکہ تھا اکثر علماء کا کہنا ہے کہ وہ صرف رومی سکہ تھا، ایران کے سکے کم قیمت اور ادنیٰ معدنیات کے ہوتے تھے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو التراتیب الاداریۃ للعلامہ عبدالحئی الکتانی) [2] تفصیل کے لیے حدیث اور خلافیات کی کتابیں دیکھیں اور اوزان کے لیے دیکھیں التراتیب الاداریۃ ۱/۴۱۳-۴۱۵) [4] ضافط کے متعلق علامہ محمد طاہر پٹنی لکھتے ہیں: ضافط اور ضفاط اسے کہا جاتا تھا جو مال و اسباب شہروں تک پہنچاتا تھا، نبطی قوم کے افراد ہوتے تھے، جو مدینے تک آٹا، تیل وغیرہ پہنچاتے تھے (مجمع البحار ۳/۱۰ طبع حیدرآباد) [5] یہاں درمک کا لفظ آیا ہے جو سفید میدے کو کہتے ہیں، اس کا واحد درمکہ ہے۔

لیکر آتا تو اس سے اپنے لیے وہ چیزیں خرید لیتا لیکن اہل و عیال کھجوریں اور جو ہی کھاتے تھے[1]۔ یہ قصہ مدینہ کی غذائی صورتِ حال اور معیارِ زندگی کے اختلاف پر کافی روشنی ڈالتا ہے، جو ہجرت کے بعد اچانک سامنے نہیں آگئی تھی۔

یہود جنگی فطرت اور تاریخ ہر جگہ یکساں رہی ہے، مدینے میں بھی عربوں سے زیادہ مالدار واقع ہوئے تھے، عرب اپنے بدوی اور قومی مزاج کی وجہ سے مستقبل کے بارے میں زیادہ سوچنے کے عادی نہ تھے کہ اس کے لیے مال جمع کرنے کی فکر کرتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مہمان نواز اور فیاض بھی تھے، اس وجہ سے یہود سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے اور یہ قرض اکثر سودی یا رہنی ہوتا تھا۔

اہل مدینہ کے پاس اونٹ، گائیں اور بکریاں بھی تھیں، اونٹ کو زمین کی سینچائی کے لیے بھی استعمال کرتے تھے، اور ایسے اونٹوں کو الابل النواضح کہتے تھے، ان کے پاس چراگاہیں بھی تھیں، جن میں مشہور زغابۃ اور غابۃ تھیں، جہاں سے لوگ لکڑیاں بھی حاصل کرتے اور مویشیوں کو چراتے بھی تھے[2]۔ گھوڑوں کو وہ جنگوں میں استعمال کرتے تھے، اگرچہ وہ مکے کی بہ نسبت کم تعداد میں پائے جاتے تھے، بنو سلیم گھوڑوں کے لیے مشہور تھے، جنھیں وہ باہر سے درآمد کرتے تھے۔

مدینے میں کئی بازار بھی تھے، جن میں سب سے اہم 'سوق بنی قینقاع' تھا، جو سونے و چاندی کے زیورات و مصنوعات اور کپڑے والوں کا خاص بازار تھا، اس وقت مدینے میں سوتی اور ریشمی کپڑے، رنگین غالیچے اور منقش پردے[3] عام طور پر موجود تھے، عطر فروش

---

[1] ملاحظہ ہو آیت ولا تجادل عن الذین یختانون انفسھم ان اللہ لا یحب من کان خوانا اثیما کی تفسیر ترمذی میں [2] یاقوت حموی کی معجم البلدان اور سمہودی کی وفاء الوفا، ملاحظہ ہو [3] حضرت عائشہؓ کی حدیث ملاحظہ ہو جسے شیخین نے روایت کیا ہو، اس میں قرام کا ذکر آیا ہے، قرام کے بارے میں علامہ عینی کہتے ہیں کہ وہ باریک پردہ یا کئی رنگوں کی اون کی چادر یا وہ پردہ ہوتا ہو جو حجلۂ عروسی میں لگتا ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ مزین و منقش بھی ہوتا ہے (مجمع بحار الانوار ۴/۲۵۶)

مختلف قسم کے عطر اور مشک فروخت کرتے تھے۔ اسی طرح عنبر اور پارے[1] کے تاجر بھی پائے جاتے تھے۔ خرید و فروخت کی بہت سی قسموں میں سے بعض کو اسلام نے باقی رکھا، اور بعض کو ترک کر دیا، جیسے نجش و احتکار، تلقی الرکبان، بیع المصراۃ (جانوروں کے تھن میں دودھ محفوظ کر کے بیچنا) بیع نسیئہ، بیع الحاضر للبادی، بیع المجازفۃ، بیع المزابنۃ اور مخابرۃ[2] وغیرہ۔ اور بعض لوگ بھی سودی کاروبار کرنے لگے تھے، مگر وہ یہود کی نسبت بہت ہی کم تھا۔

مدینے کی تمدنی زندگی میں وہاں کے باشندوں کے مزاج و خوش مذاقی کے سبب خاصی ترقی ہو چلی تھی، چنانچہ دو منزلہ مکان بننے لگے تھے۔[3]

بعض گھروں کے ساتھ پائیں باغ بھی تھے، وہ میٹھے پانی کے عادی تھے، جسے ایک شخص کبھی دور سے بھی لانا پڑتا تھا، بیٹھنے کے لیے کرسی کا استعمال بھی ہوتا تھا،[4] شیشے اور پتھر کے پیالے اور آبخورے استعمال میں آتے تھے، اور مختلف قسم کے چراغ استعمال ہوتے تھے،[5] گھر اور کھیت کے کاموں میں چھوٹی ٹوکریاں اور زنبیلیں کام میں لائی جاتی تھیں، مال داروں خصوصاً یہود کے گھروں میں خاصا فرنیچر پایا جاتا تھا، قسم قسم کے زیورات بھی استعمال ہوتے تھے، جیسے کنگن اور بازوبند، پازیب اور کڑے، کان کے بندے اور بالیاں، انگوٹھیاں اور سونے یا مینی دانوں کے ہار وغیرہ۔[6]

عورتوں میں بننے اور کاتنے کا عام رواج تھا اور سلائی، رنگائی، معماری اور خشت سازی اور سنگ تراشی اُن صنعتوں میں تھیں جو ہجرت سے بہت پہلے ہی مدینے میں معروف تھیں۔

---

[1] التراتیب الاداریۃ ۱/۷، [2] کتب حدیث و فقہ کے ابواب بیع اور مجمع بحار الانوار ملاحظہ ہوں، جہاں ان لفظوں کی شرح اور انکی حلت و حرمت کے احکام ملیں گے [3] ملاحظہ ہو حدیث ہجرت اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قیام فرمانے کا واقعہ [4] التراتیب الاداریہ ۱/۹۷ [5] ایضاً ص ۱۰۳ [6] واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ملاحظہ ہو، جسے بخاری نے کتاب المغازی میں نقل کیا ہے، اس میں جزع کا لفظ ہے جو سیاہ سفید رنگ کے دانوں کو کہتے ہیں، ظفار یمن کا ایک شہر ہے۔

یثرب کا پیچیدہ اور ترقی یافتہ معاشرہ | اس طرح یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین نے مکے سے یثرب نام کے کسی گاؤں کی طرف سفر نہیں کیا تھا بلکہ وہ حضرات ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف منتقل ہوئے تھے، اگرچہ یہ دوسرا شہر پہلے شہر کے مقابلے میں زندگی کے بہت سے مظاہر میں مختلف تھا، اور نسبتہً مکے سے کچھ چھوٹا بھی تھا لیکن وہاں کی زندگی پیچیدگی میں مکے سے بڑھی ہوئی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آنے والے مسائل مختلف نوعیت کے تھے، کیونکہ وہاں کئی مذاہب اور معاشرے اور ثقافتیں موجود تھیں جن پر قابو پانے اور مدینے کو ایک عقیدے اور ایک دین کے رنگ میں رنگنے کا کام مؤید من اللہ رسول ہی کر سکتا تھا، جسے اللہ نے حکمت و بصیرت اور قوت فیصلہ اور انسانیت کے بکھرے شیرازے کو جمع کرنے اور متحارب قوتوں اور نظریوں کو ہدایت اور تعمیر انسانیت کے کام میں ایک دوسرے کا مددگار بنانے کی غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا، اور جسے ایک دلکش شخصیت عطا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کتنا صحیح کہا ہے کہ

هُوَ الَّذِىٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ	وہی ہے جس نے اپنی مدد اور مسلمانوں کے
وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ	ذریعہ آپ کی پشت پناہی کی اور ان کے
قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى	دل ملا دیے کہ اگر آپ دنیا کی ساری
الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ	دولت بھی خرچ کر دیتے تب بھی ان کے
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے لیکن اللہ
اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ	ہی نے ان میں جوڑ اور اتفاق پیدا کر دیا
حَكِيْمٌ ۔ (الانفال۔ ۶۳)	وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

یہود اور قرآن مجید

از
ضیاء الدین اصلاحی

(سلسلہ کے لیے معارف نومبر ۱۹۸۰ء ملاحظہ ہو)

خداوند قدوس نے یہود کو جہاں یہ سب نعمتیں بخشی تھیں، وہیں ان کو کچھ ذمہ داریوں اور فرائض کا مکلف بھی بنایا تھا اور یہ تاکید کر دی تھی کہ تم پر جو انعامات کیے گئے ہیں ان کا سلسلہ اُس وقت تک تمھارے اندر باقی رہے گا، جب تک تم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہوگے، لیکن اگر تم نے ناشکری کا رویہ اختیار کیا، خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی، اس کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور اس کی کتابوں کی تکذیب کی تو تم اس کی لعنت کے مستحق ہوگے اور تمھاری عزت و حشمت خاک میں مل جائے گی، ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ
وَبَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا وَقَالَ
اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ
وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ ......
وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ
وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ
عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَلَاُدْخِلَنَّکُمْ

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ہم نے
ان میں سے بارہ [۱۲] نقیب مامور کئے، اللہ نے
کہا بیشک میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم نماز
قائم کروگے، زکوٰۃ دیتے رہوگے، میرے رسول
پر ایمان لاؤگے، ان کی مدد کرتے رہوگے اور اللہ
کو قرض حسن دیتے رہوگے تو میں تم سے تمھارے گناہ
دور کر دونگا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کر دونگا

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (مائدہ - ۱۲)

جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، پس جو اسکے بعد تم میں سے کفر کریگا تو وہ اصل شاہراہ سے بھٹک گیا،

آگے یہ بتایا گیا ہے کہ اگر وہ خدا کی ہدایت و شریعت کو اختیار کر کے اس پر مضبوطی سے قائم رہے تو تمام مادی و روحانی برکتوں اور اخروی کامیابیوں کے مستحق ہوں گے،

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ - ۶۵ - ۶۶)

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ جھاڑ دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات، انجیل اور اس چیز کو قائم کرتے جو انکی طرف ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے خدا کا [illegible]

لیکن اگر وہ خدا کی ہدایت سے روگردانی اختیار کریں گے تو ان کا کوئی وزن باقی نہیں رہے گا،

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (مائدہ - ۶۸)

کہہ دو اے اہل کتاب تمھاری کوئی بنیاد نہیں جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو قائم نہ کرو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے۔

یہود کو جن ذمہ داریوں کا مکلف بنایا گیا تھا ان کی تفصیل قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں بیان ہوئی ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں معراج کے بیان میں امت مرحومہ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے واسطے جو احکام و وصایا عطا کیے گیے تھے بعینہ اسی طرح کے احکام حضرت موسیٰؑ کے واسطے سے کوہ طور کی معراج میں یہود کو بھی دیے گئے تھے، قرآن کے احکام دراصل توراۃ کے احکام کا نقش ثانی اور تتمہ ہیں[1]، بہ حیثیت مجموعی احکام حسب ذیل تھے۔

(۱) توحید کا اقرار اور شرک سے اجتناب (۲) والدین کے ساتھ حسن سلوک (۳) رشتہ دار اور دوسرے اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی (۴) اسراف و تبذیر کے بجائے اعتدال و میانہ روی کی تلقین (۵) اولاد کشی سے پرہیز (۶) زنا اور بدکاری سے اجتناب (۷) ناحق قتل و خونریزی کی ممانعت (۸) یتیموں کے ساتھ حسن سلوک (۹) ایفائے عہد (۱۰) ناپ تول میں کمی بیشی کی ممانعت (۱۱) نامعلوم بات کی ٹوہ میں نہ پڑنا (۱۲) کبر و غرور اور زمین پر اکڑنے کی ممانعت[2] (۱۳) حق و عدل کا شیوہ اختیار کرنا (۱۴) نماز و زکوٰۃ کا اہتمام (۱۵) اپنی قوم کے لوگوں کو جلاوطن نہ کرنا (۱۶) انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا، توراۃ و انجیل کی تعلیمات پر عمل کرنا اور قرآن و رسالت محمدی کو تسلیم کرنا (۱۷) آیات الٰہی کو دنیا کے حقیر معاوضہ کی خاطر فروخت نہ کرنا (۱۸) کتمان حق اور حق و باطل کو گڈمڈ کرنے کی ممانعت۔

توراۃ کے احکام عشرہ حسب ذیل تھے،

(۱) خدا سے ڈر، اس کی جھوٹی قسم مت کھا اور شرک و بت پرستی سے بچ (۲) والدین کی عزت اور بزرگوں کا احترام کر، پردیسی کو نہ ستا اور پڑوسی کو نہ جھڑک، اس کے معاملہ میں عفو سے کام لے اور اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کر (۳) سبت (سنیچر) کے دن کی حرمت

---

[1] تفصیل کے لیے سیرت النبی جلد سوم میں اسراء (معراج) کا بیان ملاحظہ ہو۔ [2] یہاں تک کے احکام سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ انعام میں بیان ہوئے ہیں، آگے کے احکام بقرہ، مائدہ اور اعراف وغیرہ میں مذکور ہیں۔

قائم رکھ (۴) چغلخوری، چوری اور فریب دینے سے بچ (۵) نسل وحسب کو گندہ نہ کر، زانی کو کوڑے مار، اپنی لڑکیوں اور عورتوں سے بدکاری نہ کرا (۶) پھلوں کی زکوٰۃ ادا کر اور پیداوار میں سے فقراء و مساکین کا حصہ نکال (۷) ناحق قتل وخونریزی نہ کر (۸) سحر وشعبدہ کو حرام سمجھ اور جادوگروں اور کاہنوں کی طرف مت مائل ہو (۹) سچی اور حق بات کہہ، فیصلہ میں انصاف کر، ناپ تول میں کمی نہ کر، مزدور کی اجرت دینے میں ٹال مٹول مت کر (۱۰) اپنی قربانی کا گوشت تین دن سے پہلے پہلے کھا جا۔ (باب خروج ۲۹-۳۴)

مگر ان تمام احکام وہدایات کی یہود نے مطلقاً پروا نہ کی، ان سب کے بارہ میں ان کے رویہ کا طوالت کے خوف سے جائزہ لینا ممکن نہیں، تاہم بعض بنیادی امور کے سلسلہ میں انکے عبرتناک طرز عمل کا ذکر کیا جاتا ہے۔

یہود کی شرک وبت پرستی یہود کو سب سے مقدم اور بنیادی حکم توحید اور خدا پرستی کا دیا گیا تھا، اور شرک وبت پرستی سے باز رہنے کی تلقین کی گئی تھی، مگر وہ مصریوں کی شرک وبت پرستی سے اس قدر مانوس اور خود ایسی ذہنی واخلاقی پستی میں مبتلا تھے کہ فرعون کے مظالم سے چھٹکارا پانے اور خدا کی قدرت وجلال کے حیرت انگیز واقعہ کا مشاہدہ کرنے کے فوراً بعد ہی بت پرستی کی تمنا اور حضرت موسیٰؑ سے اپنے لیے دیوی دیوتا مقرر کرنے کا مطالبہ کرنے لگے، حضرت موسیٰؑ ان کے اس نامعقول مطالبے اور ایسی بیہودہ خواہش پر سخت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ نادانو! خدا نے تو تم پر عظیم الشان انعامات کیے اور تم خود اس کی کار فرمائی اور کرشمہ سازی کے حیرت انگیز واقعات کا اپنی آنکھوں سے بار بار مشاہدہ کر چکے ہو مگر اسکے باوجود تم شرک سے اپنی وابستگی باقی رکھنا چاہتے ہو اور ایسی حماقت کی باتیں کرتے ہو؛

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ — اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو

فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰی
اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ
لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ
اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ. اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ
مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا
یَعْمَلُوْنَ. قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْکُمْ
اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ

ان کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جو
اپنے کچھ بتوں کی پرستش کر رہی تھی بولے کہ
اے موسیٰ جس طرح انکے دیوتا ہیں
اسی طرح کا ایک دیوتا ہمارے لیے بھی
بنا دو، اس نے کہا تم بڑے ہی جاہل
لوگ ہو، ان لوگوں کا یہ سب کچھ جس میں
لگے ہوئے ہیں برباد اور جو کچھ کر رہے ہیں
نیست و نابود ہو جانے والا ہے، اس نے
کہا کیا میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود
ڈھونڈوں حالانکہ اسی نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت بخشی ہے

(اعراف ۱۳۸۔۱۴۰)

یہ تو محض ذہنی تمنائے شرک و بت پرستی کا ذکر تھا جس پر حضرت موسیٰؑ نے ایسی سخت سرزنش کی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی اصلاح نہ کر سکے بلکہ جب حضرت موسیٰ خدا سے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت و شریعت طلب کرنے کے لیے طور پر گئے تو ان کی عدم موجودگی میں انکے جانشین حضرت ہارونؑ کی سخت دار و گیر کے باوجود وہ علانیہ بت پرستی کا ارتکاب کر بیٹھے اور اپنے ہی زیوروں سے بچھڑے کی ایک مورت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْ بَعْدِهٖ
مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ
خُوَارٌ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُکَلِّمُهُمْ
وَلَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا اِتَّخَذُوْهُ

اور موسیٰ کی قوم نے اسکے پیچھے اپنے زیوروں
سے ایک بچھڑا بنایا یعنی ایک دھڑ جس سے
بھاں بھاں کی آواز ہوتی تھی، کیا انھوں نے غور
نہ کیا کہ نہ وہ ان سے بات کرتا ہے اور نہ انکو

وَكَانُوا ظَالِمِينَ (اعراف ۱۴۸) کوئی راہ دکھاتا ہے اسکو انھوں نے دیوتا بنایا اور وہ ظلم کرنے والے تھے۔

توراۃ کی کتاب خروج کے باب (۳۲) میں بھی ان کے گوسالہ پرستی کی لعنت میں پڑ جانے کا ذکر ہے لیکن توراۃ کے مرتبین نے بنی اسرائیل کے جرم کو ہلکا کرنے کے لیے یہ سارا کاروبار حضرت ہارونؑ کی جانب منسوب کر دیا ہے، مگر قرآن مجید نے سورہ طٰہٰ میں تصریح کی ہے کہ یہ سارا ڈھونگ بنی اسرائیل کے ایک بڑے مفسد اور شاطر شخص سامری نے رچایا تھا، جو مصر کے مندروں کے بھیدوں سے واقف ہونے کی بنا پر بتوں کی صنعت گری کو اچھی طرح جانتا تھا، اس لیے اس نے اپنی مہارت سے بڑی آسانی سے ایک ایسے بچھڑے کی مورت بنا دی جس میں ہوا کے جاتے ہی بھاں بھاں کی آواز آنے لگتی تھی، بنی اسرائیل کو اپنی سادہ لوحی اور بت پرستانہ ذہنیت کی وجہ سے سامری کا بنایا ہوا یہ بچھڑا ایسا اچھا لگا کہ انھوں نے اسکی پرستش شروع کر دی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود شرک و بت پرستی کی لعنت سے اپنے کو اس زمانہ میں بھی محفوظ نہیں رکھ سکے تھے جب خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰؑ اُن کے اندر موجود تھے۔ اور انھوں نے خدا کی قدرت و کارسازی کے نہایت عجیب و غریب واقعات کا مشاہدہ کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد بھی ان کی یہ عادت نہیں بدلی۔ اور خدائی احکام سے روگردانی، انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی اور شرک سے دلچسپی کا سلسلہ جاری رہا، قرآن مجید نے انکے کئی مشرکانہ اعمال و عقائد کا ذکر کر کے دکھایا ہے کہ وہ ایمان کی راہ ہدایت اور توحید کی صراط مستقیم سے منحرف ہو کر کفر و شرک کی گمراہیوں میں پڑ گئے تھے۔

یہود زبان سے ضرور اللہ پر ایمان اور توحید کے اقرار کے مدعی تھے لیکن ان کے عقیدہ و عمل سے اسکی کوئی تائید نہیں ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

کہا کہ سب سے پہلے تم ان کو اس مرکزی نقطہ کی دعوت دو جو تمہارے اور اہل کتاب کے درمیان مشترک ہے،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ	کہہ دو اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ
كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ	جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے،
لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ	یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں،
شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا	اور نہ اسکے ساتھ کسی چیز کو شریک کریں
أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ	نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے، اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں
(آل عمران ۶۴)	تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے نزدیک بھی یہ امر مسلم تھا کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کیجائے اور نہ کسی کو اس کا ساجھی اور شریک بنایا جائے مگر اس کے باوجود انکا عمل اس کے خلاف تھا، اس لیے قرآن نے ان کو یہ تناقض دور کرنے، توحید خالص کا علمبردار بنجانے اور شرک وکفر سے بیزاری اختیار کرلنے کی تلقین کی تھی، مگر انھوں نے اسکی اس مخلصانہ دعوت کی قدر نہیں کی اور شرک و بت پرستی کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان ویقین کی بصیرت میں آنا پسند نہیں کیا، اسی لیے قرآن سب سے یہود کے ایمان کی نفی کرتا اور ان کو کفار ومشرکین کی صف میں شامل کرتا ہے، چنانچہ سورہ توبہ میں عرب کے کفار ومشرکین کی طرح ان سے بھی ترک موالات اور جہاد کا حکم ان لفظوں میں دیا گیا ہے،

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	ان اہل کتاب سے قتال کرو جو اللہ اور آخرت کے
وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ	دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس چیز کو
مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ	حرام ٹھہراتے ہیں جن کو اللہ اور اس کے

دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ - ۲۹)

...نے حرام قرار دیا ہے اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہوکر جزیہ دینے لگیں۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اہل کتاب (یہود ونصاری) کا اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رہا تھا، کیونکہ وہ دین حق سے روگرداں اور احکام الٰہی سے منحرف ہوگئے تھے، انھوں نے تشریع اور قانون سازی کے اختیارات خدا کے بجائے دوسروں کو دے رکھے تھے، جس کو چاہتے حلال وحرام قرار دے لیتے تھے،

قرآن کی دوسری آیتوں میں بھی ان کے ایمان کی نفی کی گئی ہے، اور ان کو کفر وشرک میں ملوث بتایا گیا ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں یہود کے اخفا اور کتمان حق کی بعض صورتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا :-

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (بقرہ ۱۶۱)

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے،

سورۂ مائدہ میں ہے کہ :-

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ (مائدہ ۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت ہوئی۔

سورۂ نساء میں یہود اور منافقین کے ایمان کی نفی کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ...

کیا ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو...

اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ	کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر ایمان لائے جو
وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ	تم پر اور تم سے پہلے اتاری گئی ہے، لیکن
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ	چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا تصفیہ طاغوت
وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ	سے کرائیں، حالانکہ انھیں اس کے انکار
وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ	کا حکم دیا گیا ہے، اور شیطان چاہتا ہے کہ
ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (نساء - ۶۰)	انھیں نہایت دور کی گمراہی میں کر دے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو ان کے صراط مستقیم سے منحرف ہو کر معبودان باطل کی پرستش اور شرک کی آلودگی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، آگے ان کے مزید مشرکانہ عقائد و اعمال کی تفصیل پیش کی جاتی ہے،

حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا بنا لینا یہود کے کفر و عدم ایمان کے ضمن میں سورہ توبہ کی جو آیت اوپر نقل کی گئی ہے اس کے بعد ہی اس کے ثبوت میں پہلی چیز یہ بیان کی گئی ہے کہ

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ	اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں
وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ	اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اس کے بیٹے ہیں
ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ	یہ ان لوگوں کی من گھڑت باتیں ہیں
قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ	جو ان لوگوں کی بات کے مانند ہیں جنھوں
قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ	نے ان سے پہلے کفر کیا، اللہ ان لوگوں
(توبہ - ۳۰)	کو غارت کرے، یہ کہاں بھٹکتے ہیں۔

گو یہ تمام یہودیوں کا عقیدہ نہیں تھا، تاہم ان کی ایک جماعت ضرور اس کی قائل تھی، اور اب تک ان کے ایک فرقہ کا یہی عقیدہ چلا آرہا ہے، اسی لیے یہود جو قرآن کی ہر بات میں

میں میکھ نحا و کرتے تھے۔ اس کے اس الزام پر خاموش رہے اور تردید کی جرأت نہیں ہوئی۔ حضرت عزیرؑ کو اس قدر غیر معمولی اہمیت اس بنا پر حاصل ہو گئی تھی کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو تباہ کرکے یہود کو بابل میں قید میں ڈال دیا تو اس زمانے میں توراۃ کے تمام نسخے بھی جل کر خاک ہو گئے، ایک عرصہ کے بعد جب یہود قید بابل سے رہا ہوئے اور یروشلم واپس لوٹے تو حضرت عزیرؑ نے اپنی یادداشت سے توراۃ کو از سر نو لکھا، اس کے بعد سے انہی کے مرتب کیے ہوئے نسخہ کو اصل توراۃ کا بدل سمجھا جانے لگا۔ اس خدمت اور کتاب و شریعت کی تجدید کے نتیجہ میں یہود کے نزدیک حضرت عزیرؑ کا مرتبہ بہت بڑھ گیا اور بعض لوگ ان کو حضرت موسیٰؑ کے برابر سمجھنے لگے، آگے چل کر انکے بارہ میں اس قدر غلو کیا گیا کہ وہ خدا کے بیٹے سمجھے جانے لگے، یہ اسی طرح کا شرک تھا جس طرح کے شرک میں نصاریٰ مبتلا تھے،

اللہ کے سوا دوسروں کو رب بنانا یہود کا دوسرا شرک یہ بیان کیا گیا ہے کہ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے اپنے علما، اور راہبوں کو اللہ
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ	کے بجائے رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی،
ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا	حالانکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ صرف ایک ہی
اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	خدا کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود
سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (توبہ۔۳۱)	نہیں، وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک ہے۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس شرک کا ذکر ہے کہ انھوں نے اپنے فقہا و علما اور مشائخ و پیشوایان دین کو وہ درجہ اور اختیار دے رکھا تھا جو خدا کے لیے مخصوص ہے، چنانچہ تشریع و قانون سازی اور تحلیل و تحریم وغیرہ جو اللہ کا مخصوص حق تھا اس میں انھوں نے

علماء و مشائخ کو شریک اور ساجھی بنا لیا تھا، اس آیت کے متعلق حدیث میں حضرت عدی بن حاتم کا جو پہلے خود عیسائی تھے، یہ سوال منقول ہے کہ اے اللہ کے رسول یہود و نصاریٰ اپنے علماء و صوفیہ کو رب تو نہیں مانتے تھے، رسول اللہؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جن چیزوں کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے، یہ لوگ جب ان کو حرام ٹھہرا دیتے ہیں تو کیا تم لوگ بھی ان کو حرام نہیں سمجھنے لگتے ہو اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے ان کو جب یہ لوگ حلال قرار دیتے ہیں تو کیا تم لوگ بھی ان کو حلال نہیں کر لیتے ہو" تو حضرت عدیؓ نے کہا ہاں یہ بات تو ہے، آپؐ نے فرمایا:

فَتِلْكَ عبادتهم   سو یہی ان کی عبادت ہے،

حضرت عدیؓ بن حاتم کو یہ شبہہ تھا کہ جب تک کسی کو رب کہا اور سمجھا نہ جائے اور اس کی رسمًا پرستش نہ کیجائے اس وقت تک وہ معبود اور رب نہیں ہوتا، رسول اللہؐ نے انکے اشتباہ کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر وہ حقوق و اختیارات جو اللہ کو حاصل ہیں کسی اور کو دیدیئے جائیں تو چاہے اس کو زبان سے خدا نہ کہا جائے اور اس کی رسمًا پرستش بھی نہ کی جائے پھر بھی یہ اس کو خدا بنا لینا ہوا جو شرک ہے، قرآن نے یہود کی تحلیل و تحریم اور آیاتِ الٰہی سے روگردانی کے جو واقعات بیان کیے ہیں، ان سے انکے اس طرزِ عمل کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

ایمان بالجبت والطاغوت | یہود کے بعض مشرکانہ اعمال و حرکات کا اس آیت میں بھی ذکر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا	کیا ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی
مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ	کا ایک حصہ عطا کیا گیا تھا، یہ لوگ جبت
وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ	و طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں
كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ	کو ایمان والوں سے زیادہ ہدایت یافتہ

أَهْدَىٰ سَبِيلًا (نساء-۵۱) بتاتے ہیں۔

اس سے پہلے کی آیتوں میں اللہ نے یہود کو دھمکی دی تھی کہ اگر وہ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات پر ایمان نہ لائے تو ان کو ویسی ہی سخت سزائیں دی جائیں گی جو روز سبت کی حرمت و تقدیس کو پامال کرنے والے یہود کو دی جا چکی ہے یعنی ان پر خدا کی لعنت ہوگی اور ان کے چہرے مسخ کر دیے جائیں گے، کیونکہ یہ لوگ شرک و کفر میں مبتلا ہو کر قرآن کی تعلیم ہی نہیں بلکہ دین کی اصل و اساس کو منہدم کر رہے ہیں، دوسرے گناہ اللہ چاہے گا تو معاف کر دے گا مگر شرک کے بارہ میں تصریح فرما دی ہے کہ اس کو کسی حال میں نہ بخشا جائے گا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ	بیشک اللہ اس کو معاف نہیں کرے گا کہ
وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ	اسکے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے اسکے
يَشَاءُ (نساء، ۴۸)	علاوہ (دوسری معصیتوں) کو جس کیلئے چاہیگا معاف کر دیگا[1]

پھر مسلمانوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ ذرا دیکھو تو سہی کہ ایک طرف تو یہ لوگ اپنی پاکبازی اور برتری کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، اپنے کو سب سے مقدس اور برگزیدہ گروہ خیال کرتے ہیں، اپنے حسب و نسب پر اتراتے ہیں، اپنے کو پیغمبروں کی اولاد اور اللہ کا چہیتا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین تو ہمارا ہی دین ہے، اور ہدایت یافتہ صرف ہم ہی لوگ ہیں، اس غرور اور گھمنڈ میں پڑ کر وہ ایمان و عمل کی ذمہ داریوں سے سبکدوش اور آخرت کی باز پرس سے غافل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ

---

[1] اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ شرک کے علاوہ تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ ضرور معاف کر دیگا اگر ایسا ہوتا تو صرف یغفر ما دون ذالک ہی کہا گیا ہوتا اور لمن یشاء کی قید نہ لگائی جاتی، اس قید کے بعد آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آدمی کو کسی بھی گناہ کے معاملہ میں ڈھیٹ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ہر گناہ کی معافی اور مغفرت کا معاملہ اللہ کی مرضی اور مشیت پر موقوف ہے۔

اول تو ہم پر عذاب ہوگا ہی نہیں اور کچھ ہوا بھی تو بس چند دنوں کے لیے، مگر دوسری طرف ان کی پستی کا یہ حال ہے کہ جبت و طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں، توحید اور دین حق کے علمبرداروں کے مقابلہ میں کفار و مشرکین کو بہتر اور ہدایت یافتہ سمجھتے ہیں۔

جبت سے وہ اعمال سفلیہ مراد ہیں جن کا تعلق ارواح خبیثہ اور شیطانی قوتوں سے ہوتا ہے، جیسے سحر و شعبدہ، ٹونا ٹوٹکا، رمل، جفر، شگون و فال گیری، نجوم، آگ پر چلنا، ہاتھ کی لکیروں کا علم اور وہ سب لغویتیں جو اوہام و خرافات اور مشرکانہ اعمال پر مبنی ہیں، اور ان کی کوئی دینی حقیقت اور شرعی اصل و اساس نہیں ہے، دوسرے لفظ طاغوت کا اطلاق ان چیزوں پر ہوتا ہے جو بندگی اور عبودیت کے حدود سے نکل جانے کا باعث اور موجب بنیں، اس طرح اللہ کے سوا جن چیزوں کو بھی معبود بنا لیا جائے اُن سب کو طاغوت کہا جائے گا، جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۶۰ میں جو پہلے نقل کیا جا چکا ہے، اس کا ذکر آیا ہے، لیکن یہاں یہ لفظ جبت (سفلیات اور شیطانی اعمال) کے ساتھ استعمال ہوا ہے اس لیے اس سے خاص طور پر شیطان مراد ہوگا،

یہود کے اعمال سفلی اور ٹونے ٹوٹکوں کا ذکر سورۂ بقرہ میں بھی ہوا ہے کہ وہ سحر و شیطانی کرتبوں کے اس طرح پیچھے لگ گئے ہیں کہ اللہ کی کتاب پس پشت ڈال دی ہے، اپنے ان اعمال کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے انھیں حضرت سلیمانؑ کی جانب منسوب کرتے تھے، اسی طرح تعویذ، گنڈے اور ان علوم کو بھی اپنا مشغلہ بنا رکھا تھا، جو فرشتوں پر اتارے گئے تھے،

ملاحظہ ہو :-

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ	اور وہ ان چیزوں میں پڑ گئے جو سلیمان کے
عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ	عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے تھے، اور
وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ	سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا، بلکہ شیاطین ہی

النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ
وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ
اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ

(بقرہ - ۱۰۲)

نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے،
اور وہ اس چیز میں بھی پڑ گئے جو بابل میں دو
فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتاری گئی تھی،
حالانکہ یہ دونوں کسی کو اپنا علم اس وقت تک
نہیں سکھاتے تھے جب تک اسے یہ نہ کہہ دیتے
کہ ہم آزمائش کیلئے ہیں سو تم کفر نہ اختیار کرنا۔

توراۃ میں صدہا تحریفیں ہو چکی ہیں مگر اس محرف حالت میں آج بھی اس کے اندر قرآن مجید کے بیان کی تائید ملتی ہے، ملاحظہ ہو سلاطین کی دوسری کتاب کا سترھواں باب:

"..... بلکہ انھوں نے ایسی شرارتیں کیں کہ جن سے خداوند کو غصہ ور کیا، کیونکہ انھوں نے بت پوجے باوجودیکہ خداوند نے انھیں کہا تھا کہ تم یہ کام نہ کیجیو ..... اور بطالتوں کو اختیار کیا اور بیہودہ ہوئے اور ان امتوں کے پیرو ہو گئے جو ان کے گرد و پیش تھیں، جنھیں دکھا کے خداوند نے انھیں حکم کیا تھا کہ تم ان کے سے کام مت کیجیو، اور انھوں نے خداوند اپنے خدا کے سب حکم ترک کئے، اور اپنے لیے ڈھالی ہوئی مورتیں یعنی دو بچھڑے بنائے اور یسرت تیار کی اور آسمانی ستاروں کی ساری فوج کی پرستش اور بعل کی عبادت کی اور انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گذارا اور فال گیری اور جادوگری کی اور اپنے تئیں بیچ ڈالا کہ خداوند کے حضور بدکاریاں کریں کہ اسے غصہ دلائیں، ان باتوں سے خداوند بنی اسرائیل پر نہایت غصے ہوا اور اپنی نظر سے انھیں گرا کے دور کر دیا....."

سورۂ نساء میں یہود کے کفر و شرک کا ایک ثبوت یہ بھی بیان ہوا ہے کہ توحید و حق پرستی کی دعوت کے مقابلہ میں وہ کفار قریش اور مشرکین مکہ کا ساتھ دیتے تھے، اس کفر و شرک دوستی

کے بعد خدا سے محبت اور توحید سے انکا رشتہ اور تعلق کیسے باقی رہ سکتا تھا۔

خدا کی تنقیص اور اس کے بارہ میں تفریط: اس کو بھی یہود کے شرک ہی کا نتیجہ سمجھا جائیگا کہ وہ خدا کو پاک، منزہ اور برتر سمجھنے کے بجائے عیوب و نقائص کا مجموعہ سمجھنے لگے تھے۔ ان کا ایک گروہ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، نصاریٰ کی طرح افراط وغلو میں مبتلا ہو کر خدا کے بندوں اور رسولوں کو اس کا بیٹا اور الٰہ سمجھتا تھا، لیکن عام یہودیوں نے خدا کے بارہ میں تفریط سے کام لیا ہے اور اس کی اعلیٰ و ارفع ذات کو اس قدر فروتر کر دیا ہے کہ وہ نقائص وعیوب کا مجموعہ بن گیا ہے، علامہ ابن تیمیہؒ مسلمانوں کے اعتدال ومیانہ روی پر قائم رہنے اور یہود و نصاریٰ کے افراط و تفریط میں پڑ جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"مسلمانوں نے یہود کی طرح اللہ تعالیٰ کو عیوب و نقائص اور مخلوق کے اوصاف سے متصف نہیں کیا، وہ یہود کی طرح خدا کو فقر، بخل، عجز وکسل سے متصف نہیں سمجھتے اور نہ نصاریٰ کی طرح مخلوق کو خالق کا درجہ دیتے اور اس کے اوصاف سے متصف بتاتے ہیں۔" (الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ج ۱ ص ۸)

دوسری جگہ مزید وضاحت سے لکھتے ہیں:۔

"یہود اللہ کی صفات کے بارہ میں تفریط میں مبتلا ہو گئے تھے، چنانچہ اس کو مخلوق کے نقائص سے ملوث سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ محتاج ہے اور ہم لوگ غنی ہیں، اس کے ہاتھ بند ہیں اور وہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد تھک گیا اس لیے سنیچر کے دن اس نے آرام کیا۔" (ایضاً ج ۲ ص ۱۱)

قرآن مجید نے خدا کی شان میں ان کی ان ناروا گستاخیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا	اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنہوں نے
اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ	کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔

(آل عمران۔ ۱۸۱)

دوسری جگہ ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللهِ مَغْلُولَةٌ	اور یہود نے کہا کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں،
غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا	ہاتھ ان کے بندھ جائیں اور انکی اس بات کے
بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ يُنْفِقُ	سبب ان پر لعنت ہو بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ)
كَيْفَ يَشَاءُ	اسکے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ خرچ کرتا
(المائدہ - ۶۴)	ہے جیسے چاہتا ہے،

دونوں آیتوں میں یہود کے طنز وتمسخر کا ذکر ہے، جنگ وجہاد کے موقع پر جب مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی جاتی اور ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ ۲۴۵)	کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے

تو یہود ومنافقین تحقیر و تمسخر کے ساتھ یہ گستاخانہ باتیں کہتے تھے، ان کی ان نارو اباتوں پر سخت زجر وتوبیخ کی گئی ہے کہ فقر واحتیاج تو بندوں اور مخلوقات کے اوصاف ہیں، خدا کی شان ان سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔

تخلیق عالم کے باب میں بھی وہ اسی طرح کی نارو اباتیں کہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اللہ آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کے بعد تھک گیا اور ساتویں دن سنیچر کو اس نے آرام کیا، اسی لیے یہود اس دن چھٹی مناتے تھے، قرآن مجید نے ان کے اس خیال کی تردید کرکے بتایا کہ تکان اور سستی تو بندوں کو لاحق ہوتی ہے، خدا کی ذات ان نقائص وعیوب سے یکسر پاک ہے، اسی لیے عموماً وہ جب آسمان وزمین کی خلقت کا ذکر کرتا ہے تو یہود کے اس زعم باطل کی تردید بھی کرتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ	بیشک ہم نے آسمانوں اور زمین
الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ	اور ان کے درمیان کی چیزوں
سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا	کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہم
مِنْ لُّغُوْبٍ (ق - ۳۸)	کو کوئی تعب لاحق نہیں ہوا۔

قرآن مجید نے خدا کی شان میں یہود کی ان ہی کوتاہیوں اور گستاخیوں کی بنا پر ان کے متعلق کہا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ	اور انھوں نے اللہ کی جیسی قدر
(انعام - ۹۱)	کرنی چاہئے تھی نہیں کی۔

(باقی)

مقالات سلیمان (مذہبی)

جلد سوم

یہ سید صاحب علیہ الرحمہ کے زیادہ تر قرآنی مقالات پر مشتمل ہے، ان میں قرآن پاک کے احکام کے حکم و مصالح کی توضیح و تشریح ہے، غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب ہے، اور سید صاحب کے دور کے خود ساختہ مجتہدین کے مجتہدات کی تصحیح ہے، اسی کے ساتھ بعض جدید نظریات اور قرآن مجید کے بیانات میں تطبیق کی کوشش کی گئی ہے، ان کے علاوہ کچھ غیر قرآنی مقالات بھی ہیں، مثلاً پیغام امن یعنی محبت الٰہی اور مذہب اسلام، قرآن اور فلسفہ جدیدہ، ایام صیام پر نظر ثانی وغیرہ۔ یہ تمام مضامین اگرچہ سید صاحب کے ابتدائی دور کے ہیں، تاہم قرآن و تفسیر قرآن کے اساتذہ و طلبہ کے مطالعہ کے لائق بہت ہی محققانہ اور پُر از معلومات ہیں۔ قیمت :- ۰۰ـــ ۱۲

منیجر

صبح الاعشیٰ

از محمد نعیم صدیقی ندوی ایم۔ اے (علیگ)

(۳)

فن کتابت کے کلی امور سے سکریٹری کی واقفیت

کاتب (سکریٹری) کو فن خطاطی اور تحریر و کتابت کے نوک پلک دقائق و اصول اور اس کے جملہ امور و کیفیات سے پوری طرح واقف ہونا بہت ضروری ہے، قلقشندی نے اس موضوع کے ساتھ خصوصی اعتنا کرتے ہوئے صبح الاعشیٰ کے تقریباً تین سو صفحات میں اس پر بہت وضاحت کیساتھ روشنی ڈالی ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں طباعت و پریس کی جدید سہولتیں میسر نہیں ہوئی تھیں، اور کتب و رسائل وغیرہ کے سلسلہ میں کمال خطاطی ہی پر تمام تر دار و مدار تھا، اس لیے کاتب انشاء کے لیے اس فن کے تمام ضوابط و قواعد، اس میں استعمال ہونے والی چیزوں اور خط کی تمام شکلوں اور ہیئتوں کی کامل معرفت لازمی خیال کیجاتی تھی، چنانچہ قلقشندی نے اس سلسلہ میں عربی خط کی تاریخ، حسن تحریر، اشکال حروف، قلم رکھنے کی ہیئت، دفتر انشاء میں استعمال کیے جانے والے قلم، دوات و روشنائی، کاغذ کے اقسام اور حروف مفردہ و مرکبہ وغیرہ کو بکثرت اقوال و امثال اور کتب لغت و مصطلحات سے واضح کیا اور ساتھ ہی تمام حروف اور اقسام خط کی شکلیں بھی درج کی ہیں، ممکن ہے کہ عصر جدید میں جبکہ مطابع کی کثرت سے فن خطاطی کی باریکیوں اور حسن کتابت

کی اہمیت اور اس سے دلچسپی بہت کم ہوگئی ہے، مؤلف کی اس کاوش کو سعی نامحمود قرار دیا جائے لیکن آٹھویں صدی ہجری میں سرکاری دفاتر انشا کے تمام چھوٹے بڑے کام تحریری ہی طور پر انجام پاتے تھے، اس لیے کوئی کاتب اس فن کے دقائق کی معرفت و مہارت کے بغیر اپنے فرائض سے حسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔

قلقشندی لکھتا ہے کہ اگر کاتب خوش نویس اور پاکیزہ خط کا حامل ہے تو اس سے عوام و خواص کی نگاہوں میں اس کے مرتبہ اور شان کی بلندی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، تحریر کو جسم میں روح کی حیثیت حاصل ہے، اگر کوئی شخص وجیہ، شاندار، خوبرو اور خوش ہیئت ہے تو وہ لازمی طور پر لوگوں کی نگاہوں کا مرجع بن جاتا ہے، اسکی گفتگو توجہ سے سنی جاتی ہے۔ اور اس کے برعکس صفات کے حامل شخص سے نہ صرف کامل بے اعتنائی برتی جاتی ہے بلکہ لوگ اس کی باتوں سے اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں، بعینہ یہی معاملہ شان خط کا بھی ہے، اگر وہ دیدہ زیب، واضح، روشن، پاکیزہ اور نفیس ہوتا ہے تو روح انسانی فرحت و انبساط سے معمور جاتی ہے اور انسان ایسی تحریر کو خواہ مخواہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، چاہے معنوی حیثیت سے وہ تحریر کتنے ہی معمولی موضوع سے متعلق ہو اور اگر خط نہایت گنجلک، کٹا پٹا اور ٹیڑھا ترچھا ہو تو قاری بیک نظر اس سے نفرت و دحشت محسوس کرتا ہے، ایسی تحریر میں خواہ بصیرت و عبرت کے موتی ہی کیوں نہ رولے گئے ہوں اس کو پڑھنا کوئی گوارا نہیں کرتا، اس لیے ایک باکمال کاتب انشا (سکریٹری) کو خوش خطی اور پاکیزہ نویسی کو اپنے پیشہ کی کامیابی کا ایک اہم ستون اور بنیادی کنجی خیال کرنا چاہئے۔ (۳/۲۵)

فن خطاطی پر بحث کے سلسلہ میں قلقشندی نے محمد بن عمر المدائنی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

کوئی تحریر لکھتے وقت درمیان میں اگر کسی بات پر غور کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو قلم کو کان کے اوپر رکھ لینا چاہیے، پھر اس کی تائید میں مؤلف نے صحیح سندوں کے ساتھ حضرت انس بن مالکؓ، زید بن ثابتؓ اور حضرت عائشہؓ کی متعدد روایات بھی نقل کی ہیں، چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق ایک بار امیر معاویہؓ بارگاہ نبویؐ میں حاضر تھے، آپؐ ان کو کوئی خط املا کرا رہے تھے، درمیان میں حضرت معاویہؓ نے حضورؐ کو کچھ سوچتے دیکھا تو قلم کے سرے کو منہ سے لگا لیا، آپ کی نگاہ پڑی تو ارشاد فرمایا:-

یا معاویہ اذا کنت کاتبا	اے معاویہ جب تم کچھ لکھ رہے ہو تو قلم کو اپنے
فضع القلم علی اذنک فانہ	کان پر رکھ لو۔ بلا شبہہ اس سے لکھنے والے
اذکر لک وللمملی	اور املا کرانے والے دونوں کی یادداشت
	میں اضافہ ہوتا ہے،

ایک دوسری روایت میں ہے کہ اسی طرح کے ایک دوسرے موقع پر آپؐ نے امیر معاویہ سے فرمایا

یا معاویۃ اذا کتبت کتابا فضع	اے ابو معاویہ جب تم کوئی تحریر لکھ رہے ہو
القلم علی أذنک (۴۳/۳)	تو قلم کو اپنے کان پر رکھ لو۔

کاتب کی جغرافیائی اور تاریخی معلومات قلقشندی نے کاتب (سکریٹری) کی جغرافیائی اور تاریخی معلومات کے سلسلہ میں جو طویل بحث کی ہے وہ صبح الاعشیٰ کی تیسری جلد سے شروع ہو کر پانچویں جلد کے کچھ حصے تک پھیلی ہوئی ہے اور بارہ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، یہاں مؤلف ایک ماہر جغرافیہ داں اور باکمال مورخ کی حیثیت سے سامنے آتا ہے، اس نے کرۂ ارض کی جملہ تفصیلات، تمام سمندروں کے طول، عرض اور عمق کے بیان اور مختلف اقالیم کی ہیئتی پیمائشوں سے اس باب کا آغاز کیا ہے، پھر قدیم

کتب تواریخ کے معروف نہج پر خلفائے راشدین سے لیکر مصر کے ناطمی حکمرانوں تک عہد بعہد نظام حکومت کی تاریخ، فتح اسلامی سے لیکر مؤلف کے زمانے تک کے مصر کے تاریخی حالات اور اسکے بعد حجاز، شام، ایران، بحرین، یمامہ، ہند و سند، سوڈان، تونس، مراکش اور روم وغیرہ تمام ممالک اقطار کے بارے میں بیش قیمت جغرافیائی، تاریخی، تمدنی اور سیاسی معلومات کا انبار لگا دیا ہے۔

دنیا کے کسی بھی شہر کے باشندے کو اگر اپنے ہاں سے دوسرے شہر کی سمت معلوم کرنا ہو تو قلقشندی نے ماہرین ہیئت کے حوالے سے اس کے دو۲ طریقے تحریر کیے ہیں۔

۱۔ اپنے مقام سکونت سے جس شہر کی سمت آپ معلوم کرنا چاہتے ہوں تو سب سے پہلے ان دونوں شہروں کے طول البلد اور عرض البلد کو معلوم کیجئے، پھر اس طول و عرض کا مقابلہ کیجئے، اگر دوسرا شہر آپ کے شہر سے طول میں برابر ہے مگر عرض میں زیادہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے شہر سے جنوب میں واقع ہے، اور اگر اس کے برعکس صورت ہے تو پھر وہ آپ کے ہاں سے مشرقی سمت میں ہوگا، اسی طرح اگر وہ طول و عرض دونوں میں آپ کے شہر سے بڑا ہے تو پھر وہ شمال مشرق کے درمیان واقع ہوگا، ہٰذا (۳/۲۵۰)

۲۔ علمائے ہیئت و مساحت نے دوسرے مقامات کی سمت معلوم کرنے کا اس سے آسان طریقہ یہ تحریر کیا ہے کہ اگر وہ شہر جس کی سمت معلوم کرنا ہے، آپکے شہر سے عرض میں برابر ہونے کے ساتھ طول میں زیادہ ہے تو وہ آپکے شمال مشرق میں واقع ہوگا۔ اور اگر طول میں کم ہے تو اس کی سمت شمال مغرب ہوگی، اسی طرح اگر طول و عرض دونوں میں کم ہے تو وہ جنوب و مغرب کے درمیان واقع مانا جائیگا، اور اگر وہ شہر آپکے شہر سے طول میں تو کم مگر عرض میں زیادہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسکا محل وقوع آپکے ہاں سے مشرق و مغرب کے درمیان ہے۔ (۳/۲۵۱)

خلافت اسلامیہ کے تمدنی انقلابات | مؤلف صبح الاعشیٰ نے بہت تفصیل سے اس تاریخی حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ خلافت اسلامیہ کا آغاز خیر القرون سے ہوا، جب حکومت پھولوں کا گلدستہ نہیں بلکہ کانٹوں کی سیج خیال کیجاتی تھی، اور حکمرانِ وقت خود کو عوام کا خادم اور مونس تصور کرتا تھا، اس کی زندگی سادگی اور عسرت سے پُر ہوتی تھی، لیکن بایں ہمہ دنیا کی بڑی سے بڑی باجبروت طاقتیں اس سے لرزتی تھیں اور عظیم فتوحات کا ایک سیلاب سا امڈا پڑتا تھا، مگر پھر جب بنو مروان نے بساطِ حکومت بچھائی تو بتدریج خلافت میں ملوکیت کا رنگ و آہنگ پیدا ہونا شروع ہوگیا اور نظام حکومت صحیح اسلامی خطوط سے ہٹنے لگا، ظاہری شان و شوکت، خدم و حشم کی کثرت، عمدہ لباس و غذا کی وجہ سے اموی حکمران عیش و طرب کے دلدادہ بن گئے،

دولت عباسیہ کے زمانے میں شوکت، بہجت اور تعیش پسندی کی اس لہر میں مزید اضافہ ہوگیا تھا (الا ماشاء اللہ) یہاں تک کہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب ۳۰۵ھ میں مقتدر باللہ کے عہد خلافت میں شاہ روم کے قاصد بغداد آئے تو ان پر ہیبت قائم کرنے کیلئے دار الخلافہ میں جو لشکر ترتیب دیا گیا تھا، اس کے سوار اور پیدل کی تعداد تقریباً ۲ لاکھ تھی، خلیفہ کے حضور چھ سو حاجیوں اور چھ سو خاص خادموں کا ہجوم تھا، مزید برآں اس موقع پر مختلف اقسام کے خوفناک اسلحہ اور پُر ہیبت جنگی ساز و سامان کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا، دار الخلافہ کی دیواروں کو ۳۸ ہزار منقش پردوں سے سجایا گیا اور زمین پر بیس ہزار قیمتی قالین اور فرش بچھائے گئے تھے، تمام درختوں کی شاخوں اور پتیوں کو سونے چاندی سے زرق برق بنا دیا گیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ یہ وہ وقت تھا جب دولت عباسیہ کا چراغِ حیات ٹمٹما رہا تھا، اور اس کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں، قلقشندی نہایت دکھ اور قلبی

افسوس کے ساتھ ان تمام تاریخی حقائق اور تمدنی انقلابات کا ذکر اور ماتم کرتا ہے، وہ خلافت اسلامیہ کے زوال و انحطاط کا واحد سبب اسلامی دستور حیات اور ضابطۂ جہانبانی سے انحراف کو قرار دیتا ہے، اس کا خیال ہے کہ اگر نظام حکومت میں خیرالقرون کی روح پوری رہتیں برابر چلتی رہتیں تو شاید اسلام کے پیروؤں کے اقتدار کا پرچم کچھ اور عرصہ تک لہراتا رہتا۔ (۳/۲۴۲)

مصر آٹھویں صدی تک

قلقشندی سے پہلے مختلف ملکوں پر مستقل کتابیں لکھنے کا عام رواج تھا، چنانچہ مورخین نے شام، فارس، عراق اور مصر وغیرہ کی تاریخ پر مبسوط تحریری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ مصر کی تاریخ میں دولت فاطمیہ، ایوبیہ اور سلاطین ممالیک کے عہد کو مختلف حیثیتوں سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اسی باعث آٹھویں صدی میں تالیف کی گئی ادبی اور تاریخی کتابوں مثلاً خطط مقریزی، حسن المحاضرۃ، احسن التقاسیم اور اخبار قاہرہ وغیرہ میں مصر کا تفصیلی یا اجمالی ذکر ضرور ملتا ہے، بلکہ بعض مورخین نے تو اس موضوع پر مستقل ضخیم کتابیں ہی تالیف کر دی ہیں۔

قلقشندی نے بھی اپنی حب الوطنی کے ثبوت میں اور اس عہد کی عام روش کے مطابق مصر کی تاریخ کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا ہے، اس نے ایسی قرآنی آیتیں اور حدیثیں کثرت سے نقل کی ہیں، جن میں مصر کا صراحۃً یا اشارۃً ذکر ملتا ہے،

مصر کے چند اہم عجائبات

اس کے بعد مؤلف صبح الاعشیٰ نے مصر کی مشہور اور خاص خاص اشیاء، عجائبات اور آثار قدیمہ کو بہت تفصیل سے نمایاں کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ مصر کی اہم ترین قابل ذکر چیز زمرد کا معدن ہے، یہ شہر قوص سے آٹھ دن کی مسافت پر ایک پہاڑ میں غار کے اندر واقع ہے، یہ کان اپنی نوعیت کے اعتبار سے ساری دنیا میں بے نظیر خیال کی جاتی ہے، دولت ناصریہ میں شاہ محمد بن قلاوون کے زمانہ تک برابر اس سے زمرد

برآمد کیے جاتے رہے، اور بقول صاحب مسالک الابصار پورے روئے ارض کے امراء وسلاطین یہاں سے اس گرانبہا پتھر کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے،

مصر کی اس سے بھی اہم چیز بلسان[1] کا پودہ ہے، اس کی کاشت مضافاتِ قاہرہ میں عین شمس کے قریب ایک مخصوص خطۂ زمین میں کی جاتی ہے، اور ایک ایسے مخصوص کنویں سے اس کی آبیاری ہوتی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اس کے پانی سے غسل کیا تھا، نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ عالم شیرخوارگی میں حضرت مسیحؑ نے اپنی ایڑی سے اس کنویں کو کھودا تھا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ بلسان نہ تو اس خاص زمین کے علاوہ پوری دنیا میں کہیں اور مل سکتا ہے اور نہ اس مخصوص کنویں کے پانی کے بغیر اسکی نشو ونما ہو سکتی ہے، ابن اثیر نے عجائب المخلوقات میں لکھا ہے کہ جس خاص زمین میں بلسان کی کاشت ہوتی ہے اس کا طول وعرض ایک ایک میل ہے۔ اس درخت سے ایک خاص قسم کا تیل نکلتا ہے جس کو صاف کر کے آگ پر پکایا جاتا اور پھر دواؤں میں استعمال کرنے کے لیے اسپتالوں میں بھیجا جاتا ہے، بقول صاحب مسالک الابصار تمام نصاریٰ اس تیل کو سونے اور جواہر سے بھی قیمتی خیال کرتے ہیں، کیونکہ جیسا مذکور ہوا ان کے عقیدے کے مطابق جس مخصوص کنویں سے بلسان کی آبیاری ہوتی تھی، اس کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف کیجاتی تھی، نیز اس وقت تک کوئی شخص مکمل نصرانی نہیں ہو سکتا تھا، جب تک روغن بلسان کو اپنے غسل کے پانی میں تھوڑا سا ڈال نہ لے۔ (۳/۲۷۸)

دریائے نیل | نیل کا وصف بیان کرنے میں قلقشندی کے قلم نے بڑی جولانی دکھائی ہے،

---

[1] بلسان ایک درخت ہوتا ہے جس کے پھول چھوٹے سفید رنگ کے اور پتے تتلی کے مانند ہوتے ہیں اس سے خوشبودار تیل نکلتا ہے، جو مختلف امراض میں دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اس دریا کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس کا طول و عرض کتنا ہے، یہ کہاں کہاں سے گھومتا اور کن کن علاقوں سے گذرتا ہے، قبل اسلام اور عہد اسلام میں کن کن حکمرانوں نے اس کی تعمیر و توسیع میں حصہ لیا، کس زمانے میں اور کن اسباب سے اس میں طغیانی آتی اور کب اور کیوں اسکا پانی کم ہو جاتا ہے؟ ان تمام پہلوؤں کو مؤلف صبح الاعشیٰ نے ماہر جغرافیہ دانوں اور باکمال مورخوں مثلاً یاقوت رومی، ابن سید بطلیموس اور صاحب رسم المعمور وغیرہ کے مستند حوالوں سے تفصیل کے ساتھ روشن کیا ہے۔

اہل مصر کی خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ دریائے نیل کا گہرا تعلق ہے، اس لیے اس کی خشکی اور طغیانی ان کے نزدیک بہت اہمیت رکھتی تھی، طلوع اسلام کے قبل مصر میں قبطیوں میں یہ رواج تھا کہ جب دریائے نیل کا پانی کم ہو جاتا تھا تو وہ ایک کنواری لڑکی کو اس کی بھینٹ چڑھاتے تھے، جس کی وجہ سے ان کے عقیدہ کے مطابق دریا میں طغیانی آتی تھی، جب مصر پر فتح اسلامی کا پرچم لہرایا تو وہاں کے باشندے گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ دریائے نیل ہر سال ایک انسانی جان کی قربانی طلب کرتا ہے، ہم لوگ ایک کنواری لڑکی کو اس کے والدین کی رضا مندی سے خوب بناؤ سنگار کے ساتھ دلہن بنا کر نیل کی بھینٹ چڑھاتے ہیں، اس وجہ سے اس کی روانی برابر جاری رہتی ہے، حضرت ابن العاص نے اس رسم کو یکسر ممنوع قرار دیتے ہوئے فرمایا:۔

هذا مما لا يكون في الاسلام — اس کی اسلام میں کوئی حقیقت نہیں ہے

پھر حضرت عمر فاروق کو اس صورت حال کی پوری تفصیل لکھ بھیجی، انھوں نے عمرو ابن العاص کے موقف کی تصویب کرتے ہوئے دریائے نیل کے نام ایک رقعہ لکھکر

ارسال فرمایا جس میں تحریر تھا،

من عبد الله عمر امیر المؤمنین	خدا کے بندے امیر المومنین کی طرف سے
الی نیل مصر۔ اما بعد۔ فان	یہ خط نیل کے نام ہے۔ اما بعد۔ اگر تو
کنت تجری من قبلک فلا تجر	از خود رواں دواں تھا تو اپنی روانی
وان کان الله الواحد القهار	کو بند کر دے۔ اور اگر اللہ واحد قہار
هو الذی یجریک فنسأل الله	ہی تجھکو جاری کیے تھا تو ہم اللہ سے دعا
ان یجریک	کرتے ہیں کہ وہ تجھکو رواں دواں رکھے۔

اس رقعہ کو حضرت عمرو بن العاص نے نیل میں ڈالدیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اسی دن زبردست طغیانی آئی اور دریا میں سولہ ہاتھ پانی چڑھ گیا، قلقشندی نے لکھا ہے کہ ہمارے زمانے میں ۸۰۰ھ میں بھی دریائے نیل میں ایسا ہی زبردست سیلاب آیا تھا،

زراعت، پھول اور میوے | مصر بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک ہے، یہاں مختلف اجناس کے غلے اور سبزیاں بہت کثرت سے پیدا ہوتی ہیں، غلہ میں جَو، گیہوں، مکئی، مسور، ماش، چنا اور سبزیوں میں اروی، بیگن، گوبھی، شلجم، مولی، لوبیا، ککڑی، ملوخیا[1] اور لہسن و پیاز کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ خربوزہ اور گنے کی پیداوار بھی یہاں بہت زیادہ ہے، اسی طرح مصر کے چمن زاروں میں نرگس، بنفشہ، گلاب، چنبیلی، نسرین اور نیلوفر وغیرہ جیسے گلہائے رنگارنگ، مشام جاں کو معطر کرتے ہیں، مختلف اقسام کے میووں اور پھلوں کی پیداوار کے لیے بھی مصر تمام دنیا میں شہرت رکھتا ہے، چنانچہ یہاں انگور، سیب، امرود، کیلا، نارنگی، شہتوت، بیر، انار، انجیر، کشمش اور شفتالو اتنی کثرت سے

---

[1] ایک خاص قسم کی ترکاری کا نام ہے۔

پیدا ہوتا ہے کہ ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد بڑی مقدار میں بیرونی ملکوں کو بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ (۳/۳۱۲)

شہر اسکندریہ | یہ شہر یونان کے مشہور بادشاہ سکندر اعظم نے تعمیر کیا تھا، اس لیے اسی کے نام سے موسوم ہے، قبل اسلام کسی زمانے میں یہ مصر کا دار الخلافہ بھی رہا ہے، یہاں کے عجائبات میں سب سے مشہور وہ عظیم ترین مینار تھا جو پتھر اور سیسہ کی آمیزش سے تعمیر کیا گیا تھا، اس کی بلندی چار سو ذراع[1] تھی، اس منارہ کی چوٹی پر ایک خاص قسم کا آئینہ نصب تھا جس میں اس طرف بہت دور سے آنے والے کا عکس نظر آتا تھا، یہ منارہ اسکندریہ کی طرف آنیوالی تمام سواریوں کی رہنمائی کے لیے نشان منزل کا کام بھی انجام دیتا تھا، اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں نصاریٰ نے اس کو توڑ ڈالا اور پھر بتدریج منہدم ہوتے ہوتے آٹھویں صدی ہجری کے وسط (عہد قلقشندی) تک صرف اس کے آثار ہی باقی رہ گئے تھے، (۳/۳۲۲)

اہرام مصر | مصر کے قدیم حکمرانوں کو فن تعمیر کا خاص ذوق اور شغف تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے عہد عروج و اقتدار میں ایسے نادر و شاہکار تعمیری کارنامے انجام دیے جو مرور زمانہ کے باوجود اب تک اپنے بانیوں کی عظمت و انفرادیت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں، ان تعمیرات میں سب سے اہم اہرام ہیں۔ یہ دراصل مصری حکمرانوں کے مقبرے ہیں، ان کثیر التعداد اہراموں میں سب سے عظیم الشان فسطاط کے مقابل کے دو اہرام ہیں، ہر ایک کا طول ۳۱۷ ذراع ہے، ابوالصلت کا قول ہے کہ تمام روئے ارض پر ایسی کسی عمارت کی نظیر نہیں ملتی جس میں پتھروں کا استعمال اتنی کثرت سے کیا گیا ہو

---

[1] ہر ذراع تین بالشت کا ہوتا تھا۔

جشنانہ کورمۂ بالا دونوں اہراموں میں، فرقہ صابئہ کے لوگ شدّ رحال کرکے انکی زیارت وعبادت کے لیے آتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں سے ایک حضرت ادریسؑ کی قبر ہے اور دوسرے میں ان کے فرزند صابیٔ مدفون ہیں، جن کی طرف یہ فرقہ منسوب ہے،

ان اہراموں کا بانی کون ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں قلقشندی نے سب کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

وبالجملة فهما من اعظم الآثار واقدمها واجل المباني وادومها۔	خلاصہ یہ کہ یہ دونوں اہرام قدیم ترین اور عظیم ترین آثار اور نہایت جلیل الشان اور ہمیشہ باقی رہنے والی عمارتوں میں ہیں،

مشہور عباسی خلیفہ مامون الرشید نے ۲۱۶ھ میں ان دونوں اہراموں کو منہدم کرنے کی بہت کوشش کی مگر ممکن نہ ہوسکا۔ (۳/۳۲۵)

قاہرہ | ایام دولت فاطمیہ میں جب مصر کی زمام حکومت المعز لدین اللہ کے قائد جوہر الصقلی کے ہاتھوں میں آئی تو اس نے جمادی الاولیٰ ۳۵۸ھ میں مصر کے مشہور شہر اور موجودہ دار الحکومت قاهرة کی بنا ڈالی۔ قلقشندی اس کی توصیف میں رقم طراز ہے کہ

هي المدينة العظمى ليس لها نظير في الآفاق ولا سميع بمثلها في مصر من الامصار (۳/۳۴۸)	یہ ایک ایسا عظیم ترین شہر ہے کہ پوری دنیا میں اسکی نظیر مفقود ہے اور نہ اس جیسا کوئی شہر سنا ہی گیا ہے۔

المقریزی اپنے "خطط" میں قاہرہ کی بنا وتاسیس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ جوہر نے قاہرہ کی تعمیر کے بعد المعز لدین اللہ کو قاہرہ کو دار الخلافہ قرار دینے کی ترغیب دی،

لیکن اس وقت اس نے یہ تجویز قبول نہ کی، جوہر الصقلی وہاں المعز کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا، اور خطبا، عمال اور قضاۃ وغیرہ مقرر کر دیے، ہفتہ میں ایک دن وہ خود بھی دادرسی کے لیے بیٹھتا تھا، پھر اس نے فتوحات کا دائرہ وسیع کیا، اور ۳۶۱ھ میں اس نے مصر کے علاوہ شام اور حجاز وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا، اس کے بعد جوہر نے اپنی سابقہ تجویز پھر پیش کی، بالآخر اس کے شدید اصرار کے بعد المعز ترک وطن کر کے قاہرہ آ کر آباد ہو گیا، اس طرح جوہر کی تحریک سے اس کا نو تعمیر شدہ شہر صدیوں کے لیے دارالخلافہ بن گیا،

<u>جوامع و مساجد</u> | قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں قاہرہ اور فسطاط کی بکثرت مساجد کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چند اہم اور مشہور مسجدیں جو اسلامی فن تعمیر کا نادر نمونہ شمار ہوتی ہیں یہ ہیں:

۱۔ **جامع طولون**: اس کو احمد بن طولون نے ۲۵۹ھ میں مصر کے مشہور پہاڑ جبل یشکر پر تعمیر کیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر پر ایک لاکھ بیس ہزار دینار صرف ہوئے، جب ابن طولون اس کی تعمیر سے فارغ ہوا تو ایک شب اس نے عالم رویا میں دیکھا کہ آسمان سے آگ نازل ہوئی اور اس نے جامع طولون کو خاکستر کر دیا، اور لطف کی بات یہ کہ مسجد کے گرد و پیش کو اس آگ سے کوئی نقصان نہیں پہنچا، ابن طولون نے ایک ماہر رویا سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی تو اس نے اس کو بارگاہ ایزدی میں قبولیت مسجد کی خوشخبری دی اور کہا کہ گذشتہ اقوام جب تقرب معبود کے لیے اپنی کسی عزیز ترین چیز کی قربانی کرتے تھے تو اس کی مقبولیت کی علامت یہی تھی کہ آسمان سے آگ آ کر اس کو خاکستر کر دیتی تھی،

۲۔ **جامع الازہر**: یہ مصر کی قدیم ترین اور قاہرہ کی سب سے پہلی جامع ہے، جب معز لدین اللہ نے قاہرہ کو دارالخلافہ قرار دے کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تو قائد جوہر الصقلی نے

جامع ازہر کی بنا رکھی، ۷ رمضان ۳۶۱ھ کو اس کی تعمیر مکمل ہوئی، المعز کے بعد ہر خلیفہ نے اس پر اپنی خاص نظر کرم رکھی، اور برابر اس میں اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ خلیفہ عزیز نے جامع ازہر کے اردگرد فقہار کی سکونت کے لیے دار الجماعت تعمیر کرایا، جس میں وہ نماز ظہر کے بعد جمع ہوتے اور عصر تک علمی مذاکرات کیا کرتے تھے، بلاشبہ جامع ازہر فاطمیوں کا ایک عظیم اور لازوال کارنامہ ہے، یہ آج تک قائم ہے اور غالباً ہمیشہ دنیا تک قائم رہے گا، قلقشندی نے ابن عبد الظاہر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں نے کچھ لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ جامع ازہر میں کچھ ایسے سحر کا اثر ہے جس کے باعث اس میں چڑیاں اور پرندے بسیرا نہیں کرپاتے۔" (۳/۳۶۴)

۳۔ **جامع حاکم**: اس کی بنیاد فاطمی خلیفہ عزیز نے ۱۰ رمضان المبارک ۳۷۹ھ کو رکھی تھی، اس کی وفات کے بعد الحاکم بامر اللہ نے ۴۰۳ھ میں اس کی تکمیل کرائی اور اس کے لیے چٹائیاں، قندیلیں، فرش اور پردے مہیا کئے، اس کے علاوہ چاندی کے بڑے بڑے جھاڑ اس میں آویزاں کئے، ۴۰۵ھ میں دوسری مسجدوں کے ساتھ اس کیلئے بھی املاک وقف کی گئیں (۳/۳۶۵)

۴۔ **جامع صالح**: یہ مسجد الفائز باللہ اور العاضد لدین اللہ کے وزیر صالح طلائع بن رزیک نے قاہرہ کے جنوبی دروازے کے باہر تعمیر کی تھی، یہ مسجد ایک مستطیل قطعۂ زمین پر بنائی گئی ہے، اس کی مساحت تقریباً ۱۲۵ ذراع ہے، دولت فاطمیہ کی دوسری مساجد کی طرح اس میں بھی مینار بڑے باب الداخلہ کے اوپر بنایا گیا ہے، اس کے دونوں بازوؤں پر طلبہ کے رہائشی کمرے ہیں، محراب میں شیشہ کی پچہ کاری کی گئی ہے، اس کا منبر حیرت انگیز طور پر مختلف النوع گلکاری کے نباتی نمونوں سے بھرا ہوا ہے، عمارت کا بیرونی حصہ گھڑے ہوئے پتھر کا ہے، اسکے بالائی حصے کی تزئین کوفی کتبوں کی پٹیوں سے کی گئی ہے۔

مذکورۂ بالا قابل ذکر مساجد کے علاوہ قاہرہ اور مصر کے دوسرے شہروں میں جامع راشدہ

جامع مقیاس، جامع قرافہ، جامع الرصد، جامع الفیلہ اور جامع اقمر وغیرہ بکثرت مسجدیں تھیں جن میں عبادت وریاضت کے علاوہ تعلیم وتدریس بھی ہوا کرتی تھی۔ (۳۶۶/۳)

ٹکسال اور سکے | اس عہد میں پورے مصر میں سونے کا سکہ رائج تھا، جو اسکندریہ، قوص اور عسقلان وغیرہ کے دار الضرب (ٹکسال) میں ڈھالا جاتا تھا، اسکے ایک طرف سلطان یا خلیفۂ وقت کا نام اور دوسری جانب عموماً "محمد رسول اللہ" کندہ ہوتا تھا۔ اسی طرح مصر میں بعض یورپین ممالک اور روم سے درآمد کیے ہوئے دیناروں کا بھی چلن تھا، اس کے ایک طرف اس بادشاہ کی تصویر بنی ہوتی جس کے عہد میں وہ سکہ ڈھالا گیا ہے۔ اور دوسری طرف حضرت مسیحؑ کے حواریین پطرس اور پولس کی صورتیں منقوش رہتی تھیں۔ مصر میں سونے کا بھاؤ یکساں نہیں رہتا تھا، کبھی گراں ہو جاتا اور کبھی ارزاں۔ چنانچہ قلقشندی نے لکھا ہے کہ "ہم نے ۷۹۰ھ میں مصری دینار کی قیمت بیس درہم کے برابر دیکھی تھی لیکن آج ۸۱۳ھ میں وہ بیحد گراں ہو گیا ہے۔" (۳/۴۴۲)

اسی طرح دینار کے پہلو بہ پہلو نقرئی درہم بھی رائج تھے، جس میں ایک تہائی چاندی اور ایک ثلث تانبے کی آمیزش ہوتی تھی۔ اس کے بعد ۷۵۹ھ میں پیسوں کا چلن عام ہوا، چنانچہ ۴۸ پیسے ایک نقرئی درہم کے برابر ہوتے تھے۔ اس کے بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ سرخ تانبے کو پانی کی طرح پگھلا دیتے تھے، پھر اس کو لمبی لمبی چھڑوں کی شکل میں خشک کر کے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیے جاتے، اس کے بعد شاہی ٹکسال میں اس کو ڈھال دیتے تھے، اس کے ایک طرف سلطان کا نام کندہ ہوتا اور دوسری جانب دار الضرب کے شہر کا نام، تاریخ اور سنہ نقش ہوتا تھا لیکن ایک عرصہ کے بعد جب مصر میں تانبہ حد سے زیادہ گراں ہو گیا تو یہ سکہ ناپید ہو گیا۔ (۳/۴۶۸)

قصر شاہی کے توشہ خانے | دولت فاطمیہ اپنی شان وعظمت اور دولت وثروت کے اعتبار سے تمام دول اسلامیہ میں سب سے بڑی حکومت تھی، قصر شاہی میں بہت کثرت سے محکمے اور توشہ خانے قائم تھے، جن میں سے چند قابل ذکر درج ذیل ہیں۔

۱۔ **کتب خانہ**:۔ ہر زمانہ کے حکمراں قصر شاہی کے کتب خانوں سے بہت دلچسپی رکھتے تھے، اور ان میں دنیا بھر کے نادر قلمی نسخے کثیر تعداد میں یکجا کرنے کی کوشش کرتے تھے، ان کتبخانوں میں مختلف علوم وفنون کی ایک لاکھ سے زائد کتابیں موجود رہتی تھیں، علاوہ ازیں ڈرائنگ آرٹ اور مختلف خطوں میں لکھی ہوئی خوشنما اور دیدہ زیب وصلیاں ان کتب خانوں کی زینت بڑھاتی تھیں۔

۲۔ **خزانۃ الشراب**:۔ یہاں ہر قسم کے بہترین مشروبات، عمدہ مربے، نفیس معجون ہر وقت موجود رہتے تھے، دواؤں کا ذخیرہ بھی یہیں رہتا تھا، کثیر تعداد میں عطریات فاخرہ بھی یہاں تیار ملتے، گرانبہا ظروف کا بھی اعلیٰ ذخیرہ اس میں ہوتا تھا، جن کا حصول عالی مرتبت شاہان وقت کے علاوہ کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ (۳/۴۷۶)

۳۔ **خزانۃ السروج**:۔ یہ محل میں ایک بہت بڑا ہال تھا، جہاں سونے چاندی کے زین اور لگام بڑی کثیر تعداد میں موجود رہتے تھے، نیز اسپ سواری کے دوسرے قیمتی لوازمات بھی ہر وقت تیار ملتے، اس شعبہ کی دیکھ بھال کے لیے ایک مستقل عملہ مامور تھا (۳/۴۷۷)

۴۔ **خزانۃ السلاح**:۔ یہاں انواع واقسام کے بے نظیر ہتھیاروں کا ذخیرہ رہتا تھا، ان میں سونے اور چاندی مڑھے ہوئے خود بھی تھے، عربی تلواریں بھی، تیر، پیکان، ترکش، زرہ غرض جملہ آلات سلاح موجود رہتے تھے،

۵۔ **خزائن المال**:۔ یہاں خزانہ کے علاوہ بیش قیمت جواہر، اعلیٰ ملبوسات، اور

نفیس و بہترین پارچہ جات کے اتنے بڑے ذخائر رہتے تھے کہ قلم اس کے بیان سے قاصر ہے، اس کا کچھ اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ مستنصر باللہ کے زمانے میں مصر میں شدید ترین گرانی کا بازار گرم ہوا تو اس نے نظم مملکت کو قائم رکھنے کے لیے اپنے خزانۃ المال سے اسی ہزار بڑے بڑے بلوریں ٹکڑے، ستر ہزار دیباج کے ٹکڑے اور بیس ہزار زیورات نکال کر فوج اور عوام کی ضروریات پوری کیں (۳/۴۷۸)

خلیفہ کی خاص سواریاں خلیفہ کے دو طویلے خاص تھے، ایک گھوڑوں اور خچروں کا اصطبل، دوسرا اونٹوں کا۔ ان مویشیوں کی بہت بڑی تعداد ہر وقت موجود رہتی تھی، ان کا استعمال خلیفہ کی سواری یا ارباب مراتب یا خاندان دولت کے لیے خاص تھا، قلقشندی نے اسی سلسلۂ کلام میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "ایک بہت عجیب بات یہ بیان کی جاتی ہے کہ خلفائے فاطمیین میں سے کسی نے بھی سیاہ گھوڑے کی کبھی سواری نہیں کی تھی، یہاں تک کہ وہ ان کو اپنے اصطبل کے دوسرے مویشیوں کے ساتھ رکھنا تک پسند نہیں کرتے تھے۔ (۳/۴۷۸)

نظم مملکت قلقشندی نے دربار شاہی کے منصب داروں اور خاص مقربوں کے دو طبقے قائم کئے ہیں، ارباب السیوف اور ارباب الاقلام۔ پھر ان کے تحت متعدد مناصب اور ان کی ذمہ داریوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ہم سہولت کی خاطر ذیل میں چند اہم ترین منصب داروں اور ان کے فرائض کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، اسی سے پورے نظام حکومت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

۱۔ وزارت خلیفۂ وقت کے بعد یہ سلطنت کا اعلیٰ ترین منصب ہوتا تھا، گویا وزیر خلیفہ کا نائب شمار ہوتا، اور اس کو امور مملکت میں غیر معمولی وسیع اختیارات حاصل ہوتے تھے، قاضیوں کا تقرر، گورنروں کا انتخاب، فوجوں کی تیاری وغیرہ سارے کام اسی کو تفویض

ہوتے تھے، اسلام میں سب سے پہلے وزیر کا لقب ابو الفرج یعقوب بن کلس کو ملا تھا جس کو ۳۶۵ھ میں عزیز باللہ نے منصب وزارت پر فائز کیا تھا۔ دولت فاطمیہ میں وزارت کے منصب پر ارباب سیف اور ارباب قلم دونوں ہی فائز ہوتے تھے، لیکن المستنصر باللہ کے دور حکومت تک بیشتر وزراء طبقہ ثانیہ ہی کے ملتے ہیں، جن ارباب قلم وزیروں نے شہرت حاصل کی ان میں یعقوب بن کلس (عزیز باللہ کا وزیر) حسن بن عبد اللہ البازوری (مستنصر کا وزیر) ابو سعید التستری، ابن ابی کدینہ، علی بن فلاح اور ابو الطاہر احمد بن بابشاذ کے نام نمایاں اور ممتاز ہیں (۳/۴۸۹)

۲۔ **حامل المظلہ**:۔ یعنی چتر بردار، یہ دربار میں اور سواری کے موقع پر خلیفہ کے سر پر چتر لے کر کھڑا ہوتا تھا، اس منصب پر کوئی بہت بڑا آدمی فائز کیا جاتا تھا۔

۳۔ **حامل سیف الخلیفہ**:۔ یعنی شمشیر بردار، خلیفہ کی سواری جب نکلتی تو یہ اس کی تلوار لے کر ساتھ چلتا تھا، اس کا درجہ سپہ سالار کے بعد تھا۔ (۳/۴۸۳)

۴۔ **صاحب المجلس**:۔ خلیفہ کے دربار میں اشراف و اعیان کا استقبال کرنے اور ان کو بٹھانے کا کام اس کے ذمہ ہوتا تھا، جب خلیفہ تخت شاہی پر متمکن ہو جاتا تو یہی منصبدار وزراء اور امراء کو جا کر اسکی اطلاع دیتا تھا۔ اس کو امین الملک کہا جاتا تھا۔

۵۔ **صاحب الرسالہ**: یہ خلیفہ کے فرامین اور مراسلات وزراء وغیرہ کے پاس بدست خود لیجاتا تھا۔ دولت فاطمیہ کے آخری عہد میں اس منصب کا نام الامیر الثقہ پڑ گیا تھا۔

۶۔ **متولی زمام القصر**: یہ محل شاہی کے تمام امور کا نگراں ہوتا تھا، خدام قصر اسی کی ماتحتی میں تھے، وہی ان کے فرائض بھی تقسیم کرتا انکی کارگذاری پر کڑی نظر رکھتا تھا۔

۷۔ **متولی زمام الاقارب**: خلیفہ کے عزیزوں اور قرابتداروں کے احوال و معاملات اسی کے سپرد تھے، اور اس کا حکم ان معاملات میں حرف آخر مانا جاتا تھا۔ (۳/۴۸۵)

۸۔ قراءِ خاص :۔ ان قاریوں کی تعداد دس سے زیادہ تھی، یہ خلیفہ کی مجالس اور سواری کے مواقع پر قرآن کریم کی مناسبِ حال آیتیں تلاوت کیا کرتے تھے، یہ ان کا خاص کمال تھا جس سے خلیفہ اور حاضرین بہت محظوظ ہوتے تھے، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی خلیفہ نے ناراض ہوکر اپنے امیر کو مقید کر دیا تھا، قاری نے اس موقع کی مناسبت سے یہ آیت تلاوت کی خذ العفو وامر بالمعروف واعرض عن الجاہلین۔ خلیفہ نے اسے اتنا پسند کیا کہ فوراً اس معتوب امیر کو رہا کر دیا۔ (۴۸۹/۳)

۹۔ قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) : یہ مملکت کا سب سے جلیل القدر، رفیع المرتبت اور عظیم الشان منصب ہوتا تھا، احکام شرعیہ اور مسائل دینیہ پر اس کو کامل دسترس اور عبور کلی حاصل ہوتا تھا، اس کو یہ امتیاز خاص حاصل تھا کہ وہ ہمیشہ خلیفہ کے اصطبل شاہی کے ایک سفید خچر پر سواری کرتا تھا، پوری مملکت میں اس کے علاوہ کسی اور شخص کو سفید رنگ کے خچر پر سواری کرنے کی اجازت نہ تھی، خلیفہ ہر دوشنبہ اور جمعرات کو قاضی القضاۃ کی سلامی کیلئے جاتا تھا، جب وہ عدالت میں بیٹھ جاتا تو اس کے اردگرد اور دائیں بائیں حاضرین اپنے مراتب کے اعتبار سے بیٹھتے تھے، چیف جسٹس کے دروازے پر پانچ مسلح حاجب دربانی کرتے تھے، جب تک وہ عدالت میں موجود رہتا کسی کو کھڑے ہونے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔

۱۰۔ شعراء : شاعروں کی بڑی قدر و منزلت تھی، خلفاء، امراء اور وزراء سب انھیں مالا مال کرتے رہتے تھے، ان شعراء میں اہل سنت بھی تھے اور شیعہ بھی، اول الذکر مدح میں غلو سے کام نہیں لیتے تھے، اور آخر الذکر خوب غلو کرتے تھے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:

ھذا امیر المومنین بمجلس ابصرت فیہ الوحی والتنزیلا
واذا تمثل راکبا فی موکب عاینت تحت رکابہ جبریلا

ترجمہ:- یہ امیر المومنین ہیں جو اپنی مجلس میں تشریف فرما ہیں، جہاں میں وحی اترتے ہوئے دیکھ رہا ہوں، اور جب امیر المومنین سوار ہوتے ہیں تو میں انکی رکاب کے نیچے جبریل کو دیکھتا ہوں۔

بقول قلقشندی مدح میں اس اغراق وغلو کی حد تک پہنچا ہوا مبالغہ نہ کسی سنی کے لیے جائز ہے اور نہ کسی شیعہ کے لیے۔ یہ تو گمراہ شاعروں کا شعار ہے۔ (۳/۴۹۷)

۱۱۔ صاحب دیوان الانشا: آٹھویں صدی کے نظام حکومت میں ارباب قلم عہدہ داروں میں اہم ترین اور سب سے جلیل المرتبت دیوان انشا کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا جسکو صاحب دیوان الانشا، کے علاوہ "کاتب الدست الشریف" بھی کہتے تھے، دفتر انشار کی حقیقت، تاریخ اور کاتب کی خصوصیات وکمالات پر ہم گذشتہ صفحات میں بہت تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، دفتر انشار سے تمام اہم پروانے اور فرامین صادر ہوتے تھے، باہر کے مراسلات اور سفارتی خطوط سب سے پہلے سر بمہر حالت میں یہیں آتے تھے، پھر کاتب ان کو خلیفہ کے حضور میں پیش کرتا اور خلیفہ اس کو ان کے جوابات لکھنے کا حکم صادر کرتا تھا، ذکر آچکا ہے کہ اس منصب پر جو لوگ فائز ہوئے وہ فصاحت وبلاغت اور علمی فضائل وکمالات کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے، صاحب دیوان کے لیے کسی وقت بھی خلیفہ کے پاس باریاب ہونے کے لیے کوئی روک ٹوک یا وقت کی قید نہ تھی، یہاں تک کہ وہ کبھی کبھی شب گذاری بھی قصر شاہی میں ہی کرتا تھا، اس منصب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا حاجب بھی اہل علم وصاحب مرتبہ شخص ہوتا تھا، کاتب انشار کا دفتر بیش قیمت گدوں، مسند اور گاؤ تکیوں سے آراستہ ہوتا اور وہ اس پر نہایت کروفر کے ساتھ بیٹھتا تھا، (۳/۴۹۰)

۱۴۔ متولی دیوان الجیش: عصر جدید کی اصطلاح میں اس کو وزیر دفاع کہتے ہیں، یہ حکومت اور مسلح افواج کا بہت بڑا اور معزز عہدہ دار ہوتا تھا، اس کا مسلمان ہونا لازمی شرط تھا، وزارت دفاع کے دفتر میں سپاہیوں اور فوجیوں کے احوال، انکے مرض، صحت، زندگی، موت، حاضری وغیر حاضری اور کارگذاری سے متعلق مکمل خاکہ ہر وقت تیار ملتا تھا، اور وزیر دفاع کی خدمت میں ضروری کاغذات کارروائی کیلیے برابر پیش کیے جاتے رہتے تھے،

اس کے علاوہ وزارت جنگ ہی میں دیوان الرواتب (پے آفس) اور دیوان الاقطاع (محکمہ جاگیر) کے نام سے دو اور محکمے بھی قائم تھے، اول الذکر سرکاری ملازمین کے ماہانہ مشاہرہ کی تقسیم کا کام انجام دیتا تھا، یہاں مملکت کے ہر ملازم کا مکمل ریکارڈ موجود رہتا تھا، اس میں ایک سکریٹری اور اس کے معاونین کام کرتے تھے،

دیوان الاقطاع کو آج کی اصطلاح میں محکمۂ جاگیر کہا جا سکتا ہے، یہ محکمہ فوجیوں کو حسب ضرورت زمین اور جائداد عطا کیا کرتا تھا، عام طور پر یہ جاگیریں حق ملکیت کے بغیر عین حیاتی ہوتی تھیں، یہ زمینیں ان لوگوں سے حاصل کی جاتی تھیں جن کے پاس فاضل ہوتیں، یا کسی سبب سے بھی حکومت ضبط کر لی جاتی تھیں۔

(باقی)

استدراک

از پروفیسر سید حسن پٹنہ

اکتوبر کے معارف میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا مقالہ بعنوان "تحفۃ الحبیب" تالیف فخری بن امیری ہروی دیکھا، اس مقالے میں فخری کی مختصر طور پر معرفی کرنے کے علاوہ فاضل مقالہ نگار نے تحفۃ الحبیب کے ایک نادر نسخے کی اطلاع دی ہے جو مولوی محمد مبین نقوی مرحوم کی ملکیت میں تھا، اور جس کے متعلق اب یہ نہیں معلوم کہ کہاں اور کس حال میں ہے، اس ضمن میں فخری کی ایک دوسری تالیف "روضۃ السلاطین" کا بھی ذکر آگیا ہے، جس میں اُن سلاطین اور امراء کے حالات ہیں جنھوں نے شعر کہے ہیں، اس کتاب سے متعلق راقم السطور کو بھی بعض باتوں کی واقفیت ہے جنھیں اس مختصر یادداشت میں قلمبند کر رہا ہوں، شاید کسی تحقیق کرنے والے کے کام آئیں۔

جناب نذیر احمد صاحب نے بتایا ہے کہ "روضۃ السلاطین" کو جناب پیر حسام الدین راشدی کے عالمانہ و محققانہ مقدمے کے ساتھ سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے لیکن اس سے تقریباً دو سال قبل ستمبر ۱۹۶۶ء میں دانشگاہ تبریز کے استاد زبان فارسی آقای عبد الرسول خیا مپور نے فخری کی اس تالیف کو متن کی انتقادی تصحیح اور فاضلانہ مقدمہ و طویل و مفصل تعلیقات کے ساتھ شائع کر دیا تھا، آقای خیامپور نے فارسی شعرا کے تذکروں کو شائع کرنے کا ایک وسیع منصوبہ تیار کیا تھا،

چنانچہ انھوں نے صفوی اور قاچاری دور کے متعدد تذکرے مقدموں اور حواشی کے ساتھ شائع بھی کئے ہیں، جن میں روضۃ السلاطین بھی شامل ہے، انھوں نے صحف ابراہیم، کو بھی شائع کرنے کا قصد کیا تھا اور اس مقصد سے میرے ذریعے کتابخانہ خدابخش بانکی پور کے نسخے کا مائکروفلم منگوایا تھا،

آقای خیامپور کی ایڈٹ کردہ "روضۃ السلاطین" میں سات ابواب کے جو عنوانات دیئے گئے ہیں وہ اُن عنوانات سے قدرے مختلف ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے مقالے میں نقل ہوئے ہیں، گو مطالب میں فرق نہیں پڑتا، آقای خیامپور نے مقدمے میں یہ بھی بتایا ہے کہ تحفۃ الحبیب کا ایک خطی نسخہ بعنوان "جُنگ فخری غزلیات" مشہد کے نامور ادیب آقای محمود فرخ کے کتابخانے میں موجود ہے۔

مقالۂ مزبور میں فخری کی ایک اور تالیف "صنائع الحسن" کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جس کا ایک مخطوطہ کتابخانہ خدابخش میں بھی محفوظ ہے، جناب پیر حسام الدین راشدی نے اسے ایڈٹ کرتے وقت میرے ذریعہ اس نسخے کا مائکروفلم منگوایا تھا، لیکن میں نے ان کی ایڈٹ کردہ کتاب ہنوز نہیں دیکھی ہے۔

بزمِ مملوکیہ

ہندوستان کے غلام سلاطین، ان کے امراء اور شہزادوں کی علم نوازی اور اس دور کے علماء و فضلاء و شعراء مثلاً بہاء الدین اوشی، مولانا شہاب سراج شمس دبیر وغیرہ کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ، خصوصاً اس دور کے ممتاز سرآمد روزگار شعراء ریزہ شہاب اور عمید کا تعارف اور ان کے کلام کا انتخاب۔

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم۔ اے۔ ضخامت ۳۲۴۔ قیمت ۱۰ روپئے ۹۵ پیسے

وفیات

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

از ضیاء الدین اصلاحی

۶ر اکتوبر کو ریڈیو پاکستان سے یہ اندوہناک خبر معلوم ہوئی کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی طبیعت عرصہ سے خراب تھی، اس پیرانہ سالی میں جواں سال فرزند کی وفات کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا، کئی بار دل کا دورہ پڑچکا تھا، بالآخر اس بیماریٔ دل نے کام تمام کر دیا،

وہ دیوبند کے عثمانی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، اور یہیں ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد مولانا محمد یٰسین صاحب دار العلوم دیوبند میں مدرس تھے، مفتی صاحب نے ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۳۰ھ میں دار العلوم کے عربی درجہ میں داخلہ لیا، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور مولانا اعزاز علی وغیرہ اکابر علماء سے درسیات کی تکمیل کی، مولانا قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم اور مولانا شاہ وصی اللہ ان کے ہم سبق تھے، ۱۳۳۶ھ میں درس نظامی سے فراغت کے بعد دار العلوم میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، اس عرصہ میں دار الافتاء کے سربراہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے زیر نگرانی فتویٰ نویسی کا کام بھی انجام دیتے رہے، ان کے انتقال کے بعد ۱۳۵۰ھ میں یہ شعبہ خود ان کے سپرد کر دیا گیا اور بارہ سال تک اس خدمت کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، دار العلوم دیوبند کی فتویٰ نویسی کی تاریخ میں یہ دونوں بزرگ اپنے علم و فضل اور

فقہی و دینی بصیرت کی وجہ سے برابر یاد کیے جائیں گے، ملک کی تقسیم کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی دعوت پر پاکستان کے اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لیے مئی ۱۹۴۸ء میں کراچی تشریف لے گئے، پھر وہیں مستقل طور پر رہ گئے، دار العلوم دیوبند کے طرز پر دار العلوم کراچی کے نام سے ایک بڑے عربی مدرسہ کی داغ بیل ڈالی جس کے وہی مہتمم ہوئے، ۱۹۶۷ء میں ان کے خلف الرشید مولوی محمد تقی عثمانی نے ان کی سرپرستی میں البلاغ کے نام سے ایک علمی، دینی اور اصلاحی ماہنامہ جاری کیا جو دار العلوم کراچی کا ترجمان ہے، اس کے ہر نمبر میں مفتی صاحب کے مفید مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے،

تفسیر، حدیث اور متداول علوم میں مفتی صاحب کی استعداد پختہ تھی، مگر فقہ و افتا کی طرف میلان زیادہ رہا، حنفی فقہ پر ایسی گہری نظر رکھنے والے اب بہت کم لوگ ہوں گے۔

ان کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق تھا، ان کی تحریریں بڑی سلیس، عام فہم، سنجیدہ، پُرمغز اور جامع ہوتی ہیں، دار العلوم دیوبند میں درس و افتا کی مشغولیت کے باوجود متعدد علمی، دینی، فقہی اور اصلاحی رسائل تصنیف کیے، ردِّ قادیانیت پر کئی کتابیں لکھیں، اسی زمانہ کی یادگار وہ ضخیم رسالہ ہے جو ختم نبوت کے عنوان سے چار حصوں میں شائع ہوا تھا، اس کے تین حصوں میں قرآن، حدیث اور صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا، اور آخری حصہ میں قادیانیوں کے دلائل کی محققانہ تردید کی گئی ہے، اس زمانہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دار العلوم دیوبند کے ہزاروں فتووں کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے افادۂ عام کے لیے شائع کیا، ہر جلد دو حصوں پر مشتمل تھی پہلے میں عزیز الفتاوی کے نام سے مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے اور دوسرے میں امداد الفتاوی کے نام سے خود ان کے فتوے درج ہیں، یہی فتوے جدید میں مزید

گئیں اصلاح و نظرثانی کے بعد نئی ترتیب و تبویب کے ساتھ جواہر الفقہ کے نام سے دو جلدوں میں مکتبۂ دار العلوم کراچی سے شائع ہوئے۔ پہلی جلد مفتی عزیز الرحمن صاحب اور دوسری ان کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ مفتی صاحب نے اکثر جدید مسائل کا تشفی بخش جواب دیا ہے۔ اس طرح کے فتووں کا ایک علیحدہ مجموعہ البدائع المفیدہ فی الصنائع الجدیدہ کے نام سے چھپا تھا۔ اس میں سائنس کی موجودہ ترقیات نے جو نئے نئے آلات جیسے ریڈیو، سینما، تار، ٹیلیفون، وائرلیس، فوٹوگرافی اور مسائل مثلاً روزہ میں انجکشن وغیرہ پیدا کر دیے ہیں، ان سے متعلق سوالات کے مفصل جوابات دیے ہیں۔ کراچی کے قیام کے زمانہ میں بھی بعض علمی و فقہی مسائل پر انکے مفید مضامین شائع ہوئے۔ ان میں اسلامی ذبیحہ، قربانی، رؤیت ہلال، سود اور اسلام کا نظام تقسیم دولت وغیرہ خصوصیت سے بڑے اہم ہیں، جن میں بعض علیحدہ رسالوں کی صورت میں چھپ کر بہت مقبول ہوئے۔

ان کی سب سے اہم کتاب تفسیر معارف القرآن ہے، جو کئی جلدوں میں چھپا ہے اور رسالہ البلاغ میں بھی قسط وار چھپتی رہتی ہے اور ہفتہ وار درس کی صورت میں ریڈیو پاکستان سے بھی نشر کی جاتی ہے۔ مفتی صاحب کی ایک اور قابل ذکر کتاب اسلام کا نظام اراضی ہے، اس کے پہلے حصہ میں زمین کی مختلف قسموں اور ہند و پاک کی زمینوں کے مفصل شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں اراضی ہند کی شرعی و فقہی حیثیت کو متعین کرنے کیلئے اسلامی فتوحات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

عربی میں بھی کئی رسالے لکھے اور بعض عربی رسالوں کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ علامہ سیوطی کے ایک عربی رسالہ "اتحاف الجزل فی الغزل" کا اردو ترجمہ کیا۔ اس میں چرخہ کاتنے کی فضیلت سے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ رسالہ ترک موالات کے زمانہ میں جب گاندھی جی نے چرخہ

فقہی و دینی بصیرت کی وجہ سے برابر یاد کیے جائیں گے، ملک کی تقسیم کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی دعوت پر پاکستان کے اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لیے مئی ۱۹۴۸ء میں کراچی تشریف لے گئے، پھر وہیں مستقل طور پر رہ گئے، دارالعلوم دیوبند کے طرز پر دارالعلوم کراچی کے نام سے ایک بڑے عربی مدرسہ کی داغ بیل ڈالی جس کے وہی مہتمم ہوئے، ۱۹۶۷ء میں انکے خلف الرشید مولوی محمد تقی عثمانی نے ان کی سرپرستی میں البلاغ کے نام سے ایک علمی، دینی اور اصلاحی ماہنامہ جاری کیا جو دارالعلوم کراچی کا ترجمان ہے، اس کے ہر نمبر میں مفتی صاحب کے مفید مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے،

تفسیر، حدیث اور متداول علوم میں مفتی صاحب کی استعداد پختہ تھی، مگر فقہ و افتاء کی طرف میلان زیادہ رہا، حنفی فقہ پر ایسی گہری نظر رکھنے والے اب بہت کم لوگ ہوں گے۔

ان کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق تھا، ان کی تحریریں بڑی سلیس، عام فہم، سنجیدہ، پُرمغز اور جامع ہوتی ہیں، دارالعلوم دیوبند میں درس و افتا کی مشغولیت کے باوجود متعدد علمی، دینی، فقہی اور اصلاحی رسائل تصنیف کیے، ردّ قادیانیت پر کئی کتابیں لکھیں، اسی زمانہ کی یادگار وہ ضخیم رسالہ ہے جو ختم نبوت کے عنوان سے چار حصوں میں شائع ہوا تھا، اس کے تین حصوں میں قرآن، حدیث اور صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا، اور آخری حصہ میں قادیانیوں کے دلائل کی محققانہ تردید کی گئی ہے، اس زمانہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے ہزاروں فتووں کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں مرتب کر کے افادۂ عام کے لیے شائع کیا، ہر جلد ۲ حصوں پر مشتمل تھی پہلے میں عزیز الفتاوی کے نام سے مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے اور دوسرے میں امداد الفتاوی کے نام سے خود ان کے فتوے درج ہیں، یہی فتوے بعد میں مزید

مکمل اصلاح و نظرثانی کے بعد نئی ترتیب و تبویب کے ساتھ جواہر الفقہ کے نام سے دو جلدوں میں مکتبۂ دار العلوم کراچی سے شائع ہوئے، پہلی جلد مفتی عزیز الرحمن صاحب۔ اور دوسری ان کے فتووں کا مجموعہ ہے مفتی صاحب نے اکثر جدید مسائل کا تشفی بخش جواب دیا ہے، اس طرح کے فتووں کا ایک علیحدہ مجموعہ البدائع المفیدہ فی الصنائع الجدیدہ کے نام سے چھپا تھا، اس میں سائنس کی موجودہ ترقیات نے جو نئے نئے آلات جیسے ریڈیو، سینما، تار، ٹیلیفون، وائرلیس، فوٹوگرافی اور مسائل مثلاً روزہ میں انجکشن وغیرہ پیدا کر دیے ہیں، ان سے متعلق سوالات کے مفصل جوابات دیے ہیں، کراچی کے قیام کے زمانہ میں بھی بعض علمی و فقہی مسائل پر انکے مفید مضامین شائع ہوئے، ان میں اسلامی ذبیحہ، قربانی، رؤیت ہلال، سود اور اسلام کا نظام تقسیم دولت وغیرہ خصوصیت سے بڑے اہم ہیں جن میں بعض علیحدہ رسالوں کی صورت میں چھپ کر بہت مقبول ہوئے،

ان کی سب سے اہم کتاب تفسیر معارف القرآن ہے، جو کئی جلدوں میں چھپا ہے اور رسالہ البلاغ میں بھی قسط وار چھپتی رہتی ہے اور ہفتہ وار درس کی صورت میں ریڈیو پاکستان سے بھی نشر کی جاتی ہے، مفتی صاحب کی ایک اور قابل ذکر کتاب اسلام کا نظام اراضی ہے، اس کے پہلے حصہ میں زمین کی مختلف قسموں اور ہند و پاک کی زمینوں کے مفصل شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں اراضی ہند کی شرعی و فقہی حیثیت کو متعین کرنے کیلئے اسلامی فتوحات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

عربی میں بھی کئی رسالے لکھے اور بعض عربی رسالوں کا اردو ترجمہ بھی کیا، علامہ سیوطی کے ایک عربی رسالہ الاجر الجزل فی الغزل کا اردو ترجمہ کیا۔ اس میں چرخہ کاتنے کی فضیلت سے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، یہ رسالہ ترک موالات کے زمانہ میں جب گاندھی جی نے چرخہ

چلانے کی تحریک پورے ملک میں چلائی تھی بہت مقبول ہوا، شعروسخن کا ذوق بھی تھا، عربی میں بعض اچھے نعتیہ قصائد کہے ہیں،

علمی کمالات کے ساتھ وہ حسن اخلاق اور زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے، ان کے ہم جماعت مولانا وصی اللہ صاحب طالب علمی کے زمانہ ہی سے تھانہ بھون آنے جانے لگے تھے، تعلیم مکمل کرلے کے بعد تو وہ اسی آستانہ کے ہوکر رہے، مفتی صاحب ان کے دس سال بعد ۱۳۴۹ھ میں جب پہلی دفعہ اصلاح باطن کے لیے مولانا تھانویؒ کی خدمت میں تشریف لیگئے تو مولانا وصی اللہ، مولانا کے خلیفۂ اجازت ہوچکے تھے، ایک روز انھوں نے مولانا وصی اللہ کا ذکر بڑی تحسین کے ساتھ کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا کہ "کیا آپ ان کو جانتے ہیں" مفتی صاحب نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا:

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق   او بصحرا رفت و ما در کوچہا رسوا شدیم

مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں ارشاد فرمایا "ہاں یہاں یہی دستور ہے، کسی کو صحرا دیا جاتا اور کسی کو سہرا دیا جاتا ہے، ہر ایک کو جو کچھ ملا ہو اس پر راضی ہونا چاہیے"۔

اس کے بعد وہ برابر مرشد کی خدمت میں استفادہ کے لیے حاضر ہوتے رہے، بالآخر خلافت سے سرفراز ہوئے، ان کے والد مولانا محمد یٰسین صاحب، مولانا تھانویؒ کے ہم درس تھے، بیعت و ارادت کے تعلق سے محبت و شفقت میں اور بھی اضافہ ہوگیا، مفتی صاحب کو اپنے شیخ سے بیحد عقیدت تھی، اپنی تحریروں میں ان کا بڑے احترام سے ذکر کرتے ہیں، ان کی کئی کتابوں کے ضمیمے اور شرحیں لکھیں اور فتووں کے مجموعہ امداد الفتاویٰ کو از سر نو مدون کیا اور اسکے بعض مبہم مسائل کی تشریح کی، ان کے حکم سے احکام القرآن کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھ رہے تھے، پتہ نہیں مکمل ہو پائی یا نامکمل رہ گئی، مفتی صاحب کی اکثر کتابوں کے نام مولانا تھانویؒ ہی کے تجویز کردہ ہیں اور ان میں انکے تحسین آمیز کلمات بھی درج ہیں، مفتی صاحب کی تحریریں

میں اپنے مرشد کے اسلوب کا پرتو اور اسی طرز کی حکیمانہ تشریح و تعبیر نظر آتی ہے، مفتی صاحب نے ان کو اصلاح اعمال اور تصفیۂ باطن کے لیے جو خطوط لکھے تھے وہ مع جواب آجکل البلاغ میں شائع ہو رہے ہیں، ان سے بھی مرشد و مسترشد کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے،

مفتی صاحب حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خواجہ تاش تھے، اس لیے دونوں بزرگوں میں بہت اچھے روابط تھے، اور ایک دوسرے کے علم و کمال کے معترف تھے، سید صاحب کے جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم بھی اکثر مفتی صاحب کے مضامین اور کتابوں کا اچھے انداز میں ذکر فرماتے تھے۔

مفتی صاحب اسلام کی حمایت اور فسق و فجور کے خلاف ہمیشہ سرگرم عمل رہے، انھوں نے اسلام، اسلامی تعلیمات اور داعی اسلام کے متعلق مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کے باطل خیالات کی پرزور تردید بھی کی ہے، پاکستان کے حکمراں اور تجدد پسند طبقہ نے جب اسلام کے بعض قوانین اور عائلی نظام میں ردو بدل کرنا چاہا تو اس کے مقابلہ میں وہ بہت پیش پیش تھے، اور وہاں اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے بھی جد و جہد کرتے رہے،

مفتی صاحب اپنے اکابر کی طرح ہمیشہ دیوبند کے طرز فکر سے پورے طور پر وابستہ اور حنفی مذہب پر شدت سے قائم رہے، مگر طبیعت میں اعتدال اور میانہ روی تھی، اس لیے فروعی مسائل میں رواداری برتتے تھے، جماعت اسلامی اور جماعت اہل حدیث کے بارہ میں انکا اور ان کے حلقہ کا جو بھی خیال رہا ہو، مگر اسلامی قانون کے نفاذ اور مشترکہ دینی مسائل اور ملی اتحاد کی خاطر ان جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ تبادلۂ خیال اور اشتراک عمل میں انھوں نے کبھی دریغ نہیں کیا، اپنے ایک رسالہ "وحدت امت" میں بڑے اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ

اتحاد کی اہمیت اور تفرق و انتشار کے نقصانات واضح کیے ہیں اور فقہی مسائل میں غلو، اختلاف اور معرکہ آرائی کی سخت مذمت کی ہے، وہ فروعی اختلافات کو حق و باطل کا مسئلہ قرار دینے کے بجائے اولیٰ وغیر اولیٰ پر محمول کرتے تھے، اس رسالہ میں انھوں نے اپنے استاذ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا یہ دلچسپ قول نقل کیا ہے کہ "میاں ہم نے تو افضل و مفضول کی بحث میں اپنی ساری عمر ضائع کر دی"

مفتی صاحب اپنے علم، تفقہ، تقویٰ، طہارت اور اعتدال و سلامت روی کی بنا پر برصغیر کے علمی و دینی حلقوں میں بہت مقبول تھے، اور انکی علمی و فقہی رایوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، افسوس ہے کہ ہماری پرانی علمی یادگاریں ایک ایک کرکے ختم ہوتی جارہی ہیں، اور ان کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔

ان کے صاحبزادہ مولوی محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ دار العلوم کراچی کے استاد اور لائق اہل قلم ہیں، ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اور دوسرے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور علم و دین کے اس خادم کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے۔ آمین

آہ! ڈاکٹر وحید مرزا

از سید صباح الدین عبد الرحمن

گذشتہ ماہ ریڈیو سے خبر ملی کہ اس برصغیر کے ایک بہت ہی لائق اور ممتاز اہل علم ڈاکٹر وحید مرزا کی وفات لاہور میں ہوگئی، اس خبر سے بڑا دکھ ہوا، ان سے میری ملاقات زیادہ نہیں رہی، اب سے ۳۵ سال پہلے ۱۹۴۱ء میں ہر دوئی میں تو ان سے برابر ملنے کا موقع ملا، اس کے بعد پھر کہیں ان سے نہیں ملا، مگر وہ اس وقت سے برابر دل و دماغ پر چھائے رہے، میں ۱۹۴۱ء میں ایک طویل علالت کے بعد ہردوئی جاکر تقریباً تین مہینے رہا، سر سید احمد خاں

م مصر اور دوست منشی ذکا، اللہ مرحوم کے نامور فرزند جناب عنایت اللہ صاحب نے اپنی کوٹھی
لے دو کمرے میرے قیام کے لیے دے دیے تھے، اسی زمانہ میں لکھنؤ سے ڈاکٹر وحید مرزا دہرہ دون
کر اپنے خسر جناب رضا اللہ کے یہاں مقیم تھے، جو جناب عنایت اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔
بجنیر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر دہرہ دون میں ایک بنگلہ بنایا تھا، دونوں بزرگوں کا وطن
ہلی تھا، مگر عنایت اللہ صاحب نے دہرہ دون ہی میں ڈالن والا کے سیمی روڈ پر مستقل سکونت
اختیار کر لی تھی، ان ہی کے بنگلہ کی پشت پر رضا اللہ صاحب کا بنگلہ تھا، ڈاکٹر وحید مرزا
ن دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں استاذ تھے، وہ دہرہ دون آئے تو عنایت اللہ صاحب کو سلام کرنے
آئے، وہیں ان سے میرا تعارف ہوا، قد لمبا اور جسم دبلا پتلا تھا، دونوں گال پچکے ہوئے تھے،
کیونکہ منہ کے تمام دانت نکلوا دیے تھے، پتلون اور قمیص پہنے ہوئے تھے، بڑے متین اور سنجیدہ
نظر آئے، خاموش بیٹھے رہے، عنایت اللہ صاحب کی باتوں کا جواب بہت ہی مختصر طریقے
پر دے کر خاموش ہو جاتے، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو عنایت اللہ صاحب نے مجھ سے مخاطب
ہو کر فرمایا کہ بڑی قابلیت رکھتے ہیں، امیر خسرو پر بہت عمدہ کتاب لکھی ہے، اس زمانہ میں
خود عنایت اللہ صاحب کی لیاقت کی بڑی شہرت تھی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے دار الترجمہ
کے ناظم کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر بھی علمی کاموں میں لگے ہوئے تھے، ان کی جغرافیۂ اندلس سے
استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی بہت متاثر تھے، پھر
بہت سی کتابوں کے ترجمے کر ڈالے تھے، جن میں تائیس، سلامبو، تیمور اور چنگیز خاں
زیادہ مقبول ہوئیں، ہوورتھ کی ہسٹری آف دی منگولس کی ضخیم جلدوں کے بھی
ترجمے کر لیے تھے، ڈاکٹر وحید مرزا کی قابلیت سے ان کا متاثر ہونا کوئی معمولی بات نہ
تھی، میں نے اس زمانہ میں حضرت سید صاحب کے بہت سے مضامین کے ترجمے انگریزی میں

کیے تھے، وہ چار ملاقاتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان ترجموں کی انگریزی دیکھنے کو عرض کیا تو بڑی خوشی سے میرا مسودہ مجھ سے مانگا۔ اپنے پورے قیام میں اس کو دیکھتے رہے، انھوں نے جو اصلاح و ترمیم کی اس سے میں بھی ان کی قابلیت سے متاثر ہوا۔ ان کو عربی، فارسی انگریزی اور اردو پر بڑی قدرت حاصل رہی، مگر بے تکلف صحبتوں میں بھی کبھی اپنے کمالات کا اظہار کرنا پسند نہ کرتے، ہم لوگ باتیں کرتے رہتے، وہ صرف سننے ہی پر اکتفا کرتے، کچھ دنوں پہلے ان کی بیوی یعنی رضا اللہ صاحب کی صاحبزادی کا انتقال ہوگیا تھا، اس سے ملول اور مغموم رہتے۔ ان کا لڑکا طاہر مرزا شاید تین چار برس کا رہا ہوگا، اسی سے دل بہلاتے رہتے، اس کی ہر طرح کی ناز برداری کرنے ہی میں ان کو لذت ملتی، وہ ان کو چھیڑتا، تنگ کرتا، ان کا ہاتھ پکڑ کر برآمدہ سے کمرہ اور کمرہ سے باہر لے جاتا۔ وہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے رہتے، جتنے دنوں ان کا ساتھ رہا یہی تماشہ دیکھنے میں آیا، اس سے ان کی شرافتِ نفس کا گہرا نقش دل میں برابر قائم رہا، پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی، مگر آنکھوں کے سامنے وہی وحید مرزا رہے جن کو طاہر مرزا ہر طرح چھیڑا کرتے تھے۔

دارالمصنفین واپس آکر امیر خسرو پر ان کی کتاب منگوائی، اس کے پڑھنے میں جو لذت ۱۹۳۲ء میں ملی وہی ۱۹۷۶ء میں بھی پاتا ہوں، اپنی علمی و ادبی زندگی میں مجھ کو امیر خسرو سے لگاؤ نہیں بلکہ عشق ہوگیا ہے، جن کو سب سے پہلے علامہ شبلی کے ذریعہ سمجھا مگر اس ذوق کی شراب کو دو آتشہ ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب نے بنایا، علامہ شبلی نے امیر خسرو سے متعلق اپنی شعر العجم میں جو کچھ لکھا ہے، اسی کے ایجاز کا اطناب ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ہے، اگر علامہ شبلی بقید حیات ہوتے تو اس اطناب کی داد دل کھول کر دیتے، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امیر خسرو پر جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اس میں ہے، جو کچھ نہیں لکھا گیا ہے وہ بھی اس میں ہے، اور جو کچھ آگے چل کر لکھا جائیگا وہ بھی اس میں ہے،

۱۹۷۵ء ہندوستان اور پاکستان میں امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن بہت دھوم دھام سے منایا گیا، ان تقریبات میں بہت سے مقالات پڑھے گئے، ہر طرف سے رسائل کے امیر خسرو پر نمبر نکالے گئے، ظروف بدلے ہوئے تھے، مگر مظروف وہی تھا جو ڈاکٹر وحید مرزا اپنے ظرف میں پیش کر چکے تھے،

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو کے بعد امیر خسرو کی مثنوی نہ سپہر کو ایڈٹ کر کے شائع کیا، اس سے پہلے امیر خسرو کی قران السعدین اور انکی خمسہ شائع ہو چکی تھیں، نہ سپہر کو ہاتھ لگاتے ہوئے شاید اہل نظر بھی گھبراتے تھے، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس پر انگریزی میں ایک بہت ہی فاضلانہ مقدمہ لکھکر اس کو شائع کیا تو ایک بار پھر انکی اعلیٰ قابلیت کی دھوم ہوئی، انھوں نے مثنوی نہ سپہر کو جس طرح سمجھایا ہے اس سے بہتر شاید کوئی اور نہ سمجھا سکیگا، آیندہ جو بھی اس مثنوی پر کچھ لکھے گا، اس سے استفادہ کیے بغیر نہ رہ سکے گا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اس لیے بھیجے گئے تھے کہ امیر خسرو کو سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں، ان کی طبیعت کی بلندی اور بے نیازی کا اثر اس حیثیت سے بھی پڑا کہ ۱۹۷۵ء میں جب پاکستان میں امیر خسرو پر نیشنل اور انٹرنیشنل سمینار ہوئے تو میں اُس زمانہ میں پاکستان ہی میں تھا، ان علمی مجلسوں میں ہر قسم کے اسکالر امیر خسرو پر کچھ نہ کچھ لکھ کر داد و تحسین کا خراج وصول کرنا چاہتے تھے، مگر ڈاکٹر وحید مرزا کہیں نظر نہیں آئے، حالانکہ ان ہی کا طوطی ہر جگہ بول رہا تھا، وہ ان تقریبوں کے ہنگاموں سے دور اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھے اپنی دنیا آپ آباد کر رہے تھے،

مئی ۱۹۳۵ء کے اورنٹیل کالج میگزین میں مظہر کڑہ مانکپوری پر ایک بحث چھڑ گئی تھی، اس میں محمود شیرانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ساتھ ڈاکٹر وحید مرزا نے بھی حصہ لیا تھا، ان کا مضمون بڑے شوق سے علمی حلقہ میں پڑھا گیا تھا، ۱۹۶۰ء میں دارالمصنفین

سے "ہندوستان عربوں کی نظر میں" نکلی تھی، تو اس کی پہلی جلد پر ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد کے اسلامک کلچر میں ایک طویل ریویو لکھا تھا، اس میں ترجموں کے تسامحات کی نشاندہی فاضلانہ انداز میں کی تھی جس کو دارالمصنفین میں تسلیم کیا گیا۔

وہ جب تک لکھنؤ یونیورسٹی میں رہے، اساتذہ اور طلبہ دونوں نہ صرف ان کی عزت بلکہ ان سے محبت کرتے، یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور کے پروفیسر محمد شفیع نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب وتدوین کے سلسلہ میں اپنے یہاں مدعو کیا، جہاں وہ آخر وقت تک رہے، ان کے اعزہ زیادہ تر دہلی میں رہتے تھے، مگر انھوں نے لاہور میں رہ کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا، اور وہیں سے پی ایچ ڈی کرنے لندن گئے، ان کو لاہور سے خاص مناسبت تھی، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کو بھی منظور تھا کہ وہ وہیں سپرد خاک ہوں۔

وہ اب آغوش رحمت الٰہی میں ہیں، مگر اپنے پیچھے ایک بہت ہی اچھے محقق، بہت اچھے اہل علم اور بہت ہی شریف انسان کی یاد چھوڑ گئے، امیر خسرو پر ان کی کتابیں تو شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان کی ایک اچھی سوانح عمری لکھ کر ان کی علمی سرگرمیوں کا سیر حاصل جائزہ لیا جائے،

دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت انکو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں۔ آمین ثم آمین

تاریخ فقہ اسلامی

تاریخ التشریع الاسلامی مؤلفہ علامہ محمد الخضری مرحوم کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات بتفصیل بیان کی گئی ہیں۔

ترجمہ از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم۔ (طبع سوم) صفحات ۴۰۹ قیمت ۱۵ روپئے ۶۵

مطبوعات جدیدہ

آئینۂ وِیسی۔ مرتبہ جناب محمد مطیع الرحمن صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۵۰۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۱۵ روپے

پتہ:- یونیورسٹی فلیٹ، لاکالج، کمپاؤنڈ، پٹنہ ۶

حضرت سید فتح علی ویسیؒ چاٹگامی (م ۱۳۰۴ھ) سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بزرگ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ حضرت صوفی نور محمد نظام پوریؒ سے بیعت تھے، زیر نظر کتاب میں ان کے اور ان کے سلسلہ کے کئی بزرگوں کے حالات درج ہیں، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ کی ابتدا میں چاٹگام پر مسلمانوں کے اقتدار، صوفیہ کی تبلیغی مساعی، تصنیفی خدمات اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح و جہاد میں شریک بنگالی خلفاء و مریدین کا ذکر ہے، پھر حضرت فتح علی ویسی کے سوانح، مریدین کی فہرست اور اکابر خلفا کے حالات درج ہیں، سید ویسی کے ایک اہم خلیفہ مولانا شاہ غلام سلمانی کے سلسلہ میں ان کے خلیفہ سید عبد الباری شاہ کا ذکر بھی آگیا ہے جو مصنف کے پیر مولانا محمد سعید خاں کے پیر حافظ حامد حسن علوی کے مرشد تھے، مصنف نے ان دونوں کے مفصل حالات بھی لکھے ہیں، دوسرا حصہ دیوان ویسی کے تبصرہ و انتخاب پر مشتمل ہے، اس میں حضرت ویسی کی نعت گوئی پر زیادہ گفتگو کی گئی ہے، اس کتاب کا زیادہ حصہ صاحبِ تذکرہ کے سلسلۂ طریقت کے پہلے اور بعد کے بزرگوں کے حالات کی نذر ہوگیا ہے، اس حد تک تو

سے "ہندوستان عربوں کی نظر میں" نکلی تھی، تو اس کی پہلی جلد پر ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد کے اسلامک کلچر میں ایک طویل ریویو لکھا تھا، اس میں ترجموں کے تسامحات کی نشاندہی فاضلانہ انداز میں کی تھی جس کو دارالمصنفین میں تسلیم کیا گیا۔

وہ جب تک لکھنؤ یونیورسٹی میں رہے، اساتذہ اور طلبہ دونوں نہ صرف ان کی عزت بلکہ ان سے محبت کرتے، یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور کے پروفیسر محمد شفیع نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں اپنے یہاں مدعو کیا، جہاں وہ آخر وقت تک رہے۔

ان کے اعزہ زیادہ تر دہلی میں رہتے تھے، مگر انھوں نے لاہور میں رہ کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم، اے کیا، اور وہیں سے پی، ایچ، ڈی کرنے لندن گئے، ان کو لاہور سے خاص مناسبت تھی، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کو بھی منظور تھا کہ وہ وہیں سپرد خاک ہوں۔

وہ اب آغوش رحمت الٰہی میں ہیں، مگر اپنے پیچھے ایک بہت ہی اچھے محقق، بہت اچھے اہل علم اور بہت ہی شریف انسان کی یاد چھوڑ گئے، امیر خسرو پر ان کی کتابیں تو شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان کی ایک اچھی سوانح عمری لکھ کر ان کی علمی سرگرمیوں کا سیر حاصل جائزہ لیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت انکو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں۔ آمین ثم آمین

تاریخ فقہ اسلامی

مطبوعات جدیدہ

آئینۂ وسیؔ۔ مرتبہ جناب محمد مطیع الرحمن صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۵۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵ روپے

پتہ:- یونیورسٹی فلیٹ، لا کالج، کمپاؤنڈ، پٹنہ ۶

حضرت سید فتح علی وسیؔ چاٹگامی (م ۱۳۰۲ھ) سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے بزرگ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ حضرت صوفی نور محمد نظام پوریؒ سے بیعت تھے، زیر نظر کتاب میں ان کے اور ان کے سلسلہ کے کئی بزرگوں کے حالات درج ہیں، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ کی ابتدا میں چاٹگام پر مسلمانوں کے اقتدار، صوفیہ کی تبلیغی مساعی، تصنیفی خدمات اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح و جہاد میں شریک بنگالی خلفاء و مریدین کا ذکر ہے، پھر حضرت فتح علی وسی کے سوانح، مریدین کی فہرست اور اکابر خلفا کے حالات درج ہیں، سید وسی کے ایک اہم خلیفہ مولانا شاہ غلام سلمانی کے سلسلہ میں ان کے خلیفہ سید عبد الباری شاہ کا ذکر بھی آگیا ہے جو مصنف کے پیر مولانا محمد سعید خاں کے پیر حافظ حامد حسن علوی کے مرشد تھے، مصنف نے ان دونوں کے مفصل حالات بھی لکھے ہیں، دوسرا حصہ دیوان وسی کے تبصرہ و انتخاب پر مشتمل ہے، اس میں حضرت وسی کی نعت گوئی پر زیادہ گفتگو کی گئی ہے، اس کتاب کا زیادہ حصہ صاحبِ تذکرہ کے سلسلۂ طریقت کے پہلے اور بعد کے بزرگوں کے حالات کی نذر ہوگیا ہے، اس حد تک تو

معافقہ نہ تھا، مگر ہر ایک کے متعلقین، اولاد و احفاد کے مفصل ذکر اور معروف اشخاص کے بارہ میں طویل حاشیے لکھنے اور جگہوں کے ذکر میں خواہ مخواہ کی طوالت کی ضرورت نہ تھی، مصنف نے بزرگوں کی تعلیمات کا کم ذکر کیا ہے اور عقیدتمندی سے زیادہ کام لیا ہے، بعض جگہوں کے نام بھی صحیح نہیں لکھے گئے ہیں، حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کا سنہ پیدائش ۶۸۸ھ اور سنہ وفات ۸۰۸ھ مسلم و محقق نہیں ہے، مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کا مقام پیدائش مولانا علی میاں کی کتاب کے حوالہ سے ملانواں ضلع اناؤ بتایا گیا ہے، حالانکہ انھوں نے سندیلہ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر امید ہے کہ یہ کتاب مصنف کے سلسلہ کے لوگوں میں شوق سے پڑھی جائے گی۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری - مرتبہ جناب شورش کاشمیری مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۵؎ پتہ مطبوعات چٹان ۸۵ میکلوڈ روڈ۔ لاہور۔

جناب شورش کاشمیری مرحوم کو جن اکابر سے زیادہ عقیدت تھی، ان میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم بھی تھے، یہ پنجاب کے مشہور لیڈر، مجلسِ احرار کے روح رواں، جنگِ آزادی کے پرجوش مجاہد اور ملک کے بہت بڑے خطیب تھے، شورش مرحوم قومی تحریکوں میں برسوں ان کے ساتھ کام کر چکے تھے، اس لیے ان کی سوانح عمری لکھنے کا سب سے زیادہ حق انہی کو تھا، اس کا پہلا اڈیشن کئی سال پہلے چھپا تھا، دوسرا اڈیشن بڑے اضافے کے ساتھ شائع ہوا ہے، جو شاہ صاحب مرحوم کے ذاتی و خاندانی حالات، قید و بند کے واقعات، ملک و ملت کی راہ میں قربانی اور دوسرے کارناموں کا مرقع ہے، اس سے گذشتہ نصف صدی کی قومی، ملی اور سیاسی

جد و جہد کی سرگذشت کے علاوہ مجلس احرار اور قادیانیت کے خط و خال بھی پوری طرح سامنے آجاتے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب مصنف کے خاص طرزِ نگارش کا نمونہ ہے، مگر ان پر صحافت و خطابت کا زیادہ غلبہ تھا، اس لیے ان دونوں کے اثرات سے ان کی ہر تحریر کی طرح یہ کتاب بھی خالی نہیں، میر تقی میر کے مشہور شعر "فقیرانہ آئے صدا کر چلے" الخ کو میر درد کا بتایا ہے (ص ۲۰۱۴) ہوش کو مونث لکھا ہے (ص ۲۱۸) حالانکہ یہ مذکر ہے، دونوں کا املا ہر جگہ دونو لکھا ہے، بعض ثقیل اور نامانوس الفاظ مثلاً مہلکہ، براجمان، برکیٹ کرنا، استحصالات، ختم المرسلینی وغیرہ بھی استعمال کیے ہیں،

الالبانی شذوذہ واخطاؤہ (عربی) مرتبہ جناب ارشد السلفی صاحب

تقطیع کلاں، کاغذ بہتر، طباعت ٹائپ صفحات ۳۲۔ قیمت عہ، ناشر مکتبۂ علیہ مالیگاؤں، ناسک، ہند

دمشق کے مشہور فاضل ناصر الدین البانی کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، اور انھوں نے فن حدیث وغیرہ کی متعدد کتابوں کو ایڈٹ کرکے ترتیب و تحشیہ کے ساتھ شائع بھی کیا ہے، ان کو ان گوناگوں علمی و تحقیقی کاموں میں اپنے پیشرو مصنفین کی رایوں سے اختلاف کرکے ان کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کرنی پڑی ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کی کاوشوں میں خود اُن سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں، مذکورۂ بالا رسالہ میں البانی کے بعض اغلاط و مسامحات دکھائے گئے ہیں، مگر ان کے مبلغ علم وغیرہ کے بارہ میں مرتب نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا لہجہ بہت نامناسب ہے، انھوں نے ابن تیمیہؒ پر البانی کی ایرادات تو نقل کی ہیں مگر ان کی تردید نہیں کر سکے ہیں، البانی کا اگر مولانا عبد الرحمن مبارکپوری مرحوم کو حنفی کہنا صحیح نہیں ہے تو مصنف کا ان کو ائمۂ اربعہ کا معاند قرار دینا بھی تو غلط ہے،

املائی کی غلطیوں کے باوجود ان کی علمی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا ،

نئے پھول ۔ مرتبہ جناب مجیب بستوی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی صفحات ۸۴، قیمت عہ، پتہ انجمن افکار ادب سمرا نواں بازار، ضلع بستی ۔

جناب مجیب بستوی نے زیر نظر مجموعہ میں اپنے چند احباب شعرا کے کلام کے نمونے اور ان کا مختصر تعارف شائع کیا ہے، اس میں اکثر شعرا البستی اور اس کے نواح کے اضلاع کے ہیں، اور زیادہ تر غیر معروف اور نومشق ہیں، طباعت بہت خراب ہے اور قیمت زیادہ ہے ۔

اردو قواعد حصہ اول ۔ از لے وائی انصاری بی اے صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۸۰ قیمت ۶؍ پتے (۱) کتب خانہ امدادیہ دیوبند، سہارنپور (۲) قومی کتاب گھر، دیوبند (یو-پی)

اس کتابچہ میں اردو کے قاعدے مکالمہ کی صورت میں لکھے گئے ہیں، طلبہ اس خشک مضمون سے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے، اس لیے ان کی دلچسپی اور آسانی کے لیے لائق مصنف نے سوال وجواب کے پیرایہ میں ضروری قواعد بیان کئے ہیں اور حروف تہجی، اسم ضمیر، صفت، فعل، حرف اور انکی قسموں نیز جملہ اور اس کے اجزا کی وضاحت بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے اگر یہ مفید کتابچہ ابتدائی درجوں کے نصاب میں رکھا گیا تو امید ہے کہ بچوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا ۔

ض

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی و تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱- مہاجرین جلد دوم   قیمت: ۱۲-۹

۲- سیر الصحابہ جلد ۶   "   ۹-۴

امام حسین کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں واقعۂ حزنیہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳- سیر الصحابہ جلد ۷،

۴- تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۱۲-۵۰

۵- تاریخ اسلام اول (عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ)

قیمت: ۱۲-۵۰

۶- تاریخ اسلام دوم (خلافتِ بنی امیہ)   ۱۱-۰۰

۷- تاریخ اسلام سوم (خلافتِ عباسیہ اول)

قیمت: ۱۴-۰۰

۸- تاریخ اسلام چہارم (خلافتِ عباسیہ دوم)

قیمت: ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن   قیمت: ۱۵-۰۰

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دینِ رحمت   قیمت: ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر   ۴-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیاتِ سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، دینی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع، اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیاتِ شبلی کا مثنیٰ، دلکش، دلچسپ قابلِ مطالعہ اس میں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے۔   قیمت: ۲۷-۵۰

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰

دسمبر سنہ ۱۹۷۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ۔ عبد السلام قدوائی ندوی

قیمت پندرہ ۱۵ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کاتب سید اقبال احمد)

بلد ۱۱۹ ماہ دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

آج کل ملک میں قومی دھارے کا ذکر برابر آتا ہے مگر اس کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اُس کی تشکیل کن اجزا سے ہوتی ہے؟ اُس کے لئے ذہن کیسے تیار کیا جا سکتا ہے؟ اُس کو فروغ دینے والے کون لوگ ہوں گے، اور وہ کون سے موثر ذرائع اختیار کریں گے؟

اس سلسلہ میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، ملک کی سب سے موثر، طاقتور اور مقبول سیاسی جماعت کانگریس جو کچھ کہتی یا کرتی ہے، کیا وہی قومی دھارا ہے؟ غیر کانگریسی جماعتیں جو کہتی یا کرتی یا جو تحریکیں چلاتی ہیں کیا وہ قومی دھارے کی منافی ہیں؟ اس میں مذہب کا کیا رول ہونا چاہئے؟ کیا مذہب اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے، یا یہ رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے؟ کچھ تاریخی شخصیتیں ایسی بھی ہیں جن کو ملک کا ایک طبقہ اپنا ہیرو مانتا ہے، مگر دوسرا طبقہ ایسا بھی ہے جو اُن کو ہیرو کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں، ایسے طبقہ کا کردار قومی دھارے کے سلسلہ میں کیا ہونا چاہئے؟ ملک کے بعض تہوار قومی سمجھے جاتے ہیں، کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جو کسی تہوار کو بھی قومی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں، ایسے لوگوں کو قومی دھارے میں کیا جگہ دی جا سکتی ہے؟

ملک کی تہذیب اور تمدن میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مختلف علاقوں اور جماعتوں کے درمیان مشترک ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک ہیں، جنکو اپنانے والوں کے ساتھ قومی دھارے کے حامیوں کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ اگر تہذیبی اور تمدنی عناصر بھی قومی دھارے کے ضروری اجزا ہیں تو ملک میں لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے آداب اور معاشرتی رسوم وغیرہ میں جو نیرنگیاں نظر آتی ہیں کیا وہ قومی دھارے میں یکرنگی پیدا کرنے

میں مضر تو نہیں کیا یورپی لباس، ہوٹلوں اور پارکوں میں یورپی تہذیب کی مختلف قسموں کے فاسقانہ اور عریانانہ مظاہرے ہمارے قومی دھارے کی روایات کے مطابق ہیں، یا وہ ہمارے قومی ذہن اور مزاج کو برباد کرنے والے اجزا ہیں؟

قومی دھارے کے لئے خوشگوار اور تنومند ذہن کی نشو و نما کن ذرائع سے ہو سکتی ہے؟ فرقہ وارانہ قومیت اور وطنیت کیا ہے؟ اُن کے تخیل کو روشن کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی فرقہ کی اکثریت کسی مطالبہ میں متحد ہو جائے تو کیا اُس کا یہ اتحاد فرقہ واریت پر محمول ہوگا، یا اُس کو جائز قرار دیا جائے گا؟ ایک فرقہ کے متحدہ مطالبہ کو دوسرا فرقہ متحدہ طور پر رد کر دے تو ان میں کون قومی دھارے کا حامی اور کون مخالف سمجھا جائے گا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ وہ خدا کے احکام کا اطاعت گذار رہ کر وطن کا بھی فرمانبردار ہو سکتا ہے یا سچا ہندو اور سچا مسلمان ہی سچا اور محب وطن ہو سکتا ہے تو کیا وہ قومی دھارے کا حامی نہیں سمجھا جائے گا؟ یا کوئی یہ کہے کہ وہ پہلے ہندو یا مسلمان ہے، بعد میں ہندوستانی ہے تو کیا وہ قومی دھارے کے رُخ اور سمت کو غلط راستے کی طرف موڑ دینے والا سمجھا جائے گا؟ یا کوئی یہ کہے کہ پہلے ہندو یا مسلمان ہونے اور بعد میں ہندوستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں، وطن دشمنی نہیں تو کیا قومی دھارے کے مسلک کے لحاظ سے اس کا یہ کہنا صحیح ہوگا؟ یا کوئی یہ کہے کہ جو ہندو یا مسلمان اپنے مذہب کا وفادار نہیں وہ وطن کا بھی وفادار نہیں ہو سکتا، تو کیا ایسا کہنے والا قومی دھارے میں انتشار پیدا کرنے والا تصور کیا جائے گا؟ یا کوئی یہ کہے کہ سیاست میں مذہب خلل نہیں ڈالتا بلکہ مذہب میں سیاست دخیل ہو جاتی ہے تو مذہب اور سیاست دونوں میں خلل پڑ جاتا ہے تو کیا ایسا دعویٰ کرنے والا قومی دھارے کو نقصان پہنچانے والا قرار دیا جائے گا؟

ان تمام سوالات کا بس ایک ہی جواب ہے کہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی سرگرمیاں خواہ کیسی ہی ہوں اگر ان میں وطن دوستی کی روح موجود ہو تو وہ عین قومی دھارے کے تقاضے کے مطابق ہیں۔ ہم وطنوں میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی اختلافات خواہ کتنے ہی ہوں، اُن میں باہمی رواداری، دلجوئی

نیک نیتی، فراخ دلی اور خلوص کے دھاگے بندھے ہیں تو اصل ملی دوستی یہی ہے، اگر اکثریت اقلیت کے دلوں کی تسخیر کر لیتی ہے اور اقلیت اکثریت پر پورا اعتماد کر کے ان کے دلوں کو موہ لیتی ہے تو سچے معنوں میں یہی وہ قومی دھارے ہیں، مگر دلوں کی یہ تسخیر سیاسی مصلحت اور وقتی ضرورت کی خاطر نہ ہو بلکہ الفت و یگانگت کی مشک آگیں اور عنبرین فضا میں اس طرح ہو کہ دونوں یک جان ہو کر کہتے ہیں:-

ع:- وہ ہم سے جیتتے ہم اُن سے ہارتے ہیں

ذہن کو مفلوج اور مرعوب کر کے کسی مسلک یا عقیدہ کو تسلیم کرانا کوئی مدبرانہ مآل اندیشی نہیں، اگر یہ صحیح ہے تو خود مقبول ہو کر رہے گا، اور کوئی اسے قبول کرنے سے گریز کرتا ہے تو وہ گویا مریضانہ ذہنیت میں مبتلا ہے جو مہر و محبت کے مُؤثر علاج سے نہ کہ دل آزاری، آبرو شکنی، بیزاری اور خون ریزی سے دور ہو سکتی ہے،

ان سطروں کے لکھتے وقت قومی یک جہتی کے ورکنگ گروپ نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے حصول کے لئے ایک سات نکاتی لائحۂ عمل مُرتب کر کے شائع کیا ہے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اقلیتوں کے معاملہ میں اکثریتی فرقہ کے رویہ میں مثبت تبدیلی ہونی چاہئے تاکہ اُن کے اندیشے دور ہوں، اور وہ قوم کے خاص دھارے میں شریک ہو سکیں، انتہا پسند عناصر کی گرفت توڑ دی جائے، سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کو جگہ دلائی جائے، اکثریتی فرقوں کے کنٹرول کی صنعتوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے کارخانوں میں جگہ دیں، اقلیتوں کے خلاف کسی قسم کی تفریق برتی جائے تو اس پر سخت کارروائی ہو، قومی دھارے پر مہر و محبت کی یہ چاندنی جو جھلکتی نظر آ رہی ہے، وہ ملک کے تابناک مستقبل کے لئے نوید مسرت ہے، مگر تجویزوں سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے،

ع:- چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے،

مقالات

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی

از پروفیسر سید حسن پٹنہ

افغانستان میں کابل سے تقریباً ساڑھے چھ سو کیلو میٹر شمال مشرق میں ایران کی سرحد کے نزدیک ہری رودندی کے کنارے ہرات کا مشہور و معروف شہر واقع ہے جو قدیم زمانے میں تاجروں اور مسافروں کے قافلوں کی رہ گذر میں ایک مرکز اجتماع کی حیثیت رکھتا تھا، اسکندر رومی کے حملوں سے قبل اس مقام پر "ارتکانا" نام کا ایک شہر آباد تھا، اسکندر نے اپنی فتوحات کے دوران میں کچھ دنوں تک یہاں توقف کیا اور یہاں ایک حصار بنوایا ہے، جس کے کچھ آثار شکستہ ہنوز باقی ہیں، یہاں کی آب و ہوا نہایت خوشگوار، صحت بخش اور فرحت افزا ہے، اس کے اردگرد پھلوں کے باغات اور پھولوں کے چمنستان ہیں، چاروں طرف کوہستانوں کے سلسلے ہیں، جن کی وجہ سے نظر فروز و دلفریب قدرتی مناظر کی کثرت ہے، جب مسلمانوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو یہ خراسان صوبے کے تین بڑے شہروں میں شمار ہونے لگا، عہد غزنوی میں سلطان محمود کا بیٹا مسعود غزنوی یہاں کا گورنر تھا، اور اس نے اپنے دور حکومت میں یہاں بہت سے باغ لگوائے اور شہر کی رونق میں اضافہ کیا، جب وہ باپ کے بعد تخت نشین ہوا تو اکثر ہرات کے سفر کو جاتا تھا، اسی کے زمانے سے یہ شہر اسلامی

علوم وفنون کا مرکز بننے لگا، اس مردم خیز شہر سے بڑے بڑے علماء وفضلاء، فقہاء، محدثین و مفسرین، شعراء و ادباء، اہل طریقت و ارباب شریعت، خطاط ومصور پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنی تالیفات وتصنیفات سے اسلامی ادب اور فرہنگ وہنر کو مالا مال کر دیا ہے، یہاں اُن اہل کمال بزرگوں کے مقابر ومزارات اور ان سے منسوب تاریخی عمارات ومقامات کثرت سے ہیں جو عوام وخواص کے لیے قابل دید زیارت گاہیں ہیں۔

قدیم ہرات کے نامور بزرگوں میں شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ممتاز ترین درجہ رکھتے ہیں، ان کا شمار نوابغ روزگار اور نوادر نامدار میں ہوتا ہے، انھیں لوگ پیر ہرات اور پیر انصار کے القاب سے بھی یاد کرتے ہیں، ان کے ہزارویں سالِ ولادت کا جشن اپریل مئی کے مہینے میں شہر کابل میں بڑے شاندار طریقے پر منایا گیا جس میں افغانستان اور بیرونی ممالک کے علماء وفضلاء نے شرکت کی اور پیر ہرات کے احوال زندگانی وافکار وآثار کے بارے میں گرانقدر مقالے پیش کئے، راقم السطور نے بھی حکومت ہند کی طرف سے اس تقریب میں نمایندگی کی اور خراجِ عقیدت پیش کیا، اس موقع پر کابل کے علاوہ ہرات اور شہر قندوز کی جو روس کی سرحد کے پاس ہے، سیر بھی کی۔

شیخ الاسلام پیر انصار کی ولادت ہرات کے محلہ کہندز (حصار قدیم) میں دوسری شعبان روز جمعہ ۳۹۶ھ میں ہوئی تھی، حضرت جامیؒ نے نفحات الانس میں پیر ہرات کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "من ربیعی ام ودر وقت بہار زادہ ام وبہار را سخت دوست دارم"۔ خواجہ عبداللہ کے والد کا نام ابو منصور تھا، اور ان کی کنیت ابو اسمٰعیل تھی، ان کا نسب کئی واسطوں سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے، ابو منصور پہلے بلخ میں بود وباش رکھتے تھے، پھر وہاں سے ہرات چلے آئے جہاں انھوں نے ایک عورت سے

شادی کی جس سے خواجہ عبداللہ انصاری متولد ہوئے، ابومنصور بڑے متقی و پرہیزگار تھے، بلخ میں انھوں نے ایک حنبلی بزرگ بنام ابوالمظفر جباری بن احمد کی شاگردی اختیار کی تھی، انھوں نے اپنے استاد سے جو کچھ سیکھا تھا اپنے لڑکے خواجہ عبداللہ کو بھی سکھایا، خواجہ عبداللہ ابھی خوردسال ہی تھے کہ ابومنصور اپنے زن و فرزند کو چھوڑ کر اپنے مرشد کے پاس بلخ چلے گئے جہاں سے پھر وہ کبھی ہرات واپس نہیں آئے، پدر کے سایۂ عاطفت سے محروم ہونے پر خواجہ عبداللہ کی سرپرستی و تربیت دو بزرگوں نے اپنے ذمے لے لی، ایک تو یحییٰ[1] بن عمار شیبانی واعظ اور دوسرے شیخ عمو[2] ان دونوں بزرگوں نے بڑی توجہ و محبت سے خواجہ عبداللہ کی پرورش کی اور جب ان کا سن چار سال کا ہوا تو ایک درسگاہ میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے، جہاں ایک عورت بچوں کو پڑھاتی تھی، جب نو سال کے ہوئے تو قاضی ابومنصور ازدی (پورا نام محمد بن محمد بن عبداللہ ہروی) اور جارودی ہروی (پورا نام محمد بن احمد بن محمد الحافظ ابوالفضل جارودی) سے املا نویسی سیکھی،

۱؎ یحییٰ بن عمار شیبانی محدث تھے، انھوں نے حامد بن محمد رفاء و عبداللہ بن عاصی صابونی اور انکے بھائی محمد و محمد بن جناح سے تعلیم حاصل کی تھی، انھوں نے بغداد میں ابوعبداللہ بن خفیف کو دیکھا تھا اور بن خفیف خود بغداد کے زنداں میں حسین بن منصور حلاج کی صحبت میں رہے تھے، ابن عمار ہرات کے اہل بدعت کے سخت مخالف تھے، وہ شاعر بھی تھے، انکے اشعار ابوالحسن باخرزی نے کتاب دمیۃ القصر میں نقل کیے ہیں ۲؎ شیخ عمو کا پورا نام احمد بن محمد الفضل ابوالعباس نہاوندی تھا، وہ اس عہد کے ایک صوفی بزرگ جعفر خلدی کے شاگرد تھے، مگر منصور حلاج کے سخت مخالف تھے، نامور صوفیاے عہد سے ملاقات اور کسب فیض کے لیے سارے مشرقی اسلامی ملکوں کا سفر کیا تھا، انھوں نے نیشاپور میں شیخ ابوبکر فرا اور بخارا میں ابوبکر خالیزبان کی خدمت میں حاضری دی تھی، شیخ احمد نصر طالقانی کے ساتھ سفر حج بھی کیا تھا اور سارے مشائخ سے ملاقاتیں کی تھیں، ہرات میں اپنی خانقاہ بھی قائم کی تھی جس میں بعض بزرگان عہد ان کی ملاقات کو آتے تھے، اسی خانقاہ میں وہ خواجہ عبداللہ کو طریقت و معرفت کی تعلیم دیتے تھے۔

خواجہ عبداللہ انصاری بچپن ہی سے بہت ذکی و ذہین تھے اور قدرت نے انھیں غیر معمولی قوت حافظہ عطا کیا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں "حق سبحانہ و تعالیٰ حفظی عطا دادہ بود کہ ہر چہ از زیر قلم گذشتی مرا حفظ شدی"۔ (نفحات الانس جامی) ابتدائے تعلیم میں خواجہ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، بعد ازاں حدیث کی طرف توجہ کی اور ہزاروں حدیثیں اسناد کے ساتھ یاد کرلیں، اشعار عربی اور کلمات قصار سے بھی خاص رغبت رکھتے تھے، چنانچہ عرب شاعروں کے ایک لاکھ اشعار انھیں یاد ہو گئے تھے، ایک بار کسی نے قرآن مجید کی ایک آیت ان کے سامنے تلاوت کی تو انھوں نے چار سو اشعار عربی قبل از اسلام کے حافظہ سے سنا دیے، خواجہ عبداللہ پڑھنے لکھنے میں بڑی محنت کرتے تھے اور اپنے اوقات کو تقسیم کر کے برابر تعلیم میں مصروف رکھتے تھے، جامی نے نفحات الانس میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے :-

"روزگار خود در الحبش کردہ بودم، چنانکہ مرا ہیچ فراغت نبودی تا پس نماز خفتن بر تمام بودی، ہر شب در چراغ حدیث می نوشتی، فراغت نان خوردن نبودی، مادر من نان پارہ پارہ لقمہ کردہ بودی و در دہان من نہادی در میان نوشتن"

خواجہ عمار کے ایک رشتہ دار کا ایک لڑکا خواجہ عبداللہ انصاری کا ہم مکتب تھا، خواجہ عبداللہ فی البدیہ شعر کہہ دیتے تھے، مکتب کے لڑکے ان سے جس مضمون پر شعر بنانے کو کہتے وہ فوراً کہہ کر سنا دیتے، اس لڑکے نے خواجہ انصار کی یہ صفت اپنے باپ سے بیان کی تو اسکے باپ نے اپنے بیٹے کو کہا کہ جب مکتب جاؤ تو خواجہ انصار سے اس شعر کو عربی شعر میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کرو ؎

روزی کہ بشادی گذرد روز جہانست | وآں روز دگر روز بد اندیشاں است

جب اس لڑکے نے خواجہ انصار سے اسے عربی میں ترجمہ کرنے کو کہا تو انھوں نے فوراً

ترجمہ کرکے یہ شعر سنا دیا ؎

ویوم الفتی ماعاشہ فی مسرۃ وسائرہ یوم الشقاء عصیب

رم الوصل مادمت لساعۃ فالل جلی بعیش عیش الاکومین قریب

خواجہ انصار کی ذہانت طبع اور فارسی اشعار کو فی البدیہہ عربی میں ترجمہ کرنے کے اور بھی واقعات ہیں جو بخوفِ طوالت درج نہیں کیے جاتے۔

جب خواجہ عبداللہ کی عمر ۴۱۰ھ میں چودہ سال کی ہوئی تو ان کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا، بچپن کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور شباب کے دور کا آغاز ہوا تھا، ان کے استاد اب انھیں طفلِ نو آموز نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں اپنی مجلسوں میں اپنے قریب بٹھاتے تھے، اسی سال انکے استاد ابو منصور ازدی کا محرم کے ماہ میں انتقال ہو گیا اور خواجہ عبداللہ نے مزید تحصیل علم حدیث کے لیے عبدالجبار جراحی سے مراجعت کی جو جامع ترمذی کا درس دیتے تھے، عبدالجبار جراحی اصلاً شہر مرو کے باشندے تھے لیکن ہرات میں سکونت اختیار کر لی تھی، انھوں نے علم حدیث ابو العباس محمد التاجر محبوبی (متوفی ۳۴۶ھ) سے پڑھی تھی، اور محبوبی خود ترمذی کے شاگرد تھے، خواجہ عبداللہ جامع ترمذی کے بڑے مداح تھے اور اسے صحیح بخاری و صحیح مسلم سے زیادہ کارآمد سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم صرف اُن لوگوں کے لیے مفید ہیں جو قبل ہی سے حدیث زیادہ جانتے ہوں یعنی خود محدث ہوں لیکن جامع ترمذی میں احادیث کا بیان اور شرح اس طور سے ہے کہ فقہاء و محدثین کے علاوہ بھی عام محصلین کے لیے فائدہ مند ہے۔

خواجہ عبداللہ کا علم سے شوق و شغف اور صلاحیت و لیاقت و استعداد دیکھکر خواجہ یحییٰ ابن عمار نے جن کا اہلِ ہرات بہت احترام کرتے تھے قہندز کے لوگوں سے کہا کہ

خواجہ عبداللہ کی نازبرداری کیا کرو، کیونکہ اس جوان سے امامت کی بو آتی ہے، خواجہ یحییٰ کی بات سن کر لوگوں کی ٹولیاں ان کی خدمت میں پہنچنے لگیں، اور ان کی شہرت ایک مفسر و محدث کی حیثیت سے دیار و امصار میں پھیلنے لگی۔

پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں شہر نیشاپور علم و معرفت کا بڑا مرکز تھا، ہرات کی طرح یہ شہر بھی تاجروں کے قافلوں کی راہ میں واقع تھا، لہٰذا اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں مکاتب و مدارس قائم ہوگئے تھے، جو دینی زندگی اور فکری حیات کے نشو و نما کے لیے بڑے موید و مددگار ثابت ہوئے، ابوبکر بستی (متوفی ۴۲۹ھ) و استرآبادی (متوفی ۴۴۰ھ) اور ابراہیم اسفرائینی نے تدریس علوم دینی کے لیے مدرسے قائم کیے تھے، علامہ خطیب بغدادی نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں علامہ برقانی سے دریافت کیا تھا کہ تحصیل علم کے لیے مصر جاؤں یا نیشاپور، علامہ برقانی نے جواب دیا تھا کہ اگر مصر جاؤگے تو وہاں ایک شخص کے سوا اور کسی کو نہ دیکھوگے، اور اگر اس سے ملاقات نہ ہوئی تو تمھارا سفر بیکار رہوگا، لیکن اگر نیشاپور جاؤگے تو وہاں استادوں کی ایک جماعت پاؤگے، اگر ایک استاد کی صحبت نصیب نہ ہوئی تو دوسرے کی صحبت ملے گی، خطیب بغدادی نے اس نصیحت پر عمل کیا، اور خراسان کا سفر اختیار کیا، نیشاپور کی اہمیت اس واقعہ سے ثابت ہوتی ہے، چنانچہ حدیث و فقہ کی تحصیل، مشائخ سے ملاقات اور ان کی صحبت سے استفادہ کے لیے سنہ ۴۱۷ھ میں خواجہ عبداللہ نے نیشاپور کا سفر کیا، اور وہاں مختلف استادوں کی مجالس تدریس و تعلیم میں شرکت کی، دن کو جو کچھ سیکھتے تھے، رات کو بیدار رہ کر اسے لکھ لیتے تھے، طلب علم میں انھوں نے جو محنت صرف کی، اس کے متعلق جامی خود خواجہ کا قول نقل کرتے ہیں :-

"آنچہ من کشیدہ ام در طلب حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز کسی نکشیدہ،

ہمہ یاران در سفر ِ بغداد باشندی بفراغت و من بہ حدیث نوشتن بودمی، ایشان

گفتندی چون بہ ہرات رویم از نوشتہ بنویسیم"[1]

جس وقت خواجہ عبداللہ انصاری نیشاپور پہنچے تھے، وہاں بڑے بڑے علماء و فضلاء موجود تھے، جن میں سے بعض عالم پیری میں تھے، اور ان کے جانے کے چند سال بعد ہی فوت ہوگئے تھے، ان علماء میں ابوالحسن علی طرازی (ادیب و محدث)، ابونصر منصور المفسر، ابوالحسن احمد سلیطی جو علم صرف و نحو میں ماہر تھے، شیخ الاصم کے شاگرد نامدار قاضی ابوبکر حیری، ابوالفتح قرشی (فقیہ) ابراہیم الاسفرائنی، ابومحمد جوینی، شیخ الاسلام اسماعیل صابونی اور ابوالقاسم قشیری، خواجہ عبداللہ کا مقصد سفر علمائے حدیث، مشائخ اور صوفیہ کی صحبتوں میں شریک ہونا اور ان سے کسبِ علم معرفت و تحصیلِ حدیث تھا، اشاعرہ کے عقائد انھیں ناپسند تھے اس لیے انھوں نے بزرگانِ اشاعرہ کی صحبت سے اجتناب کیا، خواجہ انصار، شیخ عبداللہ ابن باکو شیرازی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کی خانقاہ میں چندے توقف کیا، ابن باکویہ ایک نامور صوفی تھے، ممتاز مشائخ کی ملاقات کے لیے بہت سے شہروں کی مسافرت کی تھی، اور انھیں بزرگانِ زمانہ کے متعلق بہت سی حکایتیں معلوم تھیں، ابن باکویہ نے خواجہ عبداللہ کی پذیرائی بہت احترام سے کی اور انھیں احادیث کی تعلیم دی۔

چند مہینوں تک نیشاپور میں اقامت کرنے کے بعد خواجہ عبداللہ انصاری ہرات لوٹ آئے، اس کے بعد وہ پانچ سال تک ہرات میں خانقاہ شیخ عمو، یحییٰ بن عمار کے مجالس اور صوفیانِ حصار کی صحبت میں رہے، علم میں اضافہ کرتے رہے، شیخ عمو نے انھیں اپنی خانقاہ سپرد کردی تھی، جہاں وہ محدثین کے اجتماع میں تقریر کرتے اور جو کچھ انھوں نے نیشاپور میں سیکھا تھا

---

[1] یہ عبارت متداول نسخوں سے مختلف ہے شاید مضمون نگار کے پاس کوئی اور نسخہ ہو (معارف)

اسے بیان کرتے، رفتہ رفتہ وہ استادی و ارشاد کے درجے پر پہنچ رہے تھے، ان کا سلوک سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفیوں کی ہدایتوں کے مطابق تھا، ان کے رفقا ان کی زیادہ سے زیادہ عزت و قدر کرنے لگے تھے۔

۴۲۱ھ (۱۰۳۰ مسیحی) میں سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد ان کا بیٹا مسعود غزنوی جانشین ہوا، جب خلیفہ عباسی القادر باللہ کا قاصد اس سے بیعت لینے کے لیے آیا تو مسعود غزنوی نے بیعت نامہ دیکر چند توقعات کا اظہار کیا، ایک تو کہ جو علاقے اس کے زیر نگیں تھے۔ ان پر اس کا حق تسلیم کیا جائے، دوسرے یہ کہ اپنے قلمرو کی توسیع کرنے کا بھی حق مانا جائے، تیسرے یہ کہ آل بویہ کو جو مغرب ایران میں برسر اقتدار تھے یہ ہدایت کیجائے کہ وہ ماوراء النہر اور خراسان کے حاجیوں اور زائرین کے لیے راستہ کھول دیں، کیونکہ اس زمانے میں یہ راہ بہت غیر مامون ہوگئی تھی اور کوئی شخص یا قافلہ بغیر خطرہ مول لیے اس راہ سے نہیں گذر سکتا تھا، سلطان مسعود غزنوی مذہبی خیال کا آدمی تھا، اس معاملے میں اسے بڑی کد تھی کہ حجاج کو بیت اللہ شریف جانے کی سہولت حاصل ہو، خلیفۂ عباسی نے پیام مسعود کی اہمیت محسوس کرکے آل بویہ کو فوراً مناسب ہدایت کردی اور سلطان مسعود کو اطلاع دیدی کہ راہ حج کو پر امن بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، حجاج و زائرین کے قافلے روانہ کیے جائیں، چنانچہ سلطان مسعود نے فرمان جاری کیا کہ حاجیوں کے قافلے تیار کیے جائیں اور خواجہ علی میکائیل کو امیر الحاج مقرر کردیا، جب یہ اطلاع ہرات پہنچی تو دیندار لوگوں کو بڑی مسرت ہوئی، لیکن سب سے زیادہ خوشی وہاں کے ایک ہشتاد سالہ ضعیف العمر شخص امام ابو الفضل ابن ابی سعد کو ہوئی جو شیخ الاسلام اسماعیل صابونی نیشاپوری کے خواہر زادہ اور اپنے وقت کے مرد پارسا، فقیہ، محدث اور واعظ تھے، وہ بہت دنوں سے حج بیت اللہ ادا کرنے کی تمنا رکھتے تھے،

لیکن اس سن و سال میں تنہا مسافرت کی زحمتوں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، اُن کی خواہش تھی کہ کوئی نیک کردار نوجوان ساتھ ہو، خواجہ عبداللہ انصاری کو جب ان کے ارادے اور خواہش کا علم ہوا تو وہ فوراً ان کا ساتھ دینے کو آمادہ ہو گئے، چنانچہ دونوں قافلۂ حجاج میں شامل ہو گئے، دس روز میں یہ قافلہ نیشاپور پہنچا، خواجہ عبداللہ کو دوبارہ اس شہر کو دیکھنے سے بہت خوشی ہوئی، علامہ اسمٰعیل صابونی نے اپنے ماموں کے اعزاز میں قافلہ کے چند اور لوگوں کے ساتھ ان دونوں کی ضیافت کی، اثنائے گفتگو میں خواجہ عبداللہ نے حدیث کے ایک سلسلۂ اسناد میں اشکال کی عالمانہ تقریر کی جس کی علامہ صابونی نے تصدیق کی، اہل مجلس نے خواجہ عبداللہ کو مبارکباد دی۔

حاجیوں کا یہ قافلہ رے ہوتا ہوا ماہ ذیقعدہ (۴۲۳ھ) کے دوسرے ہفتے میں دارالخلافہ بغداد میں پہنچا، جہاں خلیفہ القادر باللہ کا تابوت کاخِ خلافت سے مقبرۂ رصافہ کو پورے اعزاز کے ساتھ جلوس کے ساتھ لیجانے کی رسم ادا کی جا رہی تھی، اس رسم کو ادا کرنے میں کچھ عرصہ تاخیر قصداً کی گئی تھی کہ اہل خراسان بھی اس میں شرکت کر سکیں۔

ابھی یہ قافلہ بغداد ہی میں تھا کہ ایک پریشان کن خبر پہنچی کہ حج کی راہ میں پانی نایاب ہے، اور آذوقہ بہت گراں ہو گیا ہے، قافلہ والوں نے آگے کا سفر اس خبر کو سن کر ملتوی کر دیا لیکن خلیفہ عباسی کو سلطان مسعود غزنوی کا پیام یاد تھا، اس نے زائرین کے لیے اسباب اطمینان فراہم کر کے اپنے خزانۂ خاص سے دو ہزار دینار اخراجات سفر کے واسطے سالار قافلہ علی ابن میکائیل کے حوالے کر دیا، قافلہ اب روانہ ہونے والا ہی تھا کہ بصرہ سے یہ خبر آئی کہ بصرہ کا قافلۂ حج جیسے ہی شہر سے نکل کر کچھ دور گیا تھا کہ بدویوں نے اس پر حملہ کر دیا اور مال و اسباب لوٹ لیا، زائرین کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی تھی، اس اطلاع کے بعد قافلۂ خراسان نے اس سال

حج بیت اللہ کا ارادہ ناامنیتِ راہ کے سبب ترک کر دیا، اسی زمانے میں تمام دنیائے مشرق میں چیچک کی وبا پھیل گئی تھی، اور اس قدر جانیں تلف ہوئیں کہ صرف اصفہان میں چالیس ہزار آدمی مرگئے تھے، جب قافلۂ خراسان اپنے وطن کو واپس ہوا تو اس کے ہر فرد کو یہ فکر تھی کہ اس کے خاندان کے نہ معلوم کتنے آدمی فوت ہو چکے ہوں گے۔

دوسرے سال پھر ایک قافلہ ہرات سے حج بیت اللہ شریف کے لیے روانہ ہوا اور خواجہ عبداللہ انصاری بھی اس میں شامل ہوئے، جب یہ قافلہ نیشاپور پہنچا، خواجہ انصار ابن باکویہ[1] کی خانقاہ میں اقامت گزیں ہوئے، شاید اسی خانقاہ میں ان کی ملاقات شیخ ابوسعید[2] ابن ابوالخیر سے ہوئی ہوگی، شاید انھوں ہی نے خواجہ ابوالحسن خرقانی کا حال ان سے بیان کیا ہوگا، جن سے کچھ عرصہ پہلے شیخ کا مناظرہ ہوا تھا جس کا ذکر تذکرۃ الاولیاء مولفہ عطار میں موجود ہے، خواجہ عبداللہ نے دوبار شیخ ابوسعید کی خدمت میں حاضری دی۔

قافلۂ حج نیشاپور سے روانہ ہو کر بغیر کسی تکلیف و مصیبت کے رے پہنچا، لیکن اس سے آگے نہ جا سکا، کیونکہ اس کے آس پاس ترکمانوں نے تاخت و تاز مچا رکھی تھی، سلطان

---

[1] ابن باکویہ کا نام ابوعبداللہ ابن باکو یا ابن باکویہ جو باباکوہی کے نام سے معروف ہیں، شیراز میں متولد ہوئے اور اس شہر میں ابن خفیف کی شاگردی اختیار کی، پھر نیشاپور آکر علامہ قشیری اور شیخ ابوسعید ابن ابوالخیر کی خدمت میں حاضر ہوئے، کئی سال کے بعد پھر وطن کو مراجعت کی اور کوہ غار میں مسکن گزیں ہوئے، ۴۲۸ھ میں وفات پائی، ۴۲۶ھ میں جب وہ نیشاپور میں مقیم تھے، انھوں نے کتاب بدایۃ حال حلاج ونہایۃ لکھی۔

[2] فضل اللہ ابوسعید ابن ابوالخیر ۳۵۷ھ میں میہنہ میں متولد ہوئے، علم تصوف کی تحصیل کے لیے مرو گئے جہاں انھوں نے ابوعبداللہ حصری اور ابوبکر قفال کی خدمت میں حاضری دی، وہیں ابوالفضل حسن کے مرید ہوئے، پھر میہنہ آئے اور وہاں سے نیشاپور گئے، کچھ مدت کے بعد وطن واپس آئے اور یہیں ۴۴۰ھ میں انتقال کیا۔

مسعود غزنوی نے اُن کے خلاف کارروائی کی تھی، لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور قافلہ کو مجبوراً مشرق کی طرف مراجعت کرنا پڑی۔ خواجہ عبد اللہ انصاری اس پیش آمد سے بہت ملول تھے، لیکن انھوں نے یہ قصد کر لیا تھا کہ اس مسافرت سے کوئی فائدہ حاصل کریں گے، چنانچہ دامغان میں وہ ایک ہمسفر کے ساتھ ٹھہر گئے، یہاں انھوں نے ایک نامور مرشد روحانی شیخ محمد قصاب آملی سے ملاقات کی، لیکن اس سفر میں وہ سب سے زیادہ جس واقعہ سے اثر پذیر ہوئے وہ شیخ ابوالحسن خرقانی کی ملاقات تھی، اگرچہ دونوں کے درمیان صحبت کا موقع مختصر ہی ملا لیکن خواجہ عبد اللہ شیخ کی صحبت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ خود بیان کرتے ہیں:۔

"اگر من خرقانی را نمی دیدمی حقیقت ندانستمی، ہموارہ این بآں می آمیختمی یعنی نفس با حقیقت .... وی پیر من است، بہ یک سخن گفت: اینکہ می خندمی خسپد چیزے دیگر است، مرا بہ وی پس ازیں ہیچ چیز نماند کہ علم حقیقت مرا دیدہ و دانستہ شد۔" (نفحات الانس جامی)

خواجہ عبد اللہ نے جب شیخ خرقانی سے ملاقات کی تو موخر الذکر بہت ضعیف ہو چکے تھے، چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے (۴۲۵ھ) اور اس وقت ان کی عمر تقریباً اسی سال کی تھی، جس چیز نے خواجہ انصار کو ان کی صحبت سے بہت زیادہ متاثر کیا اور ان میں شور و وجد کی کیفیت پیدا کی وہ یہ تھی کہ خرقانی نے ایک نگاہ میں خواجہ کے اعماقِ قلب کو پہچان لیا تھا اور ان سوالوں کے جواب دیدیے تھے جنھیں خواجہ لب پر بھی نہیں لائے تھے

خواجہ انصار نے شیخ خرقانی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ خرقانی کا دیدار صرف انھیں اربابِ سلوک کے لیے سودمند ہے جنھوں نے طریقت کے چند منازل طے کر لیے ہیں، اور جو لوگ تازہ مرید ہوئے ہیں ان کے لیے بہتر ہے کہ شیخ محمد قصاب آملی کی صحبت سے اکتسابِ فیض کریں، شیخ خرقانی کی صحبت نے جو تاثیر خواجہ انصار کے قلب پر پیدا کی اسکا اظہار خود خواجہ کے اس قول سے ہوتا ہے:

"عبداللہ (شیخ ہرات) مردی بود بیابانی میرفت بطلب آب زندگانی ناگاہ رسید

بابوالحسن خرقانی چندان کشید آب زندگانی کہ نہ عبداللہ ماند و نہ خرقانی (دیوان انصاری)"

شیخ ابوالحسن خرقانی سے رخصت ہو کر پیر ہرات اپنے شہر کو واپس آئے، لیکن ایک بات کا سخت افسوس تھا کہ رے[1] میں ناسازگار حالات کی وجہ سے شیخ ابو حاتم ابن خاموش سے ملاقات نہیں کر سکے تھے، اس رنج کو مٹانے کے لیے انھوں نے پھر رے کا سفر کیا، جب شہر کے نزدیک پہنچے تو راستے میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو اسی شہر کا باشندہ تھا، اس نے خواجہ ہرات سے ان کا مذہب دریافت کیا، خواجہ نے جواب دیا کہ میں حنبلی ہوں، اس نے کہا کہ میں نے اس مذہب کا نام آج تک نہیں سنا تھا، تم ضرور بدعتی ہو، یہ کہہ کر ان کا کپڑا پکڑ لیا اور بولا جب تک میں تمھیں شیخ ابو حاتم کے پاس نہیں لیجاؤں گا تمھیں نہیں چھوڑوں گا، خواجہ نے کہا ضرور میں نے انہی کے دیدار کے لیے سفر کی زحمت اٹھائی ہے، چنانچہ دونوں شیخ ابن خاموش کے پاس پہنچے جو اس وقت ایک بڑی مجلس میں درس دے رہے تھے، اس مرد نے شیخ کو حال کہہ سنایا، خواجہ انصاری کی حیرت کی انتہا نہ رہی جبکہ شیخ نے جواب میں کہا :

"او را بہل، ہر کس حنبلی نباشد مسلمان نیست۔"

اس جملے سے شیخ کا مطلب یہ تھا کہ حنبلی قرآن و حدیث میں یقین واثق رکھتے ہیں اور انکے خلاف کوئی چیز ماننے کو بدعت سمجھتے ہیں، چونکہ ہر مسلمان کا قرآن و حدیث سے متمسک ہونا ضروری ہے۔

---

[1] ۴۲۰ھ میں سلطان محمود غزنوی نے رے فتح کیا تھا، اس وقت اس شہر میں باطنیوں، معتزلیوں اور دیگر ملحدین کی کثیر تعداد تھی، سلطان نے متعدد باطنیوں کو دار پر چڑھا دیا، معتزلیوں کو شہر بدر کر دیا، ان کی حکمت و ستارہ شناسی کی کتابیں جلادی گئیں، سلطان نے ابو حاتم کو شہر رے میں اس غرض سے متعین کیا تھا کہ وہ مسافروں اور اجنبیوں کے عقائد پر نگاہ رکھے تاکہ اس شہر میں ملحدین پھر نہ داخل ہو جائیں۔

نہ ہر مسلمان حنبلی ہے،

خواجہ ہرات شیخ ابو حاتم کی پذیرائی سے بہت خوش ہوئے اور چند دن انکی خدمت میں رہ کر ہرات کی طرف واپس ہوئے، راہ میں ایک بار پھر نیشاپور میں اپنے دوست ابن باکویہ کے یہاں مقیم ہوئے اور اس موقع پر شیخ ابو سعید ابن ابوالخیر سے بھی ملاقات کی' ابن باکویہ نے خواجہ انصار کو مشورہ دیا کہ اب وہ اس لائق ہوگئے ہیں کہ ارشاد و ہدایت کا سلسلہ شروع کریں چنانچہ پیر ہرات نے اپنے دوست کے مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا، اور ہرات واپس آکر وعظ و تدریس کی مجلسیں قائم کیں، انھوں نے کتابوں کے مطالعے اور استادوں کی تعلیم سے علم و معرفت کا جو سرمایہ اکٹھا کیا تھا، بزرگانِ کبار اور مشائخ نامدار کی صحبت و گفتار سے جو فیوض و برکات حاصل کیے تھے اور مسافرتوں میں تجربات و مشاہدات کے جو جواہر ریزے اپنے دامن میں سمیٹے تھے، ان سب کی روشنی میں تشنگانِ علم و معرفت کی سیرابی و رہنمائی کا کام اپنے ذمے لے لیا، ان کی مجلسیں شیخ عمو کی خانقاہ میں منعقد ہوتی تھیں، ابتدا میں ان مجالس میں شرکا کی تعداد مختصر تھی لیکن جب ان کے انداز گفتگو اور طرز تعلیم کی شہرت پھیلنے لگی تو سامعین کا مجمع روز بروز بڑھنے لگا، ان کے سامعین میں ایک شخص اسمٰعیل چشتی تھے، جو خواجہ کی بڑی تعظیم و خدمت کرتے تھے، اسمٰعیل چشتی اپنے بڑے بھائی احمد چشتی کو جو پیر سال خوردہ تھے، خواجہ کے پاس لائے، احمد چشتی فرقہ ملامتیان سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود شریعت کے معاملے میں کسی قسم کی سستی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، خواجہ عبداللہ نے ان کی بڑی تعریف کی ہے، اور جامی نے اس سلسلے میں ایک واقعہ نفحات الانس اور مناقب میں نقل کیا ہے، وہ یہ کہ ایک دن جب خواجہ عبداللہ بازار سے گذر رہے تھے، دیکھا کہ احمد چشتی اور بوسعید معلم مرید و مراد کی فضیلت کا مقابلہ کررہے ہیں اور اس ضمن میں

مباحثہ و مناظرہ میں مشغول ہیں کہ ایا سالک کو یہ لازم ہے کہ خود خالانہ جستجو میں لگ جائے یا طلب و تلاش کو چھوڑ کر عطا کی امید میں رہے۔ جب دونوں نے خواجہ ہرات کو دیکھا تو بولے لو عالم آگیا، متنازعہ فیہ مسئلے کو خواجہ سے بیان کیا۔ انھوں نے فی البدیہہ جواب دیا:

"لاعین ولا مراد، ولا خبر ولا عیان ولا حد ولا رسم۔ وھو الکل بالکل۔"

یعنی یہ کہ نہ مرید ہے نہ مراد، نہ خبر و جستجو ہے خبر، نہ حد و نہ رسم بلکہ سب خداوند تعالیٰ ہے اور بس۔

بو سعید معلم تو ناراض ہو کر وہاں سے چل دیا لیکن احمد چشتی خواجہ کے جواب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے پاؤں پر گر پڑے اور اس جوان کے تلووں سے اپنے سفید بال ملنے لگے۔ خواجہ انصار کے سوانح نگار، فرانسیسی پادری واسکارسرژ دی بورکوئی کا خیال ہے کہ خواجہ نے یہ بات اس لیے نہیں کہی کہ وہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھتے تھے، بلکہ ان کا مقصد دو صوفیوں کے مابین ایک بحث بے پایاں کا خاتمہ کرنا تھا۔ ان کے قول کا مفہوم یہ تھا کہ ہمارا مطلوب و معبود خداوند تعالیٰ ہے اور بس۔

۴۲۵ھ کے موسم سرما میں بناذان[2] میں صوفیوں کی ایک انجمن منعقد ہوئی، خواجہ ہرات بھی اسمٰعیل چشتی کے ساتھ وہاں گئے، اس انجمن میں باسٹھ[62] مشائخ جمع ہوئے تھے، ان میں سے ہر ایک کا سن پیر ہرات سے بیشتر تھا۔ ان سب میں پیر ہرات ہی کمسن و جوان تھے لیکن ان کی تقریر میں اتنی دلکشی تھی کہ سب کے سب ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور ان کی باتوں کو غور سے سنتے تھے۔ اس انجمن کے جلسے چالیس[40] روز تک جاری رہے، ان میں خواجہ راز حقیقت بیان کرتے تھے، وہ اسرار حقیقت جنھیں شیخ ابوالحسن خرقانی نے ان پر منکشف کیا تھا۔ انکے بیانات

---

[1] S. de Beaurecueil [2] بناذان جسکا قدیم نام نوآباذان تھا اور آجکل جسے نوابادان کہتے ہیں تو ابع ہرات کا ایک قریہ ہے جو ہرات سے تقریباً پندرہ کیلومیٹر دور مشرق میں واقع ہے۔

کا حاضرین پہ اثر ہوتا تھا کہ وہ عالمِ وجد میں رقص کرنے لگتے تھے۔ سماع کی ان مجلسوں میں خود خواجہ پر شوریدگی و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی لیکن خواجہ نے یہ محسوس کیا کہ بجائے اسکے کہ وہ عظمتِ ربّانی کی طرف متوجہ ہوں صوفیان مجلس زیادہ تر خواجہ کی حالتِ وجد و شوریدگی کے دلدادہ ہونے لگے ہیں، خواجہ اس خوف سے کہ مبادا ان سے ناخواستہ و نادانستہ طور پر شرک سرزد ہو جائے بہت محتاط ہو گئے اور بناذان سے جلد ہرات واپس آگئے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ خواجہ انصار سماع کے مخالف نہیں تھے، کیونکہ صوفیان بزرگ مثلاً ذوالنون مصری، شبلی سماع کو جائز سمجھتے تھے، البتہ خواجہ انصار نے سماع پر بہت سے قیود عائد کر دیے تھے تاکہ اس میں کوئی احتمال شرک کا نہ ہو۔

ہرات واپس آکر خواجہ عبداللہ پھر مجالس و محافل میں تذکیر و تدریس وارشاد و ہدایت میں مشغول ہو گئے لیکن بناذان میں اقامت کے دوران میں انھوں نے صوفیانِ بزرگ کی شوریدگی کا جو حال دیکھا تھا اس کی وجہ سے ان کے دل میں تصوف کی طرف سے خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اس لیے تعلیم طریقت کو ترک کر کے زیادہ توجہ تدریس حدیث کی طرف منعطف کر دی تھی، انھوں نے اپنے شاگردوں کو یہ ہدایت کی کہ منازلِ طریقت کو تدریجاً طے کرنا چاہیے کیونکہ راہ سلوک دراز و محنت طلب ہے۔

۴۳۰ھ میں اسمٰعیل و احمد چشتی نے خواجہ انصار کو چشت آنے کی دعوت دی، یہ قریہ ہرات سے ساٹھ روز کی راہ پر مشرق کی جانب واقع ہے، اور ان دنوں اہلِ تصوف کا ایک ممتاز مرکز تھا، وہاں شیخ ابو احمد ابدال اور ان کے فرزند ابو محمد کی زیارت و صحبت سے خواجہ کے دل میں بناذان کی ہیجان انگیز و پُرشور مسافرت میں صوفیوں کی طرف سے

جو گرہ پڑ گئی تھی اس کا مداوا ہو گیا، اور وہ چشت کے صوفیوں کے دیدار سے بہت خوش واپس آئے، خصوصاً ابو یوسف ابن محمد سمعان (متوفی ۴۶۵ھ) سے بہت متاثر تھے اور اپنی مجلسِ تدریس میں ان کی ستائش کرتے تھے۔

یہاں عہد خواجہ کے مذہبی ماحول اور سیاسی حالات کا تھوڑا سا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کی آئندہ زندگی کے واقعات ان سے بہت حد تک وابستہ ہیں،

پیر ہرات کے زمانے میں باطنیوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں، معتزلہ اور اشاعرہ بھی اپنے عقائد کی تبلیغ میں مصروف تھے، وہ جس طرح کلام اللہ اور احادیث نبوی کی تشریح و تفہیم کرتے تھے اس سے دینِ اسلام سخت خطرے میں پڑ گیا تھا، ان کی تبلیغات و تالیفات سے اسلامی روح پر ضرب کاری پڑ رہی تھی، ہرات میں ان اہل بدعت کا غلبہ بڑھتا ہی جا رہا تھا، اوپر کی سطور میں بیان ہو چکا ہے کہ جب سلطان مسعود غزنوی سریر سلطنت پر بیٹھا تو اس نے ان بدعتیوں کے ساتھ برا سلوک کیا، جس سے خواجہ عبداللہ انصاری کو بہت اطمینان ہو گیا تھا، کیونکہ وہ اہل بدعت کے سخت مخالف تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ معتزلیوں اور اشاعرہ نے اپنی تعریفات اور تاویلات عقلی سے کلام مقدس کے غلط معنی نکالے ہیں، وہ مجالس و محافل میں بدعتیوں کے خلاف تقریر کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے معتزلہ اور اشاعرہ ان سے بہت ناراض ہو گئے تھے اور ان سے انتقام لینے کی فکر میں تھے، چنانچہ ۴۳۰ھ میں انھوں نے سلطان مسعود غزنوی سے جب وہ مہم سلطنت کے سلسلے میں ہرات آیا ہوا تھا خواجہ انصار کے خلاف یہ شکایت کی کہ وہ بت پرست ہیں، خداوند تعالیٰ کو اوصاف انسانی سے متصف کرتے ہیں، سلطان نے خواجہ ہرات کو دربار میں طلب کیا اور ان سے پوچھا تم نے ہی یہ کہا ہے کہ خدائے عزوجل آگ میں قدم رکھتے ہیں؟ خواجہ نے سلطان کو درازیِ عمر کی دعا دے کر

جواب دیا "خدائے عزوجل کو آگ سے ضرر نہیں پہنچتا ہے اور نہ آگ اسے ضرر پہنچا سکتی ہے، پیغمبر اسلامؐ خدائے عزوجل کے بارے میں غلط نہیں کہتے اور ان کی امت کے علما جو کچھ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، اس کی سند کلام اللہ سے دیتے ہیں، اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرتے"۔ خواجہ ہرات کے جواب سے سلطان کی تشفی ہوگئی اور اس نے ان کو عزت و احترام کے ساتھ دربار سے رخصت کیا۔ اس طرح دشمنانِ خواجہ کی پہلی کوشش ان کو نقصان پہنچانے کی ناکام ہوگئی۔

ادھر سلجوقیوں کے پے بہ پے تاخت و تاراج سے سلطنت غزنوی سخت مصیبت میں مبتلا تھی، سلطان مسعود غزنوی کی مدافعانہ کارروائیوں کے باوجود سلجوقی تدریجاً اپنا اثر و غلبہ سلطنت کے مختلف حصوں میں قائم کرتے جارہے تھے، ایک ایک شہر و قصبہ سلجوقیوں کے قبضے میں آتا جارہا تھا، یہاں تک کہ وہ ہرات میں بھی داخل ہوگئے، سلجوقیوں کے ترکتاز سے تمام علاقوں میں قحط نمودار ہوگیا تھا، سلطان مسعود نے سلجوقیوں کو یہ پیغام بھیجا کہ اس کے ہرات آنے تک لوٹ مار سے دست بردار رہیں، سلجوقیوں نے سلطان کی تجویز منظور کرلی اور وہ ۴۳۰ھ میں ہرات پہنچا اور یہاں سے لشکریوں کو آذوقہ و علف فراہم کرنے کے لیے اطراف میں روانہ کیا، سلطان نے ہرات میں تین ماہ توقف کیا اور اس عرصے میں خوب عیش و نشاط کی محفل گرم کی، اسی زمانے میں اس نے خواجہ انصاری کو دربار میں بلاکر ان کے اعتقادِ تجسیم کے بارے میں سوال کیا تھا، سلجوقیوں نے اپنی سرگرمیاں پھر تیز کردیں، ان کو روکنے کی جتنی تدبیریں کی گئیں سب بے سود ثابت ہوئیں، سلطنت غزنوی کا آخری دور آچکا تھا، خود سلطان مسعود کی موت کے دن قریب آچکے تھے، وہ خراسان کو دوبارہ فتح کرنے کی فکر میں تھا، لیکن ماہ جمادی الاولی ۴۳۲ھ میں

اس کے بھتیجوں نے اسے قتل کر ڈالا، اس کے بعد سے غزنویوں کی بساط سلطنت ہمیشہ کے لیے الٹ گئی۔

سلطنت غزنوی کے ضعف و زوال کے وقت ملک میں جو انتشار و خلفشار رونما ہوا اس کے اثر سے اہل ہرات بھی محفوظ نہ رہ سکے، آب و دانہ کی کمی و نایابی کی مصیبتوں میں وہ بھی مبتلا ہوئے، پہلی مرتبہ جب سلجوقی ہرات میں داخل ہوئے تو بعض بزرگان شہر نے ان کا مجبوراً خیر مقدم کیا تھا، جب سلطان مسعود غزنوی نے اس پر دوبارہ تسلط حاصل کیا تو ایسے لوگ جنھوں نے سلجوقیوں کا خیر مقدم کیا تھا، سلطان کے قہر و غضب کا شکار ہوئے، اگرچہ خواجہ عبداللہ نے خود کو سیاست سے بالکل الگ تھلگ رکھا تھا لیکن اپنے ہموطنوں کی مصیبتوں سے بہت آزردہ خاطر تھے، اُدھر ان کے دشمن بھی ان کے آزار کے درپے تھے، ان کی سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ ہرات کو مجالس میں تقریر کرنے سے روک دیا، اور شہر ہرات چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، یہ واقعہ ۴۳۳ھ میں رونما ہوا، خواجہ ہرات شکیوان چلے گئے، شکیوان توابع ہرات کا ایک قریہ ہے، دو سال اسی مقام پر مقیم ہو کر تصنیف و تالیف میں وقت صرف کیا، اس کے علاوہ کئی اور مقامات کی بھی مسافرت کی۔

(باقی)

یہود اور قرآن مجید

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

انبیاء کی تکذیب اور قتل یہود کی اصلاح و ہدایت کے لیے خدا نے بیشمار انبیاء مبعوث کیے مگر انھوں نے ان کی نافرمانی کی، خود حضرت موسیٰؑ کو بھی دق کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، جب انھوں نے کہا کہ اللہ نے تم کو قربانی کا حکم دیا ہے تو انھوں نے سوالات کی بوچھار کردی اور سخت لیت ولعل کے بعد اس کی تعمیل کے لیے آمادہ ہوئے[۱]، شام میں داخل ہونے اور بیت المقدس فتح کرنے کا حکم دیا تو نہایت دیدہ دلیری کیساتھ بولے "تو اور تیرا خدا جاکر لڑ بھڑ، ہم اپنی جانوں کو جوکھم میں نہ ڈالیں گے[۲]"، یہود کی ان دلآزار حرکتوں سے تنگ آکر ان کو کہنا پڑا:

يَا قَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِي وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ (صف: ۵)	اے میری قوم کے لوگو! کیوں مجھکو اذیتیں دیتے ہو درانحالیکہ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری جانب اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔

مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ "تم ان کا رویہ نہ اختیار کرنا جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کو اذیتیں اور تکلیفیں دیں[۳]"۔

---

۱ بقرہ: ۷۱ ۲ مائدہ: ۲۱ تا ۲۴ ۳ احزاب: ۶۹

وہ حضرت موسیٰؑ پر بے چون وچرا ایمان لانے کے بجائے ان سے اس قسم کا گستاخانہ مطالبہ کرتے تھے کہ "اے موسیٰ ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ اللہ کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں"[1]۔ ایک اور موقع پر بھی ان کے اس نامعقول مطالبہ کا ذکر کیا گیا ہے[2]۔

حضرت سموئیلؑ کے ساتھ بھی ان کی گستاخی اور شرارت کا سورۂ بقرہ میں ذکر ہے[3]، دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کی نافرمانی اور تکذیب بلکہ بعض کو قتل کرنے کی بھی قرآن نے صراحت کی ہے، اور بڑے درد کے ساتھ کہا ہے:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا	تو کیا جب جب تمہارے پاس کوئی رسول
لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ	وہ باتیں لیکر آئیگا جو تمہاری خواہشوں کے
فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا	خلاف ہوں گی تو تم تکبر کروگے سو تم نے ایک
تَقْتُلُوْنَ (بقرہ: ۸۷)	گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے

سورۂ مائدہ میں پھر ان کی اس افسوسناک روش کا ذکر ہے[4]، اسی جرم کی پاداش میں ان سے اللہ کی نعمت و ہدایت بھی چھین لی گئی اور وہ اس کے غیظ و غضب کا نشانہ بھی بنے[5]۔

انھوں نے ان مجددین و مصلحین کی جو انھیں نظامِ حق و عدل پر قائم رہنے کی دعوت دیتے تھے، مخالفت ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ قتل کی بھی کوشش کرتے تھے، فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ	بیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار اور
اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ	نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور
حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ	ان لوگوں کو بھی قتل کرتے رہے ہیں جو عدل
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ	و انصاف کا حکم دیتے تھے ان کو ایک دردناک

---

[1] بقرہ: ۵۵ [2] نساء: ۱۵۳ [3] بقرہ: ۲۴۶ تا ۲۴۸ [4] مائدہ: ۷۰ [5] بقرہ: ۶۱

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (آل عمران: ۲۱) عذاب کی خوشخبری سنا دو،

قرآن مجید نے متعدد مواقع پر ان باتوں کو دہرایا ہے اور ان کے مظالم کے دلخراش واقعات بیان کیے ہیں،[1]

عہد عتیق وجدید کے نوشتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہود کے ہاتھ انبیاء وصلحاء کے خون ناحق سے رنگے ہوئے ہیں، وہ حضرت زکریاؑ یحییٰؑ، یرمیاہ اور یسعیاہ کے قتل اور حضرت عیسیٰؑ کے اقدام قتل کے مرتکب ہوئے، اس سلسلہ میں چند شہادتیں ملاحظہ ہوں:

"تمھاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمھارے نبیوں کو کھا گئی ہے" (یرمیاہ، ۲: ۳۰)

"وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھرا لائیں قتل کیا اور انھوں نے کاموں سے تجھے غصہ دلایا۔" (نحمیاہ ۹: ۲۶)

انجیل میں ہے:۔

"تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں..... دیکھو میں نبیوں، داناؤں اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤگے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے ماروگے اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا، تم پر آئے، اے یروشلم اے یروشلم تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ہیں انھیں سنگسار کرتی ہے۔" (متی ۲۳: ۲۹، ۳۱ تا ۳۴، ۳۵، ۳۷)

عدل وقسط کے علمبرداروں کے ساتھ انکا رویہ ملاحظہ ہو:۔

"وہ اس سے کینہ رکھتے ہیں جو دروازہ پر سرزنش کرتا ہے اور وہ اس سے نفرت رکھتے ہیں

---

[1] کہف: ۹ تا ۱۷، و بروج: ۴ تا ۸

جو حق بات کہتا ہے۔" (مومن ۵: ۱)

انبیاء کے باب میں افراط و تفریط یہود افراط و تفریط میں مبتلا تھے، ایک طرف عقیدت میں غلو کا یہ حال تھا کہ حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا مانتے تھے، دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ اتنا گھٹا دیا تھا کہ تمام انسانوں سے بھی کمتر نظر آتے تھے، وہ خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے تھے، اور حضرت موسیٰؑ کے سوا کسی اور نبی کو صاحب دعوت و شریعت نہیں سمجھتے تھے، علامہ شہرستانی فرماتے ہیں:۔

"یہود کا خیال ہے کہ شریعت بس ایک ہی ہے اور اس کی ابتدا و انتہا دونوں حضرت موسیٰؑ پر کی گئی ہے، ان سے پہلے چند حدود و احکام نازل کیے گئے تھے۔۔۔۔۔۔ اور ان کے بعد کوئی دوسری شریعت نہیں ہو سکتی۔"[1]

حضرت مسیحؑ کو وہ سرے سے نبی ہی نہیں مانتے تھے بلکہ ان پر تورات میں تحریف کا الزام بھی عائد کرتے تھے، شہرستانی کا بیان ہے:۔

"یہود حضرت مسیحؑ کی اطاعت نہیں کرتے، ان کے نزدیک ان کی حیثیت صرف اس قدر تھی کہ وہ حضرت موسیٰؑ اور تورات کی اتباع کریں مگر انھوں نے اپنے منصب سے تجاوز کر کے تورات میں تغیر و تبدل کر دیا جیسے سنیچر کے بجائے اتوار کو مقدس دن قرار دیا، خنزیر کو جسے تورات نے حرام قرار دیا تھا، حلال کر دیا، اسی طرح ختنہ اور غسل کے متعلق بھی تورات کے احکام بدل دیے۔"[2]

ان کو نعوذ باللہ ساحر و کذاب اور ولد الزنا کہا اور ان کی ماں کو بدچلن قرار دیا۔[3]

قرآن مجید نے ان کی افترا پردازی کی پرزور تردید کی اور حضرت مریمؑ کی عفت و پاکدامنی کا اعلان کیا اور حضرت مسیحؑ کے بارہ میں تصریح کی کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں جو شریعت موسوی

۱؎ الملل والنحل ج ۲ ص ۴۹ ۲؎ ایضاً ص ۴۸ ۳؎ الجواب الصحیح ج ۱ ص ۲۳ و ۲۴۳)

یل اور تطہیر کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔[1]

ری نبی سیدنا محمد عربی علیہ الف الف تحیۃ کے ساتھ بھی یہود نے نافرمانی اور تکذیب
کیا، حالانکہ آپ پر ایمان لانے کا ان سے پختہ عہد لیا گیا تھا۔[2] وہ اس خام خیالی
تھے کہ اپنی چالبازیوں سے خاتم النبیینؐ کے مشن کو ناکام بنا دیں گے لیکن اللہ نے فرمایا:

ذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ	جو لوگ اس رسول و نبی امی کی اتباع کرینگے
مِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا	جسے وہ اپنے یہاں توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا
دَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ	پاتے ہیں، وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور
رُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ	برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ	چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو
یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ	حرام اور ان پر سے ان کا بوجھ اور بیڑیاں
هُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ	اتارتا ہے، سو جو لوگ اس پر ایمان لائے
نَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اسکی عزت کی، اس کی مدد کی اور اس روشنی
ہٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا	کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری
نُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ	گئی ہے تو یہی لوگ فلاح پانے والے
مُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف: ۱۵۶، ۱۵۷)	ہیں۔

ی اسرائیل کے صحیفوں میں بھی نبی آخر الزمانؐ کی واضح پیشین گوئیاں موجود ہیں، انکے
ان کی آمد کی اس طرح بشارت دی تھی:۔

اور خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے

---

[1] ران: ۴۵ و ۴۸ تا ۵۰ [2] ایضاً: ۸۱ - ۸۲

میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھرنا، اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا، میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔" (استثنا: باب ۱۸: ۱۵، ۱۹)

"خدا سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔" (ایضاً ۳۳ : ۲)

"یہوداہ سے ریاست کا عصا جدا نہ ہوگا اور نہ حاکم اس کے پاؤں سے جاتا رہے گا، جب تک کہ وہ نہ آیا جو بھیجا جانے والا ہے اور قومیں اس کے پاس اکٹھی ہونگی۔" (پیدائش ۴۹: ۱۰)

زبور میں ہے :۔

"میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا پس سارے لوگ ابدالآباد تیری ستائش کریں گے۔" (زبور ۴۵: ۱۷)

یسعیاہ نبی فرماتے ہیں :۔

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے، میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا..... زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا، جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں۔" (یسعیاہ : ۴۲)

انجیل میں ہے :

"یسوع نے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا

دیا گوشے کے سر کا پتھر ہو گیا، یہ خداوند کی طرف سے ہوا، اور ہماری نظر میں عجیب ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی، اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" (متی: ۲۱ - ۴۲-۴۴)

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے...... جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے، تو وہ میری گواہی دیگا۔" (یوحنا: ۱۴، ۱۵، ۱۶)

امام الانبیاء حضرت ابراہیمؑ نے بھی اس نبی اور امت مسلمہ کے ظہور کی خدا سے دعا کی تھی، اس نبی آخر الزمانؐ پر ایمان لانے کی سب سے زیادہ امید اہل کتاب سے تھی، اور وہ آپؐ کی بعثت کے منتظر تھے، اور کفار و مشرکین سے کہتے تھے کہ "عنقریب خدا ایک نبی بھیجے گا، ہم اس کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں گے۔" وہ خدا سے دعا کرتے تھے کہ "نبی امی آئے تاکہ ہم اس کی پیروی کر کے ان کفار پر غلبہ حاصل کریں۔" قرآن میں ہے:

وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ — اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں
عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا (بقرہ: ۸۹) — فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے،

ابو العالیہؒ سے روایت ہے کہ یہود جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مشرکین پر فتح مانگتے تھے تو یہ کہتے تھے کہ "خدایا اس نبی کو بھیج جسے ہم اپنے ہاں لکھا پاتے ہیں تاکہ مشرکین پر غالب آئیں اور انھیں قتل کریں[1]۔"

اسی لیے صلحائے اہل کتاب کے گروہ نے رسول اللہؐ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور جب

---

[1] التوسل والوسیلہ ابن تیمیہ ص ۱۳۶ - ۱۳۷ ؛ ۱۲۸

اس کو آپ کی بعثت و دعوت کی خبر ہوئی تو اس نے ایمان لانے میں پیش قدمی کی، قرآن نے اس گروہ کی جگہ جگہ ستایش کی ہے، آپ پر جب پہلی بار وحی نازل ہوئی اور آپ پریشان ہوئے تو آپ کی غمگسار بیوی حضرت خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، انھوں نے آنحضورؐ کی باتیں سنکر فرمایا "یہ تو وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آتا تھا، کاش مجھے آپ کا زمانہ ملتا تو میں آپ کی پوری مدد کرتا۔" حبشہ کے عیسائی بادشاہ نے قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کہا "یہ اور حضرت موسیٰؑ کی وحی ایک ہی چراغ کا پرتو ہیں[۱]" خود مشرکین عرب میں سے بعض لوگوں کے ایمان لانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہود سے رسول اکرمؐ کا ذکر سنتے آئے تھے، عاصم بن عمر قتادہ انصاری سے روایت ہے کہ "خدا کی رحمت و ہدایت کے ساتھ منجملہ اور باتوں کے جس بات نے ہمیں اسلام کی طرف راغب کیا ایک یہ تھی کہ ہم مشرک اور بت پرست تھے، اور یہودی اہل کتاب ہم سے زیادہ علم والے تھے، ہم میں ان میں دشمنی چلی آتی تھی، جب کبھی ہم انھیں نیچا دکھاتے تو وہ ہم سے کہتے یاد رکھو ایک نبی کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا، وہ آتا ہے، ہم اس کے ساتھ ہوں گے اور تمھیں عاد و ثمود کی طرح قتل کر ڈالیں گے، یہ ہم ان سے اکثر سنا کرتے تھے، چنانچہ اللہ نے محمدؐ کو اپنا خاص رسول بنا کر بھیجا، اور آپ نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا، تو ہم نے فوراً لبیک کہا، کیونکہ ہم جان گئے کہ یہودی ہمیں اسی نبی کے بل بوتے پر ڈرایا کرتے تھے، چنانچہ ہم نے پیش قدمی کی اور ان پر ایمان لائے مگر خود انھوں نے اس کا انکار کر دیا[۲]۔"

لیکن یہ یہود اور اہل کتاب کا ایک قلیل گروہ تھا جس نے اللہ کے عہد و میثاق پر قائم رہ کر حق پسندی سے کام لیا، مگر ان کی اکثریت کا حال اس کے بالکل برعکس تھا،

---

[۱] الجواب الصحیح ابن تیمیہ ج ۱ ص ۲۵ [۲] التوسل والوسیلہ ص ۱۳۷ - ۱۳۸

انھوں نے نبی موعود کے آنے کے بعد ضد، ہٹ دھرمی، حسد اور نسلی و خاندانی گھمنڈ کی بنا پر ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، وہ آپ پر ایمان لانے کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے تراشتے اور عجیب و غریب شرطیں عائد کرتے، کہتے

اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا	خدا نے ہمیں وصیت کی ہے کہ ہم اس
نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا	وقت تک کسی رسول پر ایمان نہ لائیں
بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ	جب تک وہ ایسی قربانی نہ پیش کرے
(آل عمران: ۱۸۳)	جس کو آگ کھا جائے۔

یہی نہیں کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کیا بلکہ خم ٹھوک کر آپ کے مقابلہ میں آگئے اور آپ کی مخالفت میں پورا زور لگا دیا، آپ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں، قریش کے لیڈروں کو اکسایا اور انکی پیٹھ ٹھونکی، مختلف جنگوں پر ان کو آمادہ کرنے والے یہی لوگ تھے، خود مسلمانوں میں نفاق کی تخم ریزی کرکے منافقین کو آپ کے خلاف ورغلانے والے یہی لوگ تھے، غزوۂ بدر میں قریش کو اشتعال دلانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے، بعض جنگوں مثلاً احد اور خندق میں تو وہ کھل کر میدان میں آگئے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں مشرکین کے پوری طرح پشت پناہ بن گئے، غرض آپ کی اور مسلمانوں کی عداوت اور دلآزاری میں یہ لوگ مشرکین ہی کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر تھے، جیسا کہ قرآن نے جا بجا صراحت کی ہے[1]۔

خدا کی کتابوں کا انکار و تکذیب | یہود خدا کی کتابوں کے بھی منکر ہو گئے تھے اور اپنے صحیفہ توراۃ کے احکام و ہدایات کو بھی پس پشت ڈال کر اوہام و خرافات میں پڑ گئے تھے جس کی تفصیل سے

---

[1] ملاحظہ ہو مائدہ: ۸۲ و آل عمران: ۱۸۶

ذکر ہو چکا ہے، حالانکہ ان سے تورات پر ایمان لانے اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا اللہ نے عہد لیا تھا لیکن وہ اس عہد و پیمان سے منحرف ہو گئے اور اول روز ہی سے توراۃ کی تعلیم و ہدایت کی خلاف ورزی کرنے لگے تھے[1]، توراۃ میں بھی اس عہد کا ذکر ہے:۔

"وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا پر زیر و بالا دھواں تھا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور شعلہ کا سا دھواں اس پر اٹھتا اور پہاڑ سراسر ہل گیا" (خروج: ۱۹: ۱۷-۱۸)

اور اس میں عہد شکنی پر یہ سخت وعید بھی بیان ہوئی ہے:۔

"اور جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے کہ ان پر عمل کرے اس پر لعنت، سب جماعت کہے آمین" (استثنا ۲۷: ۲۶)

قرآن نے توراۃ کے انکار و تکذیب ہی کے سلسلہ میں یہود کی یہ مثال بیان کی ہے:۔

مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ	ان لوگوں کی مثال جو توراۃ کے حامل
ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ	بنائے گئے تھے مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے
يَحْمِلُ أَسْفَارًا ۚ بِئْسَ مَثَلُ	اس گدھے کی طرح ہے جس پر کتابیں لدی ہیں،
الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ	جو لوگ خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، انکی
اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ	کیا ہی بری مثال ہے، اور اللہ ظلم کرنے والوں
الظَّالِمِينَ (جمعہ: ۵)	کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

سورۂ اعراف میں بھی ان لوگوں کی تورات سے روگردانی اور احکام الٰہی سے سرتابی کی ایک تمثیل بیان کی گئی ہے[2]۔

قرآن نے ان کے سب سے بڑے جرم قتل انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ واقعی ان کا توراۃ

---

[1] بقرہ: ۶۳ و ۶۴ [2] اعراف: ۱۷۵-۱۷۶

پر ایمان ہوتا تو وہ اس سنگین جرم کے مرتکب نہ ہوتے[۱]، بڑی خرابی یہ تھی کہ ان کے پاس توراۃ کا کوئی صحیح اور مستند نسخہ باقی نہیں رہ گیا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں توراۃ کو مرتب کرا کے جس صندوق میں رکھوایا تھا[۲]، وہ اور توراۃ کے تمام نسخے چھٹی صدی قبل مسیح میں اس وقت جل کر خاک ہو گئے تھے، جب بخت نصر نے بیت المقدس میں آگ لگا دی تھی، اس کے دو صدی بعد حضرت عزیرؑ نے بنی اسرائیل کے کاہنوں اور لاویوں کے ساتھ ملکر اور آسمانی الہام کی مدد سے اس کو پھر از سر نو مرتب کیا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں توراۃ کے اصل الفاظ باقی نہیں رہے تھے، بلکہ یادداشت سے مفہوم لکھ لیا گیا تھا، مگر حوادث روزگار نے اس نسخہ کو بھی اپنی اصلی صورت پر باقی نہ رہنے دیا، سکندر اعظم کی عالمگیر فتوحات کے زمانہ میں جب یونانی علوم وفنون کی ترقی ہوئی تو ۲۸۵ ق م میں تورات کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ کا رواج باقی نہ رہا اور اسکے بجائے یونانی ترجمہ اور اس کے ترجمے دنیا میں رائج ہو گئے، اس حالت میں توراۃ کی جو شکل رہ گئی تھی وہ بھی علمائے یہود کی تحریفات اور تصرفات کا برابر نشانہ بنی رہی، قرآن مجید نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی اسی روش کا ذکر کیا ہے:

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ	کیا تم لوگوں کو امید ہے کہ یہ لوگ تمہاری بات
وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ	مان لیں گے، در انحالیکہ ان میں سے ایک
كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن	گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے پھر اسکو
بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ	سمجھ لینے کے بعد اس کی تحریف کرتا رہا ہے
(بقرہ: ۷۵)	اور وہ جانتے ہیں۔

علامہ شہرستانی لکھتے ہیں:۔

---

[۱] بقرہ: ۹۱ [۲] استثناء ۳۱: ۲۴-۲۶

"انھوں نے الفاظ کی لکھاوٹ اور صورت میں بھی تحریف و ترمیم کی تھی اور ان کی تاویل و تفسیر میں بھی"[1]

قرآن مجید نے یہود کی تحریفات کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں مثلاً

۱۔ وہ کتاب الٰہی میں بہت ساری باتوں کا اضافہ کر دیتے تھے، اور اس میں اپنے خود ساختہ احکام و قوانین اور من گھڑت اور طبع زاد فتوے شامل کر کے ان کو خدا کی جانب منسوب کرتے تھے، ارشاد الٰہی ہے:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ	پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے
بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا	ہاتھوں سے (طبع زاد) کتاب لکھتے ہیں اور
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ	دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ
ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ	اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل
اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ	کرلیں، سو ان کے لیے ہلاکت ہے اس چیز کے
(بقرہ: ۷۹)	سبب جو ان کے ہاتھوں نے لکھی ہے اور اس چیز کی جو وہ کماتے ہیں

قرآن نے ان کے الفاظ اور جملوں کے تلفظ میں توڑ مروڑ کا مقصد بھی یہی بتایا ہے کہ وہ لفظوں کی ادائیگی اور ان کے پڑھنے کا ایسا ڈھنگ اختیار کرتے تھے جن سے ان کا مطلب خبط اور خدا کے حکم کی اصل حقیقت و غایت گم ہو جاتی تھی، اس طرح جو باتیں خدا کی طرف سے نہیں ہوتی تھیں ان پر اس کے نام کا لیبل چسپاں کر دیتے تھے،

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ	اور بیشک ان میں ایک گروہ اپنی زبان کو
اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ	کتاب الٰہی کے ساتھ توڑتا مروڑتا ہے تاکہ

---

[1] الملل والنحل جلد ۲

مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ	تم اس کو کتاب الٰہی کا حصہ سمجھو حالانکہ
وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	وہ کتاب الٰہی کا حصہ نہیں ہے اور وہ دعویٰ
وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُولُونَ	کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ
عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ	اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور وہ اللہ
(آل عمران : ۷۸)	پر جان بوجھکر جھوٹ باندھتے ہیں ۔

۲۔ اسی طرح وہ اپنی من مانی خواہشات کی تکمیل کے لیے

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهٖ	وہ (توراۃ کے) کلمات کو ان کے مواقع سے
وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ	ہٹاتے ہیں اور اس چیز کا ایک حصہ بھلا بیٹھے
(مائدہ : ۱۳)	جس کی ان کو یاددہانی کی گئی تھی ۔

وہ اپنے موافق احکام مان لیتے تھے لیکن جو بات مرضی کے خلاف ہوتی تھی اس سے روگردانی کرتے تھے ۔

يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هٰذَا فَخُذُوهُ	(مائدہ : ۴۱)	وہ کہتے اگر تمہارے معاملہ کا یہ فیصلہ ہو تو مان
وَإِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا		لینا اور اگر یہ نہ ہو تو اس سے احتراز کرنا

۳۔ وہ خدا کی کتاب میں تلبیس کر کے حق و باطل کو گڈمڈ کر دیتے تھے، قرآن نے اس نازیبا حرکت سے ان کو منع کیا اور فرمایا

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ	(بقرۃ : ۴۲)	جان بوجھ کر نہ حق کو چھپاؤ اور نہ حق کو
تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ		باطل کے ساتھ خلط ملط کرو ۔

۴۔ ان کی کوشش تھی کہ توراۃ کی بہت سی باتوں کو چھپا دیں تاکہ لوگ ان سے واقف نہ ہو سکیں اور ان کی خلافِ شریعت حرکتوں کا پردہ فاش نہ ہو سکے اور مسلمان انکے خلاف

حجت نہ پیش کرسکیں، ارشاد ربانی ہے :۔

وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا	اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تنہائی
اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ	میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم ان (مسلمانوں) [illegible]
لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ اَفَلَا	کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی
تَعْقِلُوْنَ (بقرہ : ۷۶)	ہیں کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کرسکیں

حالانکہ ان سے عہد لیا گیا تھا کہ کتمانِ حق سے پرہیز کریں، قرآن مجید نے اس عہد کو اس طرح یاد دلایا ہے

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ	اور یاد کرو جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ	عہد لیا کہ تم لوگوں کے سامنے کتاب کھول کر
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ	اچھی طرح بیان کرنا، اسے چھپانا مت تو انھوں
ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا	نے اس کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور اس کے
قَلِيْلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ	بدلے میں ایک حقیر قیمت لی، کیا ہی بری ہے
(آل عمران : ۱۸۷)	وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں۔

رسول اللہ کی بعثت کے مقاصد میں یہ بھی تھا کہ :

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا	اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول وہ
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ	بہت سی باتیں ظاہر کرنے کے لیے آگیا ہے
مِنَ الْكِتٰبِ (مائدہ : ۱۵)	جو تم کتاب کی چھپاتے ہو۔

سورۂ بقرہ میں قبلہ، حج اور قربانی وغیرہ کے سلسلہ کی بعض باتوں کے چھپانے کا ذکر کیا گیا ہے، (بقرہ : ۱۵۹)

نے ان پر آیات الٰہی کے اخفا وکتمان کا جو الزام عائد کیا ہے، اسکی تائید عہد نامہ
ے نوشتوں سے بھی ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:۔

اتیں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو سکھلا" استثناء: ۴۰-۹)

لیے میری ان باتوں کو تم اپنے دل اور اپنی جان میں محفوظ رکھنا اور نشان کے
ن کو اپنے ہاتھوں پر باندھنا اور وہ تمہاری پیشانی پر ٹیکوں کی مانند ہوں اور
لو اپنے لڑکوں کو سکھانا اور تو گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے وقت ان ہی
یا کرنا اور تو ان کو اپنے گھر کی چوکھٹوں اور اپنے پھاٹکوں پر لکھا کرنا" (استثناء-۱۱: ۲۱-۱۸)

یں ہے:۔

نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وہ اسے اپنی اولاد کو سکھلا دیں تاکہ آنے والی
ں وہ فرزند جو پیدا ہوویں سیکھیں اور وہ اٹھکر اپنی اولاد کو سکھلا دیں" (زبور: ۸)

یں ہے:۔

جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں، اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کہتے ہو کوٹھے پر
منادی کرو" (متی: ۱۰-۲۷)

نے تورات کے حصے اور بخرے کر ڈالے تھے، اور جس حصے کو چاہتے مانتے اور ظاہر کرتے اور
فی رکھتے اور رد کر دیتے، خدا نے انکی اس روش کا بڑے درد کے ساتھ ذکر کیا ہے:

مِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ — کیا تم کتاب الٰہی کے کچھ حصوں کو مانتے ہو
ؤنَ بِبَعْضٍ (بقرہ: ۸۵) — اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

نے توراۃ کو کتاب ہدایت اور دستور حیات بنانے کے بجائے اسے طرح طرح سے نفع اندوزی
تھا۔ قرآن نے اس طرز عمل پر ان کو سرزنش کی (بقرہ: ۴۱)، آیات الٰہی سے

حجت نہ پیش کرسکیں، ارشاد ربانی ہے :۔

وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (بقرہ : ۷۶)

اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم ان (مسلمانوں) کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کریں

حالانکہ ان سے عہد لیا گیا تھا کہ کتمانِ حق سے پرہیز کریں، قرآن مجید نے اس عہد کو اس طرح یاد دلایا ہے

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ (آل عمران : ۱۸۷)

اور یاد کرو جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا کہ تم لوگوں کے سامنے کتاب کھول کر اچھی طرح بیان کرنا، اسے چھپانا مت تو انھوں نے اس کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور اس کے بدلے میں ایک حقیر قیمت لی، کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں۔

رسول اللہ کی بعثت کے مقاصد میں یہ بھی تھا کہ :

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ (مائدہ : ۱۵)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول وہ بہت سی باتیں ظاہر کرنے کے لیے آگیا ہے جو تم کتاب کی چھپاتے ہو۔

سورۂ بقرہ میں قبلہ، حج اور قربانی وغیرہ کے سلسلہ کی بعض باتوں کے چھپانے کا ذکر کیا گیا ہے، (بقرہ ۱۵۹)

قرآن نے ان پر آیات الٰہی کے اخفاء وکتمان کا جو الزام عائد کیا ہے، اسکی تائید عہد نامۂ
م وجدید کے نوشتوں سے بھی ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:۔

"تو یہ باتیں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو سکھلا" استثناء : ۴۰ - ۹)

"اس لیے میری ان باتوں کو تم اپنے دل اور اپنی جان میں محفوظ رکھنا اور نشان کے طور پر ان کو اپنے ہاتھوں پر باندھنا اور وہ تمھاری پیشانی پر ٹیکوں کی مانند ہوں اور تم ان کو اپنے لڑکوں کو سکھانا اور تو گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے وقت ان ہی کا ذکر کیا کرنا اور تو ان کو اپنے گھر کی چوکھٹوں اور اپنے پھاٹکوں پر لکھا کرنا۔" (استثناء-۱۱: ۱۸-۲۰)

زبور میں ہے:۔

"اس نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وہ اسے اپنی اولاد کو سکھلا دیں تاکہ آنے والی پشت میں وہ فرزند جو پیدا ہوویں سیکھیں اور وہ اٹھکر اپنی اولاد کو سکھلا دیں۔" (زبور: ۸)

انجیل میں ہے:۔

"اور جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں، اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کہتے ہو کوٹھے پر اس کی منادی کرو۔" (متی: ۱۰ - ۲۷)

یہود نے تورات کے حصے اور بخرے کر ڈالے تھے، اور جس حصے کو چاہتے مانتے اور ظاہر کرتے اور
س کو چاہتے مخفی رکھتے اور رد کر دیتے، خدا نے انکی اس روش کا بڑے درد کے ساتھ ذکر کیا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ	کیا تم کتاب الٰہی کے کچھ حصوں کو مانتے ہو
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (بقرہ: ۸۵)	اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

انھوں نے توراۃ کو کتاب ہدایت اور دستور حیات بنانے کے بجائے اسے طرح طرح سے نفع اندوزی
ا ذریعہ بنا لیا تھا۔ قرآن نے اس طرز عمل پر ان کو سرزنش کی (بقرہ: ۴۱)، آیات الٰہی سے

نفع اندوزی اور حق فروشی کی ممانعت کا ذکر عہد نامۂ جدید میں بھی ہے :-

"یہ لوگ ناجائز نفع کی خاطر ناشائستہ باتیں سکھا کر گھر کے گھر تباہ کر دیتے تھے" (طیطس ۱: ۱۱)

جب ان کا اپنی کتاب توراۃ کے ساتھ یہ حال تھا تو وہ بھلا قرآن کو کیا خاطر میں لاتے، انھوں نے توراۃ میں تحریف وتلبیس اور اخفاء کا سارا کھیل اسی لیے تو کھیلا ہی تھا کہ قرآن اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کر سکیں اور اس میں ان دونوں کے متعلق جو واضح پیشین گوئیاں ہیں ان کو نظر انداز کر سکیں،

قرآن نے جب توراۃ کے بعض احکام کی اصلاح وتکمیل کی یا ان کو بدل دیا جیسے بیت المقدس کے بجائے خانۂ کعبہ کو قبلہ قرار دیا، سنیچر کے بجائے جمعہ کو محترم دن بتایا اور کھانے پینے کی چیزوں کی تحلیل وتحریم میں یہود نے جو بے اعتدالیاں کر رکھی تھیں ان کو ٹھیک کرنے کے لیے وہ احکام دیے جو ملت ابراہیمی کے اندر تھے، تو یہود نے اس کو قرآن کی مخالفت اور اس سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کا ایک بہانہ بنا لیا، اور کہا کہ ایک طرف تو یہ نبی توراۃ کو خدا کی کتاب مانتا ہے اور دوسری طرف اس کے احکام میں تبدیلیاں کرتا ہے، اگر یہ واقعی نبی ہوتے اور ان پر سچ مچ خدا کا کلام اترتا تو ہماری شریعت کے احکام میں تبدیلی نہ کرتے، مشرکین بھی یہود کے اس رٹائے ہوئے سبق کو دہراتے، قرآن نے ان دونوں کی مشترکہ مخالفت کا ذکر یوں کیا ہے :-

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (نحل: ۱۰۱)

اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت کو بدل دیتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ اتارتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے جی سے گھڑ لینے والے ہو، بلکہ ان میں کے اکثر نہیں جانتے ہیں۔

قرآن سے بدظن کرنے کے لیے وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کو فلاں شخص سکھاتا اور بتاتا ہے۔ (نحل: ۱۰۳)

یہود توراۃ وانجیل کی تعلیمات کو فراموش کرکے گوناگوں اختلافات میں پڑ گئے تھے، اس لیے اللہ نے ان کے اختلافات کے تصفیہ اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے قرآن مجید نازل کیا، مگر انھوں نے اس کی ناقدری کی اور اس سے روگرداں ہوگئے۔ (آل عمران: ۲۳)

وہ قرآن کی راہ ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت وگمراہی کا طریقہ اختیار کرتے اور مسلمانوں کو بھی راہ حق سے برگشتہ کرنا چاہتے تھے، (نساء: ۴۴) اسی جوش مخالفت میں وہ یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ:

ما انزل اللّٰہ علی بشر من شیءٍ	اللہ نے کسی آدمی پر کوئی چیز نہیں اتاری،
قل من انزل الکتب الذی	ان سے پوچھو وہ کتاب کس نے اتاری
جآء بہ موسیٰ (انعام: ۹۱)	تھی جس کو موسیٰ لائے تھے،

وہ وحی الٰہی کو اپنی اجارہ داری سمجھتے تھے، اس لیے جب ان کے نسل و خاندان کے بجائے عربوں (بنی اسمٰعیل) کو خدا نے اپنی کتاب و شریعت سے نوازا تو ان کو بڑی ناگواری ہوئی اور وہ غصہ و عناد، رشک و حسد اور ضد و سرکشی کی بنا پر قرآن کا انکار کرنے لگے، قرآن نے ان کے اس عناد و سرکشی اور حسد کا مختلف آیتوں میں ذکر کیا ہے۔ (بقرہ: ۹۰ و نساء: ۵۴)

لیکن ان کے اندر کچھ صالح اور نیک فطرت بھی تھے، انکے سامنے جب قرآن مجید پیش کیا گیا تو سمجھ گئے کہ یہ خدا کی جانب سے اتارا ہوا کلام برحق ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ	جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو
یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ	اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے
(بقرہ: ۱۴۶)	بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

اس لیے انھوں نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا، قرآن نے ان کی اس روش کی جابجا تعریف کی (انعام: ۱۱۴، رعد: ۳۶، قصص: ۵۲ و ۵۳، بقرہ: ۱۲۱، آل عمران: ۱۱۳ و ۱۹۹، نساء: ۱۶۲)

اور ان کی واقفیت وشہادت کو مشرکین کے لیے سند کا درجہ دیا ہے، (شعراء: ۱۹۷) مگر یہ اہل کتاب کا ایک قلیل گروہ تھا، اور وہ بھی زیادہ تر نصاریٰ تھے، جن کے رویہ کی سورۂ مائدہ (۸۳) میں تعریف کی گئی ہے، ورنہ یہود کی اکثریت تو قرآن کی تکذیب ومخالفت میں نہایت سرگرم تھی، انکی قرآن بیزاری اور حق دشمنی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ ملائکہ خصوصاً حضرت جبریلؑ کے بھی مخالف ہو گئے تھے، حالانکہ وہ خدا کی مرضی سے وحی لاتے تھے (بقرہ: ۹۷ تا ۹۹)

یہود کی اس شدید مخالفت اور قرآن بیزاری کی وجہ سے ان پر اتمام حجت کے لیے اللہ نے ان کو پُر زور لفظوں میں ایمان بالقرآن کی دعوت دی (بقرہ: ۴۱)۔ سورہ بقرہ میں اصلاً انکو مخاطب کرکے قرآن اور پیغمبر آخر الزماںؐ پر ایمان لانے کی تلقین کی گئی، اس نے یہ سخت دھمکی بھی دی گئی کہ اگر قرآن آجانے کے بعد بھی تم نے اپنا رویہ نہ بدلا اور اپنی اصلاح نہ کی تو تم کو سخت عبرتناک سزائیں دیجائیں گی، (نساء ۔ ۴۷)

نزول قرآن سے پہلے وہ دو بڑی تباہیوں کا شکار ہو چکے تھے (بنی اسرائیل) قرآن انکا نجات دہندہ بنکر آیا تھا، اگر وہ اس کی قدر کرتے تو اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں سے سرفراز کیے جاتے، مگر وہ قرآن کی مخالفت میں جوش وخروش کے ساتھ خود بھی منہمک رہے اور مشرکین وکفار قریش کی بھی پیٹھ ٹھونکتے رہے، ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑ گیا تھا اور ان کے دل اس طرح مقفل ہو گئے تھے کہ نہ قرآن کی دعوت وتذکیر سے ان کو کوئی تنبہ ہوا اور نہ اس کی وعیدیں اور تنبیہیں ان کو جھنجھوڑ سکیں اور وہ قبول ہدایت کی ساری صلاحیتوں سے محروم ہو گئے، "انکے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے" (بقرہ ۔ ۷۴)

آخرت | توحید، رسالت اور خدا کی کتابوں اور فرشتوں کی طرح وہ روز جزا پر بھی ایمان نہیں رکھتے تھے، گذشتہ مباحث کے ذیل میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے، یہاں صرف چند

مزید آیتیں نقل کیجاتی ہیں جن میں انکے ایمان بالآخرۃ کی صراحت سے نفی کی گئی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ (توبہ: ۲۹)

ان اہل کتاب سے جنگ کرو جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری جگہ ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ (ممتحنہ: ۱۳)

اے ایمان والو اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے، یہ آخرت سے اسی طرح ناامید ہیں جس طرح اہل قبور (کی حیات نو) سے کفار مایوس ہیں۔

عبادات ایمان وعقائد میں یہود کی جو خرابیاں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں ان سے ان کے عبادات و معاملات میں بھی فساد اور بگاڑ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ جب بنیاد ہی کج ہو تو عمارت کیسے سیدھی ہوسکتی ہے،

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام آسمانی مذاہب کی طرح یہودی مذہب میں بھی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور قربانی وغیرہ تمام عبادتیں فرض تھیں[۱] لیکن انھوں نے یا تو ان عبادتوں کو سرے سے ترک کردیا تھا یا ان کی اصل حقیقت و روح گم کردی تھی اور انکی ظاہری صورتیں بگاڑ ڈالی تھیں اور ان کے اندر خدا کے احکام و ہدایات کے بجائے اپنی بدعات وخرافات شامل کردی تھیں۔ یہاں نماز وزکوٰۃ کے متعلق یہود کا رویہ بیان کیا جاتا ہے۔

پہلے گذرچکا ہے کہ نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا ان سے عہد لیا گیا تھا مگر انھوں نے اس عہد کا کوئی خیال نہ رکھا اور خدا کے حکم سے روگردانی اختیار کی، ان کے اس طرز عمل کو اس طرح

---

[۱] تفصیل کے لیے سیرت النبی جلد پنجم میں ان عبادات کا ذکر ملاحظہ ہو۔

بیان کیا گیا ہے:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ — اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، پھر
ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ — تھوڑے آدمیوں کے سوا تم نے روگردانی کی
وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (بقرہ: ۸۳) — اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو۔

یہود کے نماز کو بالائے طاق رکھنے کا دوسری جگہ بھی ذکر ہے، سورہ مریم میں انبیاے صادقین کے ذکر کے بعد فرمایا:۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا — ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ناخلف
الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ — ہوئے کہ انھوں نے نماز کو ضائع کیا اور
فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (مریم۔۵۹) — خواہشات کی پیروی کی سو وہ گمراہی میں پڑیں گے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود نے نماز کو بالکل ترک کر دیا تھا، غالباً اسی لیے ان کے صحیفے بھی اسکے حکم سے خالی ہیں، ان کے ایک فرقہ کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے ان کو سرے سے اس کا حکم ہی نہیں دیا تھا، قرآن نے ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو توحید کے بعد پہلا حکم نماز ہی کا دیا گیا تھا،

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا — بیشک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا
فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ — کوئی معبود نہیں ہے، سو میری ہی عبادت
لِذِکْرِیْ (طٰہٰ: ۱۴) — کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو!

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ — اور ہم نے موسیٰ اور اسکے بھائی کی طرف
اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِکُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا — وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر

وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً — (مسجدیں) بناؤ اور اپنے گھروں کو

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (یونس: ۸۷) — قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو۔

نماز کو ضائع کرنے کا یہی مطلب ہے کہ انھوں نے اس کی اہمیت وحقیقت، خدا پرستانہ روح اور دوسری خصوصیات کو ختم کرکے اس کی شکل وصورت تک بگاڑ ڈالی تھی، اسی لیے قرآن نے جب ان کو اس کے ازسرنو زندہ کرنے کا حکم دیا تو

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ — اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو

کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (بقرہ: ۴۳) — اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے رکوع کو جو نماز کی روح اور ضروری رکن ہے، غائب کردیا تھا[1]، اور جماعت کی پابندی بھی ترک کردی تھی، اس لیے ان کے خواص اور زعما کو تاکید کی گئی کہ وہ عام لوگوں کے پہلو بہ پہلو نماز میں کھڑے ہوں اور مسجد کی حاضری اور جماعت میں شرکت کو کسر شان نہ سمجھیں۔

یہود کی نماز سے غفلت ولاپرواہی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ ایسے موحدانہ عمل کو کھیل تماشا سمجھکر اس کی ہنسی اور مذاق اڑاتے تھے، اور اذان کی جو نماز کی دعوت اور توحید کا اقرار واعلان ہے، بھونڈی نقلیں اتارتے تھے۔

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ — اور جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ

اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا (مائدہ ۵۸) — اس کو مذاق اور کھیل بنالیتے ہیں۔

رہی زکوٰۃ تو اس کے بارہ میں بھی انھوں نے خدا کے عہد کو فراموش کردیا تھا،

---

[1] صاحب تدبر قرآن نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے۔

جس کی طرف قرآن نے ثم تولیتم الا قلیلا منکم وانتم معرضون کہکر اشارہ کیا ہے

یہ صحیح ہے کہ یہود زکوٰۃ کے منکر نہ تھے،[1] تاہم ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اسکا برائے نام ہی ذکر رہ گیا تھا، اور ان کے علماء و کاہن صدقات و زکوٰۃ کو فقراء و مساکین میں تقسیم کرنے کے بجائے خود ہی لے لیتے تھے، ان کی کتاب احبار میں پیداوار کے عشرہ پہلوٹھی کے فدیے اور دوسری قربانیوں اور نذروں کو صرف کاہنوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس طرح زکوٰۃ کا مقصد فوت کر دیا گیا تھا، اور اس کے اصلی مستحق غرباء و مساکین کے بجائے علماء اور کاہن بن گئے تھے۔

(باقی)

---

[1] توراۃ کے جو احکام عشرہ پہلے نقل کیے گئے ہیں ان میں نماز کا تو ذکر نہیں ہے البتہ زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے۔

تذکرۃ المحدّثین

(جلد اول و دوم)

اس کی پہلی جلد میں صحاح ستہ کے جلیل القدر مصنفین کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی کے اوائل تک کے تمام مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام مثلاً امام مالک، امام ابو داؤد طیالسی، امام عبد الرزاق، امام دارمی، امام ابن حنبل، امام حمیدی، امام ابن خزیمہ، امام ابو جعفر طحاوی وغیرہ کے حالات و سوانح اور انکی خدمات حدیث کی تفصیل ہے، قیمت عـــ۵/۲۵

دوسری جلد میں چوتھی صدی سے آٹھویں صدی تک کے مشاہیر محدثین امام ابن حبان، امام طبرانی، امام دارقطنی، امام حاکم، امام بیہقی، ابن عبد البر، ابو بکر خطیب، قاضی عیاض، امام بغوی امام ابن اثیر، امام نووی، امام خطابی، خطیب تبریزی صاحب مشکوٰۃ، امام زیلعی صاحب نصب الرایہ اور دوسرے صاحب تصنیف محدثین کے حالات اور کارناموں کا ذکر ہے۔

(مؤلفہ ضیاء الدین اصلاحی)

"منیجر"

نعت قدسی اور اس کی مقبولیت

از ڈاکٹر سمیع الدین احمدؔ، لکچرار شعبۂ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فارسی کی چند معروف ترین نعتوں میں سے ایک نعت قدسی کی نسبت سے بیحد مقبول اور مشہور رہی ہے۔ اس نعت کا مطلع یہ ہے:۔

مرحبا سید مکی مدنی العربی　　دل وجان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

متاخرین میں کئی شاعر ایسے گذرے ہیں جن کا تخلص قدسیؔ تھا، لیکن سب سے زیادہ شہرت اور امتیاز حاجی محمد جان قدسی مشہدی کو حاصل ہوا جو عہد دربار شاہجہانی کا ایک محترم اور ممتاز شاعر گذرا ہے، لہذا اگرچہ کوئی تحریری دلیل موجود نہیں لیکن قیاس یہی ہے کہ اس نسبت کا مرجع اسی قدسیؔ مشہدی کو قرار دیا جائے جس کے نام اور شعری کارناموں سے شناسائی خاصی عام ہے۔

بہرحال (شاید پہلی بار) مرحوم شیخ محمد اکرم صاحب نے ارمغان پاک میں اس نعت کو حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی تصنیف بتایا ہے، اور اس کے نمونۂ کلام میں شامل کیا ہے، اور اسی سلسلہ میں مندرجۂ ذیل اشعار درج کیے ہیں[1]:

مرحبا سید مکی مدنی العربی　　دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

من بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم　　اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

---

[1] ملاحظہ ہو ارمغانِ پاک، ص ۱۴۸

چشم رحمت بکشا سوی من انداز نظر — اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی
نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را — بہتر[1] از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات — رحم فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی
نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم — زاں کہ نسبت بہ سگِ کوی تو شد بی ادبی
عاصیانیم، ز ما نیکیٔ اعمال مپرس — سوی ما روی شفاعت بکن از بی سببی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی — آمدہ سوی تو قدسی پیٔ درماں طلبی

اس صریح اور واضح نسبت کی موجودگی میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً پڑھے لکھے اور باذوق حضرات اس نعت کا مصنف قدسی مشہدی ہی کو سمجھتے رہے ہوں گے اور شاید اسی بنا پر صاحبِ ارمغان پاک نے بھی اس کو قدسی مشہدی کا کلام بتایا ہے لیکن مندرجۂ ذیل اسباب اور قرائن کی روشنی میں اس شاعر کے نام کے ساتھ اس نعت کا انتساب مشتبہ اور مشکوک ہے۔

اولاً یہ کہ عام طور سے قدسی کے دیوان یا کلیات کے متداول نسخوں میں یہ نعت نہیں ملتی، اس سلسلہ میں راقم نے علی گڑھ، رام پور، بانکی پور اور حبیب گنج کے ذخیروں کے کلیات و دواوین کا مطالعہ کیا لیکن یہ نعت ان میں دستیاب نہ ہو سکی، اس کے علاوہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس اور دوسرے ذخیروں کی کسی بھی فہرستِ مخطوطات میں قدسی مشہدی کے ذکر اور اس کی شرح کلام کے تحت اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ قدسی مشہدی نے چند مواقع پر نعتیہ اشعار کہے ہیں لیکن مخصوص طریقہ سے نعت کے موضوع پر ایک ہی نظم اس کے کلیات یا دیوان کے

---

[1] خمسہ نگاروں نے اکثر "بہتر" "بہ تر" لکھا ہے۔

نسخوں میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ موجود ہے جس کے اشعار مع مطلع یہاں
کیے جارہے ہیں ۔

ای بجائی رفتہ کانجا نیست جای جبرئیل
سر حکمت را تو جبرئیلی برای جبرئیل

گر خدا را جا معین می شدی، ہردم برت
دوست می گفتم کہ می آید بجای جبرئیل

جبرئیل از در گہ فیضت گدائی می کند
گرچہ بودند انبیاء دایم گدای جبرئیل

آرزو در خاطرش بسیار می ماندی گرہ
گر نمی شد لطف تو مشکل کشای جبرئیل

می گذارد دیدۂ جبرئیل بر رویت نگہ
خود توئی معشوق جبرئیل و فدای جبرئیل

قدسی نے اپنی مثنوی ظفرنامہ (یا شاہجہاں نامہ) میں حمد و مناجات کے بعد نعتیہ اشعار
ان داستان نعت لکھے ہیں جن کا آغاز یوں ہے :۔

من و نعت احمد کہ روز نخست
شد ایمان نظم بہ نعتش درست

اس کے علاوہ بھی بعض جگہوں پر نعتیہ اشعار اس نے کہے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے
جود وہ بنیادی طور پر نعت گو شاعر کی حیثیت سے شہرت نہیں رکھتا، علاوہ بریں اگر
درجۂ بالا نعت کے اشعار کا موازنہ اکرام صاحب کی پیش کردہ مشہور نعت سے کیا جائے
سلوب و انداز کا فرق بھی نظر آئے گا ۔

قدسی مشہدی کی حیات، دور اور اس کی شاعری کے مطالعہ کے سلسلہ میں اس
ہور نعت پر کہی ہوئی متعدد تضمینوں کے دو جداگانہ مجموعے 'حدیث قدسی' اور
حیفۂ قدسی' کے نام سے راقم سطور کی نظر سے گذرے، یہ دونوں مجموعے علی گڑھ مسلم
یورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں بالترتیب شمارہ ۸۔۳۱ ۴ ۸۹۱ اور شمارہ ۱۱۴ حق
۱۴ ۸۹۱ کے تحت موجود ہیں، پہلے مجموعہ کے مرتب قاضی محمد عمر ہیں جنھوں نے
۱۰۴ ص

[illegible] میں اس مشہور و معروف نظم پر مختلف شعراء کے کہے ہوئے خمسے جمع کیے اور پھر یہ مجموعہ (حدیث قدسی) مطبع مصطفائی کانپور میں باہتمام بدیع الزماں چھپ کر شائع ہوا، دوسرا مجموعہ بنام "صحیفۂ قدسی" حاجی سید شمشیر علی (باشندۂ قدیم قصبہ گوہانہ ضلع رہتک، حال مقیم دہلی) نے ۱۳۰۳ھ (مطابق ۱۸۸۵ء) میں جمع کرنا شروع کیا جو ۱۳۰۴ھ (مطابق ۱۸۸۶ء-۱۸۸۷ء) میں محمود المطابع دہلی میں چھپکر منظر عام پر آیا، حدیث قدسی کے مرتب نے کہیں اس بات کا اشارہ نہیں کیا کہ یہ تضمینیں کس شاعر کی نعت پر ہیں، البتہ دیباچہ میں یہ بیان ملتا ہے :

"نکتہ شناسان دقیقہ یاب پر مخفی اور محتجب نہ رہے کہ اس جزو زماں یعنی ۱۲۷۲ھ بارہ سو بہتر ہجری قدسی میں فقیر احقر قاضی محمد عمر کے خاطر میں اس اندیشہ نے خطور کیا اور فکر رسانے اس کوچہ میں رہنمائی کی اگر مخمسات غزل قدسی کہ جسکا مطلع یہ ہے:

مرحبا سید مکی مدنی العربی   دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

جس قدر دستیاب ہوسکیں جمع کرکے اس صورت سے یہ مجموعہ مرتب کیا جائے کہ ہر شاعر کے نام کے نیچے مختصر مختصر حال بھی اس کا مرقوم ہو تو البتہ لطف سے خالی نہ ہوگا....."

صحیفۂ قدسی کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے :-

(" الحمد للہ کہ مجموعہ تضمین شعرای ہندوستان برغزل حضرت مولانا محمد جان صاحب قدسی، مسمیٰ بہ صحیفہ قدسی ...."

اسی مجموعہ کے اصل متن میں خمسوں کے آغاز سے پہلے بطور عنوان یہ عبارت ملتی ہے :-

"خمسہ برغزل حضرت مولانا محمد جان صاحب تخلص قدسی مرحوم دہلوی کا "

چونکہ صحیفۂ قدسی میں پورے وثوق اور صراحت کے ساتھ اس نعت کو قدسی دہلوی کی

تصنیف بتایا گیا ہے۔ لہٰذا اس وقیع شہادت کی بنیاد پر بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعت متداولہ حاجی محمد جان قدسی مشہدی کی نہیں بلکہ اسکے ہم نام کسی اور بزرگ شاعر مولانا محمد جان قدسی دہلوی کی تصنیف ہے اور شاید نام اور تخلص دونوں کی اس درجہ مماثلت اور یکسانیت کیوجہ سے اشتباہ ہو گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ نعت قدسی مشہدی کے نام سے جو یقیناً زیادہ مشہور اور متعارف شاعر تھا منسوب کر دی گئی۔

اس مشہور نظم پر کہے ہوئے اکثر و بیشتر خمسے چونکہ انیسویں صدی کی تصانیف ہیں، لہٰذا بظاہر قدسی دہلوی اور تضمین نگاروں کے درمیان قرب زمانی بھی معلوم ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ لفظ 'مرحوم' سے جو اس کے نام کے ساتھ شامل ہے، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر جس کا وطن دہلی تھا، انیسویں یا اٹھارویں صدی یعنی عہد متاخرین کا شاعر رہا ہوگا۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قدسی مشہدی کی غیر معمولی شہرت اور اس کے نام اور شاعری سے واقفیت اس درجہ عام تھی کہ پڑھے لکھے لوگوں کا دونوں کے ناموں کو غلط ملط کر دینا یا محض سہواً قدسی مشہدی کو قدسی دہلوی لکھ جانا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر قدیم و جدید ماخذوں میں قدسی مشہدی کے نام کے شروع میں 'حاجی' کا لفظ ملتا ہے، لیکن صحیفۂ قدسی میں جس میں نعت گو شاعر کا نام دو بار چھپا ہے، مولانا کا لفظ درج ہے، نیز 'مرحوم' اور 'رحمۃ اللہ علیہ' کے لفظوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی ایسے شخص کے لیے یہ کلمے استعمال کیے گئے ہیں جس کے انتقال کو بہت زیادہ مدت نہیں گذری، اس سے بھی خمسوں کے مرتبین اور قدسی دہلوی کے درمیان زمانی قرب کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

جامع صحیفۂ قدسی کے بیان سے جو اس نے دیباچہ میں دیا ہے، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کو نعت نگار کی ذات سے تعلقِ خاطر تھا۔ لہٰذا خمسوں کی ترتیب و تدوین کے وقت اس کو دہلوی لکھنا ایک ایسی شہادت ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس نے یہ نسبت

ِتحقیق از خود نہ لکھی ہوگی، اور اس بات کا قطعی امکان نہیں کہ اس کو سہو ہوا ہو، وہ شاعر کی
ات اور شخصیت سے بخوبی واقف ہے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس نے ایسے جانے بوجھے
خص کی نسبت عمداً یا غیر عمداً غلط لکھ دی ہو، یہ بہرحال یقینی امر ہے کہ مرتب مجموعۂ ہذا کی
یثیت ایک غیر آگاہ ناقل کی نہیں بلکہ ایک واقف کار مورخ کی سی ہے جو کسی معاملہ کی نوعیت
سے کما حقہ، واقف ہوتا ہے اور جس کا بیان محقق اور مستند ہوتا ہے،

نعت مذکور کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی اس کا انداز گذشتہ صدی کے
سی خالص ہندوستانی شاعر کا ہے، اور قدسی مشہدی کے اسٹائل اور طرز شاعری سے بہت
ختلف ہے،

اس نعت کی شہرت اور مقبولیت آج بھی قائم ہے اور عام طور سے ارباب ذوق اور
ی علم حضرات اس کو قدسی مشہدی ہی کی تصنیف بتاتے اور خیال کرتے ہیں لیکن ہماری نظر
یں ان شواہد و قرائن کی موجودگی میں اس کو قدسی مشہدی کی تصنیف بتانا یا لکھنا صحیح نہیں،

اپنے دور میں تو یہ نظم بظاہر بہت ہی زیادہ مقبول و معروف رہی ہے، اس حقیقت
کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بیسیوں شاعروں نے اس پر خمسے نظم کیے لیکن ان چند
شاعروں کو چھوڑ کر جنھوں نے تضمینیں فارسی میں کہی ہیں، بیشتر شعرا اردو کے ہیں، کچھ ایسے
بھی تضمین نگار ہیں جن کا کلام عربی یا پنجابی زبان میں ہے[1]، ایسے شعراء انیسویں صدی کے ہیں اور
اس بات سے بھی نعت متداولہ اور تضمین نگاروں کے عہد کے تعین میں مدد ملتی ہے،

صحیفۂ قدسی کے مرتب کے دیباچہ سے اس نعتیہ غزل کی بے انتہا مقبولیت کا پتہ چلتا ہے،
اس نے لکھا ہے کہ صحیفۂ قدسی کی ترتیب سے بھی پہلے اس نے ۲ حصے مجموعہ نعت کے نام سے شائع کرائے تھے،

---

[1] صحیفۂ قدسی (ص ۱۴۹) میں ایک ہی خمسہ پنجابی میں نظم کیا ہوا ملتا ہے تضمین نگار کا نام مولوی شیخ عبدالواحد دہلوی
المتخلص بہ واحد دیا گیا ہے۔

اس دیباچہ سے چند دوسرے ضروری اور متعلق امور کی بھی نشاندہی ہوتی ہے جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

"اول تو یہ کہ مرتب مجموعۂ ہذا کو ہمیشہ سے رسولِ اکرمؐ کی مدح خوانی یا نعت خوانی کا شوق تھا اور بہت سے خمسے اس کو زبانی یاد تھے، جو وہ جلسوں میں پڑھتا تھا، اکثر شائقین اور باذوق حضرات اس سے ان خمسوں کی نقل کا مطالبہ کرتے کہ "یہ خمسہ لکھ دو یا نقل کردو"۔ اس لیے اس نے طے کیا کہ جتنے خمسے اس کو یاد ہوں ان کو جمع کرکے چھپوا دیا جائے، لہٰذا " بعنایت الٰہی ۱۲۹۳ھ میں بندہ نے مجموعۂ نعت کے نام سے دو حصے چھپوا دیے، پھر میری نظر سے حدیث قدسی گذری جو کہ ۱۲۷۳ھ میں قاضی محمد عمر صاحب نے جمع کرکے چھپوائی تھی۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار دل نے چاہا کہ میں بھی قدسی کی غزل کے خمسے جمع کرکے چھپوا دوں بس میں نے بھی بعنایت الٰہی کمر ہمت باندھ کر جنوری ۱۸۸۵ء کو دہلی کے اخباروں میں اشتہار دینے شروع کیے اور کثرت سے شاعروں کو بیرونجات میں خط لکھے، اب بفضلِ ایزدی سے عرصہ دو سال میں یہ مجموعہ تیار ہو گیا جو کہ ہدیۂ شائقین و ناظرین ہے ....

اور بندہ نے ہر ایک شاعر کے تخلص کو ابجد کے حساب سے ترتیب دیکر مرتب کیا ہے تاکہ ہر ایک شخص کو خمسہ کے نکالنے میں دقت نہ ہو، اور نام اس کتاب کا صحیفۂ قدسی حصۂ دوم حدیث قدسی رکھا[1] .... الخ"۔ مرتب نے آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ

۱؎ حقیقتاً مجموعہ صحیفۂ قدسی، حدیث قدسی کا حصہ دوم نہیں ہے لیکن محض اس بنا پر کہ یہ نسخہ موخر تھا اور حدیث قدسی کے بعد تیار کیا گیا تھا، مرتب نے اس کو یہ نام دے دیا ہے، ورنہ "حقیقتاً" دونوں الگ اور جداگانہ کوششیں ہیں۔

جتنے خمسے پہلے مجموعہ یعنی حدیث قدسی میں چھپ چکے ہیں وہ مجموعۂ ہذا میں شامل نہیں کیے گئے۔[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزل متداولہ کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ان دو کوششوں سے قبل ہی تضمینوں کی تدوین اور جمع آوری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، لہذا قریب العہد شاعروں نے جن میں چند بڑے اور ممتاز شاعر شامل تھے، اور معمولی درجہ کے سخن گو حضرات بھی اس نعت پر خمسے لکھ ڈالے، حاجی سید شمشیر علی، تخلص شمشیرؔ، مرتب صحیفۂ قدسی نے بھی اپنا خمسہ تضمین کیا جو اس مجموعہ کے صفحہ ستر پر درج ہے،

متذکرۂ بالا اقتباس کے پیش نظر تضمینوں کی ترتیب کے سلسلہ میں حدیث قدسی کو سید شمشیر علی کے مجموعوں پر تقدم زمانی اور فوقیت حاصل ہے، اور غالباً یہ پہلی کوشش تھی جو اس ضمن میں وجود میں آئی، اس مجموعہ کی اہمیت اور وقعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں چند عظیم المرتبت ہندوستانی شاعروں جیسے آخری تیموری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی، حکیم مومن خاں مومنؔ، امام بخش صہباؔئی، میر مہدی مجروحؔ، غلام امام شہید اکبرآبادی وغیرہ اور دوسرے متعدد (نسبتاً کم متعارف) شاعروں کے خمسے شامل ہیں،[2] غالبؔ اور صہبائی کے خمسے فارسی میں اور بقیہ تین اصحاب کے خمسے اردو میں ہیں،[3] اس کے علاوہ بھی کئی شعراء ایسے ہیں جنھوں نے اس نعت پر خمسے فارسی میں موزوں کیے ہیں، مرتب نے صفحہ ایک سو پچیس[125] پر اکیس[21] اشعار کی ایک غزل درج کی ہے جس میں اس نے ان شعراء کا نام یا تخلص لکھا ہے جنھوں نے تضمینیں کہی ہیں، اس غزل کا عنوان یوں پیش کیا گیا ہے؛

---

[1] یہ صحیح نہیں اسلیے کہ خمسہ حافظ عبدالرحمٰن خانصاحب متخلص بہ احسان جو صحیفۂ قدسی میں صفحہ نو[9] پر درج ہے اور جسکا مطلع ہے: "مستعد بہر شفاعت ہی شہا تجھ سا نبی" الخ، حدیث قدسی میں بھی صفحہ ۵ پر مندرج ملتا ہے۔ [2] ان شعراء کے خمسوں کے لیے ملاحظہ ہو بالترتیب صفحات ۵۵-۱۱۴-۹۱-۱۱۳-۹۲ اور ۱۱۵ [3] غالب کی تضمین بعنوان خمسہ بر غزل مولانا قدسی قدس اللہ سرہٗ کلیات غالبؔ (مرتبہ امیر حسن نورانی) میں صفحہ ۱۸۷ پر درج ہے۔

"غزل از فکر ناقص قاضی محمد عمر مولف مجموعۂ ہذا در ذکر شعراء"۔ مطلع یہ ہے :۔

(۱) آج پھر بزم سعادت کی ہے ترتیب نئی — جمع ہوتے ہیں سبھی مدح سرایانِ نبی

اگلے شعر میں مرتب نے سب سے پہلے بہادر شاہ ظفر کا نام لیا ہے، شعر ہے :۔

(۲) گوہر مملکت و سایہ حق، مہر عطا — شاہ ذیجاہ ظفر مظہر نور قدسی

بقیہ انیس[۱۹] اشعار بھی یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے وہ سارے نام سامنے آسکیں گے جو بقول مرتب مدح سرایانِ نبی کی صف میں شامل ہیں :

شعر ۳: خازن جوہر عرفان خدا، حضرت رمز — جس کی پیشانی سے ظاہر تھے فیوضِ ابدی

،، ۴: منبع فضل وکرم، معدنِ فیاض ازل[۱] — ساقی میکدۂ علم و ہنر، صہبائی

،، ۵: شیر میدانِ سخن، غالب یکتای زمن — فخر خوش فہمی وخوش گوئی و شیریں سخنی

،، ۶: سوز دہ شمع سر محفل علم وحکمت — جن کی مشہور جہاں میں ہے سخن کی گرمی

،، ۷: یوسف مصر معانی و عزیز خوشگو — اور یقیں شانہ کش کاکل اسرار خفی

،، ۸: اختر و عصمت و آشفتہ و احسان و حزیں — بسمل و اوج و فنا رحمت و موزون و زکی

،، ۹: حشمت و رفعت و تحسین و حیا و سوزش — مظہر و مخلص و طراز و صفیر و کافی

،، ۱۰: مومن و مضطر و مدہوش و حیات و حیدر — بسمل و نایب و آشفتہ و اسحاق و غنی

،، ۱۱: مضطر دیگر و امداد و رسا و راحت — سالک و صابر و مجروح و انیس و روحی

،، ۱۲: ذائق و خستہ و شیدا و امیر و طیب — مغل و مہر و سلیم و طرب و فرد و زکی

،، ۱۳: فضل و عیش و قلق و خبر و امانت، عاجز — شاد، شاداں و شگفتہ و دبیر و محوی

،، ۱۴: راحت و جوش و لطیف اور شہید و شہرت — ماہر و طیب و تنویر و فسون و کیفی

،، ۱۵: گوہر و قیس و فنا اور ظہور و مضطر — عبد و مسکین و تمنائی و خلیل و علوی

---

[۱] وزن شعر میں لانے کے لئے اس کو طرز یعنی مشدد "ر" کے ساتھ پڑھنا پڑے گا۔

۱۶: قادر و عیش و غنی فکر و شریر و چالاک — اور شیر اور ضمیر اور مذاق و عرشی

۱۷: واصف و دہشت و خورشید و بلند و شاکر — نازنین و شرر و صارم و عاشق و ناجی

۱۸: اور تحمل کہ مجرد ہے مجرد کی طرح — اور مخیر ہے معزز کی صفت لاثانی

۱۹: صاحب فکر رسا، قائم خوش فکر کلام — ہجر دہ ہجر کہ ہے شعر و سخن میں نامی

۲۰: وہ قناعت وہ وجاہت وہ وصال اذر شہید — وہ شہیدی و رحیم اور وہ نسیم و نقشی

۲۱: جن کی ہے طبع رسا معدن اسرار خدا — جن کی خاک کف پا سرمۂ چشم قاضی

مجموعہ حدیث قدسی میں شامل ان تمام شعراء کے نام جنھوں نے تضمینیں موزوں کیں مع تخلص یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

۱۔ حکیم منور علی خاں آشفتہ رئیس میرٹھ ۲۔ پنڈت امرناتھ المتخلص بہ آشفتہ

۳۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں تخلص احسان ۴۔ خمسہ اختر تخلص از خاندان تیمور کہ آمش در پردہ عصمت است

۵۔ حاجی محمد اسحاق المتخلص بہ اسحاق ۶۔ امانت علی المتخلص بہ امانت

۷۔ مولوی امداد اللہ تھانوی تخلص امداد ۸۔ محمد امیر صاحب تخلص امیر

۹۔ سید قاسم علی خاں، تخلص انیس ۱۰۔ میاں اوج صاحب دہلوی

۱۱۔ غلام بسم اللہ بریلوی المتخلص بہ بسمل ۱۲۔ سید قطب الدین صاحب بسمل تخلص

۱۳۔ حکیم مولوی سید احمد المتخلص بہ تائب ۱۴۔ تجمل رسول خاں، تجمل تخلص

۱۵۔ محمد حسین خاں دہلوی المتخلص بہ تحسین (مہتمم مطبع مصطفائی دہلی) ۱۶۔ مرزا عاشور بیگ ثنائی

۱۷۔ محمد نظام الدین جوش تخلص ۱۸۔ نواب دبیر الدولہ میرزا محمد علی خاں بہادر تخلص حیدر

۱۹۔ محمد حیات خاں، تخلص حیات ۲۰۔ صاحب عالم میرزا رحیم الدین، حیا تخلص

۲۱۔ صاحب عالم میرزا فخر الدین حشمت تخلص ۲۲۔ حزین شاگرد عارف

۲۳۔ ظہیل الدین المتخلص بہ ظہیل رئیس میرٹھ
۲۴۔ حافظ الطاف حسین تخلص خستہ (رئیس پانی پت)

۲۵۔ خیر الدین تخلص خیر
۲۶۔ محمد فاضل، المتخلص بہ دبیر

۲۷۔ میاں ذاتی
۲۸۔ مرزا محمود بیگ دہلوی المتخلص بہ راحت

۲۹۔ میاں راحت شخصے دیگر
۳۰۔ میرزا کریم الدین، المتخلص بہ رسا

۳۱۔ میرزا پیارے صاحب تخلص رفعت
۳۲۔ مولوی محمد صدیق حسن قنوجی تخلص روحی

۳۳۔ خمسہ میاں رحمت صاحب
۳۴۔ نواب محمد زلنجان بہادر لکھنوی، المتخلص بہ زکی
خمسہ بکرور زکی در صنعت کمرز ہے

۳۵۔ مولوی عبد الکریم سوز تخلص
۳۶۔ حافظ عبد الرحمن کاندھلوی، سوزش تخلص

۳۷۔ مولوی سلیم اللہ، سلیم تخلص
۳۸۔ مرزا خجستہ بخت، سالک تخلص

۳۹۔ منشی تفضل حسین، تخلص شاد
۴۰۔ مرزا عالی بہادر لکھنوی، المتخلص بہ شیدا

۴۱۔ خمسہ مولوی شہید صاحب لکھنوی
۴۲۔ مولوی علی بخش، شرر تخلص

۴۳۔ میاں احمد خاں دہلوی شریر تخلص
۴۴۔ سندر لال لکھنوی، المتخلص بہ شگفتہ

۴۵۔ مرزا حاجی صاحب تخلص شہرت
۴۶۔ نواب عبد الوہاب خاں، شاداں

۴۷۔ میاں خان صاحب دہلوی، صفیر تخلص
۴۸۔ مرزا قادر بخش دہلوی، صابر تخلص

۴۹۔ فصیح الدین سہارنپوری، ضمیر تخلص
۵۰۔ فصیح الدین رنجکی، المتخلص بہ طبیب

۵۱۔ سید حیدر علی، المتخلص بہ طبیب
۵۲۔ رحیم بخش، تخلص طرب

۵۳۔ محمد شاہ میر دہلوی، طراز تخلص
۵۴۔ بہادر شاہ بادشاہ دہلی خلد اللہ ملکہ ظفر تخلص

۵۵۔ مولانا مولوی محمد ظہور علی ظہور تخلص[۱]
۵۶۔ مولوی عبد العزیز، عزیز تخلص

۵۷۔ مولوی احمد حسن قنوجی، عرش تخلص
۵۸۔ قادر علی عبد تخلص

---

[۱] یہی نام اور تخلص لیکن مختلف اشعار کے ساتھ صحیفہ قدسی (ص ۸۶) میں بھی ملتا ہے۔

۵۹۔ خمسہ میاں [illegible] صاحب

۶۰۔ منشی عزت سنگھ دہلوی تخلص عیش

۶۱۔ حکیم آغا جان عیش تخلص

۶۲۔ مولانا مولوی حکیم محمد عبداللہ تخلص علوی

۶۳۔ عبدالغنی ساکن بریلی، غنی تخلص

۶۴۔ خمسہ نامدار خاں غنی تخلص عہدہ دار مطبع ہذا

۶۵۔ حکیم محمد بشارت علی، تخلص فرد

۶۶۔ خمسہ میاں فنا

۶۷۔ قاضی فضل الرحمٰن متخلص بہ فضل

۶۸۔ میر حسن علی ترمذی، تخلص فنا

۶۹۔ میر بندہ علی دہلوی تخلص فکر

۷۰۔ میرزا نجف صاحب المتخلص بہ فسون

۷۱۔ میرزا نصیرالدین قناعت

۷۲۔ محمد عنایت اللہ خاں قیس تخلص

۷۳۔ میرزا قادر شکوہ، قادر تخلص

۷۴۔ شیخ مولی بخش، تخلص قلق

۷۵۔ مولوی کفایت علی مرادآبادی کافی تخلص

۷۶۔ خمسہ کیفی صاحبہ از خاندان تیمور

۷۷۔ میاں علیم اللہ گوہر

۷۸۔ فدا حسین بیرجی، لطیف تخلص

۷۹۔ مولوی رعایت حسین سہارنپوری مضطر تخلص

۸۰۔ محمد مردان علی خاں المتخلص بہ مضطر مرادآبادی

۸۱۔ حافظ حکیم مظفر حسین خاں، مسکین تخلص

۸۲۔ میر مظہر علی مظہر تخلص

۸۳۔ حافظ اعظم علی، مضطر تخلص

۸۴۔ میاں غلام نبی مدہوش تخلص

۸۵۔ خمسہ میاں مجبر صاحب

۸۶۔ میاں ولدار علی، مذاق تخلص

۸۷۔ مرزا محمد بیگ، محوی تخلص

۸۸۔ محمد اکبر مخلص تخلص

۸۹۔ سید محمد علی معزز تخلص

۹۰۔ خمسہ میاں مہر صاحب

۹۱۔ خمسہ حکیم مومن خاں مرحوم مومن تخلص

۹۲۔ خمسہ میر مہدی صاحب المتخلص بہ مجروح

۹۳۔ حافظ محمد قطب الدین دہلوی مشیر تخلص

۹۴۔ مرزا محمد ظہیرالدین مقبل تخلص (خلف حضور والا)

۹۵۔ خمسہ میرزا جمعیت شاہ، ماہر تخلص

۹۶۔ میرزا محمد قادر بخش، موزون تخلص

۹- خدابخش خاں، تنویر تخلص
۹۸- شیخ امیر علی دہلوی، تجرد تخلص

۹- میرزا علی نازنین تخلص
۱۰۰- مولوی حکیم محمد نسیم اللہ، نسیم تخلص

۱- بدرالدین علی خاں، نقشی تخلص
۱۰۲- خمسہ میاں نامی صاحب

۱۰- حکیم محمد نصراللہ خاں دہلوی المتخلص بہ وصال
۱۰۴- مولوی احمد حسن، وحشت تخلص

۱۰- احمد علی خاں وجاہت تخلص
۱۰۶- سید حیات اللہ واصف تخلص

۱- سید جمیل الدین ہجر تخلص
۱۰۸- سید محمد حسین خاں، یقین

۱- صفدر علی بیگ، بلند تخلص[۱]
۱۱۰- حکیم حافظ ایوب علی، قائم تخلص

۱- ترجیع بند غلام امام شہید اکبرآبادی شہید تخلص
۱۱۲- (خمسہ فارسی) جناب مولوی امام بخش صہبائی مدرس

۱۱- خمسہ نواب اسداللہ خاں غالب تخلص میرزا نوشہ (نیز ایک خمسہ)
۱۱۴- میرزا رحیم بیگ رحیم تخلص

۱۱- سید احمد حسن، المتخلص بہ صارم
۱۱۶- نواب مرزا والاجاہ بہادر لکھنوی المتخلص بہ عاشق

۱۱- سید امیر مرزا، خورشید تخلص
۱۱۸- خمسہ میرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ ولی عہد بہادر المتخلص بہ رمز

۱۱- مسدس مولوی محمد بشیر الدین، تخلص شاکر

اس آخری شاعر کی تضمین کے بعد جو مسدس کی شکل میں ہے، ایک مشہور مخمس نعتِ نبیؐ (لیکن یہ شکل تضمین نہیں) ملتا ہے، مقطع سے نشاندہی ہوتی ہے، کہ اس کا مصنف کوئی شاعر متخلص بہ شہیدی ہے، اس مخمس کے بعد ایک سرخی "تضمین بر غزل استادنا نسیم دہلوی" مندرج ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ تضمین مرتب حدیث قدسی نے اپنے استاد نسیم دہلوی کی کسی غزل پر موزوں کی ہوگی ہاس عنوان کے بعد مرتب کی وہی غزل جو تضمین نگاروں کے ناموں

---

[۱] ایک خمسہ اسی نام اور تخلص سے بجنسہ انھی اشعار کے ساتھ جو اس مجموعہ میں مندرج ہیں صحیفۂ قدسی (ص ۲۲) میں بھی موجود ہے،

یہ مضمون پر حاوی ہے، اور جس کو راقم نے گزشتہ سطور میں نقل کیا ہے، ملتی ہے، اس کے بعد متفرق اشعار بعنوان "ابیات متضمن نصیحت برائے مومنین طالب جبہ" اور ایک سرخی بعنوان غزل بھی موجود ہے جس کے بعد تمت کا عنوان اور قطعہ تاریخ طباعت فارسی میں وارد ہے، جو حسب ذیل ہے،

"چوں دریں آوان بعون کردگار — نعت شاہ انبیاء مطبوع شد
گفت شائق سال آں از روئے طبع — وصف محبوب خدا مطبوع شد

اس کے بعد ملحقات کے عنوان سے چند اور بھی تضمینیں اسی مجموعہ میں موجود ہیں جو بعد میں بدیع الزماں مہتمم مطبع ہذا نے شعرائے نامی سے موزوں کروا کے زینت دہ رسالہ ہذا کئے یعنی مجموعہ میں شامل کئے، ان خمسوں کا ذکر ہم طوالت کے خوف سے یہاں نظر انداز کرتے ہیں، ان تضمین نگار شعراء کے ذکر یا ان کے کلام کو قاضی محمد عمر نے متن اصلی میں شامل نہیں کیا ہے، ان مزید خمسوں کی کل تعداد بارہ[۱۲] ہے، تضمین نگاروں کی فہرست سے علم ہوتا ہے، کہ شعراء کی تعداد ایک سو انیس[۱۱۹] اور کل خمسوں کی تعداد ایک سو اکیس[۱۲۱] ہے،

صحیفۂ قدسی کے مرتب نے اپنی تالیف کے آخر میں لکھا ہے کہ

"حدیث قدسی کے پہلے حصہ میں ۲۳ (کذا) خمسے ہیں، اور وہ نو (کذا) جزو پر ہے صحیفۂ قدسی حصہ دویم میں ۲۰۰ خمسے جمع کر کے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں، یہ حصہ ۱۱ (کذا) جزو کا ہے[۱]"

---

[۱] حدیث قدسی کے پہلے حصہ سے مراد خود مجموعۂ حدیث قدسی اور صحیفۂ قدسی حصہ دویم سے مراد خود صحیفۂ قدسی ہے، یہ مرتب حدیث قدسی کو حصہ اول اور اپنی کوشش کو حصہ دویم کا نام دیتا آیا ہے، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، حقیقتاً یہ دونوں بالکل جداگانہ مجموعے ہیں، یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ جزو سے مرتب کی مراد کیا ہے،

اس متبرک اور پاکیزہ غزل پر تضمین نگاری کے سلسلہ میں شعرا نے بلا تفریق مذہب و ملت
حصہ لیا، اور اس طرح اپنے جذبات خلوص و ارادت کا اظہار کیا، یہ بات بھی اس نعت
کی مقبولیت اور عظمت کی واضح اور بین دلیل ہے۔ صحیفۂ قدسی کے مطالعہ سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس دور کے چند ہندو حضرات نے خمسے نظم کئے تھے، جو سرور کونینؐ کی ذات
بالصفات سے ان شعرائے کرام کی عقیدتمندی کا کھلا ہوا ثبوت ہیں، جن ہندو شاعروں
کی تضمینیں اس مجموعہ میں شامل ہیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں،

۱۔ منشی تلجا رام متخلص جوہر (ص ۳۴)

۲۔ منشی ہرلال، متخلص رسوا، دہلوی (ص ۱۰۰)

جیسا کہ تضمین نگاروں کی فہرست سے ظاہر ہے، حدیث قدسی میں ان دو حضرات کے نام موجود ہیں،

۱۔ پنڈت امرناتھ، المتخلص بہ آشفتہ (ص ۴) (۲) سندر لال لکھنوی تخلص شگفتہ (ص ۴۶)

۳۔ منشی عزت سنگھ دہلوی المتخلص شگفتہ (ص ۴۶)

شیخ اکرام صاحب نے اس نعت کے کل آٹھ اشعار دیئے ہیں، جب کہ ان دونوں مجموعوں
میں عام طور سے دس اشعار ملتے ہیں[۵۱]۔ ان آٹھ اشعار میں سے جو زیر نظر مقالہ کے شروع میں
نقل کر دیئے گئے ہیں، ایک شعر تو وہ ہے جو عام طور سے مخمسات میں کم ملتا ہے، وہ بیت یہ ہے،

عاصیانیم زمانیکی اعمال میرس[۵۲]		سوے ما روے شفاعت بکن از بے سببی

اس کے علاوہ بقیہ سات اشعار کلیتہً مشترک ہیں، باقی تین ابیات جو کم و بیش ہر خمسہ
میں شامل تضمین ہیں اور ارمغان پاک میں دستیاب نہیں، یہ ہیں:-

---

۵۱ اور کہیں کہیں گیارہ، مثلاً فاروق علی المتخلص بہ انجم کے خمسوں میں جو صحیفہ قدسی میں صفحات تین
اور چار پر درج ہیں، (۵۲) اکثر خمسوں میں بجائے میرس محو او درج ہے،

۱۔ نخل بتان مدینہ زتو سرسبز مدام | زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی
۲ ذاتِ پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور | زاں سبب آمدہ قرآں بزبان عربی
۳۔ شبِ معراج عروجِ تو گذشت از افلاک | بہ مقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبیؑ

ایک اور بھی زاید بیت جو باندھا گیا ہے (اگرچہ بکثرت نہیں) یہ ہے،

بہ درِ فیضِ تو استادہ بصد عجز و نیاز | رومی و زنگی و طوسی ہمنی و حلبی

حدیثِ قدسی کے ایک دو خمسوں میں یہ شعر بھی دیکھنے میں آیا،

در حریم حرم کعبہ وصلش نرسی
دست در دامنِ اولادِ نبی تا نزنی

بہ حیثیت مجموعی صحیفۂ قدسی کی اہمیت نسبتًا کم ہے، حدیثِ قدسی کی برتری کی ایک وجہ تو وہی تقدمِ زمانی ہے، جس کے بارہ میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ صحیفۂ قدسی میں خمسوں کی تعداد میں اضافہ کے باوجود تضمینوں کا معیار فکر و فن کے اعتبار سے کچھ بہت بلند نہیں، اور کوئی بھی صاحبِ امتیاز شاعر تضمین نگاروں میں شامل نظر نہیں آتا، البتہ شیخ ابراہیم ذوق اور مولوی امام بخش صہبائی کے تلامذہ کے خمسے شامل ہیں یعنی شوق شاگرد صہبائی، سید میرن شاہ المتخلص بہ صفا تلمیذ ذوق دہلوی، بدر الدین صبا (صبائی؟) شاگرد صہبائی، اور سید دلدار علی بدایونی تخلص مذاق، شاگرد حضرت ذوق،

لہ مفہوم اصلی کے اعتبار سے بجائے نرسد نرسید ہونا چاہیے' بہرحال اس کلمہ نرسد سے جو فعل مضارع کا صیغہ ہے، حال اور مستقبل دونوں کے معنی نکلتے ہیں، گویا نبی آخر الزمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بعد بھی کسی نبی کی بعثت کی گنجایش باقی رہتی ہے، یا رہے گی، اور یہ بات اس باب میں امت مسلمہ کے عقیدہ کے بالکل منافی پڑتی ہے،

بہرحال صحیفۂ قدسی میں شعراء کی کل تعداد ایک سو اکیاون ۱۵۱ ہے اور خود مرتب کے قول کے مطابق جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، مخمسوں کی تعداد دو سو ہے جن میں چند مسدس اور ایک دو مثلث بھی شامل ہیں۔ اسی مجموعہ میں صفحہ ۲۹ پر ایک مخمسہ بنام تیمور درج ہے، جس کے ہر بند میں کل نو ۹ مصرعے ہیں یعنی دو نعت گو شاعر کے اور بقیہ سات تضمین نگار کے۔

کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ (شاید) قدسی دہلوی نے یہ نعت بارگاہ نبوی میں موجودگی اور حاضری کے وقت موزوں کی ہوگی جیسا کہ اس مصرع سے ظاہر ہے:

ع آمدہ سوی تو قدسی پی درماں طلبی

صحیفۂ قدسی (۴۲) میں مخمسہ محمد حمید اللہ خاں متخلص حمید کے آخری بند کا ایک مصرع اور پھر نعت نگار کا آخری شعر اس طرح درج ہے:

.... در پہ حاضر ہے حمید آپ کے مثلِ قدسی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی آمدہ سوی تو قدسی پی درماں طلبی

اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے اشارے چند دوسرے مخمسوں میں بھی ملتے ہیں۔ اسکے علاوہ خود نعت کے ایک اور مصرع:

ذاتِ پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور

سے بھی سرزمین حجاز میں شاعر کی موجودگی یا اس سے قربت کا احساس ہوتا ہے۔

متذکرۂ بالا مجموعوں (خاص طور سے صحیفۂ قدسی) کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نعت متداولہ کی شہرت، اس کے مقبول خاص و عام ہونے کی بنا پر، ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے علاقوں جیسے دہلی، پنجاب، یوپی وغیرہ

کے علاوہ دور دراز حصوں اور شہروں مثلاً میسور، کوئمبٹور، حیدرآباد، پانجل پور، ہوشنگ آباد، اندور (مالوہ) عظیم آباد (پٹنہ) جھجھر، برہان پور اور گلبرگہ وغیرہ کے شعرا نے بھی پورے ذوق و شوق اور خلوص و عقیدتمندی کے جذبات کے ساتھ اس پسندیدہ نعت پر تضمینیں اور خمسے مرتب کیے۔

صحیفۂ قدسی کے جامع نے بالکل آخر میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے امیر خسرو کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے

ای چہرۂ زیبای تو رشک بتانِ آذری ہر چند وصفت میکنم در حسن زاں زیبا تری

کی تضمینوں کی جمع آوری کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا، لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا یا نہیں۔

وہ لکھتا ہے:-

"بندہ نے حضرت امیر خسرو دہلوی کی غزل کے خمسے جمع کرنے شروع کیے ہیں، میرا ارادہ ہے کہ انشاء اللہ ان کو اسی طرح چھپوا دوں، اس لیے عرض ہو کہ جس صاحب کے پاس اس غزل کا خمسہ یا مثلث یا مسدس ہو یا اب طبع آزمائی فرمائیں اور مجھکو مرحمت کریں تو میں بعد چھپنے کے ایک کتاب ان کو نذر کر دوں گا۔ غزل یہ ہے ؎

"ای چہرۂ زیبائے تو........." الخ

اس بات کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ قدسی اور اس کی نظم کردہ نعت پر اس بحث کے ضمن میں یہ تو تمام خمسوں کی نقل کی یہاں گنجائش ہے اور نہ ضرورت، لہٰذا ہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے بطور مثال اور نمونہ ان چند نامور تاجدارانِ اقلیمِ سخن کے مخمسات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن کا کلام فکر کی ندرت اور پاکیزگی، بیان و انداز کی ناتنگی اور

دلنشینی کا عالم ہے، اور جس میں خلوص جذبہ کی آمیزش نے تاثیر کا گہرا رنگ بھر دیا ہے، ان نمونوں کے انتخاب میں وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے، جو پیشتر ضبط تحریر میں آچکی ہے،

خمسہ بہادر شاہ ظفر :-

سرورا تو وہ نبی جس کے نہیں بعد نبی　　دیکھ کر شان تری عرش کی بھی شان دبی
انبیا تجھ سے کہیں وقتِ شفاعت طلبی　　مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

ہے ترے جلوہ سے مسجودِ ملایک آدم　　تیرے ہی نور سے پُر نور حدوث او رقدم
دیکھ کر حسن کے شیدا ترے دونوں عالم　　مِن بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی

تجھ کو گر خالقِ کونین نہ پیدا کرتا　　پھر کبھی ارض وسما ہوتے نہ پیدا اصلا
گرچہ اولاد میں آدم کی ہوا تو پیدا　　نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

جب گیا سوی فلک کرکے زمیں کو طے دشت　　دیکھے سب باغ بہشت ایک سے لیکر تا ہشت
کر چکا گلشن نہ چرخ کی جب تو گلگشت　　شبِ معراجِ عروج تو زافلاک گذشت
بمقامیکہ رسیدی نرسد ہیچ نبی

ابر احسان کرم سے ترے سیراب انام　　ثمر خلق سے ہے تیرے جہاں شیریں کام
ای ترو تازگی افزای ریاضِ اسلام　　نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

موسیٰ و عیسیٰ و داؤد جہاں تھے مامور　　وہیں نازل ہوئیں توریت اور انجیل و زبور

ان کی ہر خاص زباں میں کہ نہ ہو فہم سے دُور — ذاتِ پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور

زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

وہ فرشتہ کہ جو ہو حاملِ عرشِ اعظم — آئے در پر ترے آنکھوں کو اگر رکھ کے قدم

تو ادب سے یہ کہے کھا کے ترے در کی قسم — نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم

زاں کہ نسبت بہ سگِ کوی تو شد بی ادبی

سوزِ عصیاں سے جگر سوختہ جب مخلوقات — آئیں صحرای قیامت میں طلبگارِ نجات

کہیں سرچشمۂ احساں ہے شہا تیری ذات — ماہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات

لطف فرما کہ ز حد میگذرد تشنہ لبی

ہے ظفؔر کے دلِ بیمار کا بھی حال وہی — اور اسی طرح سے اب چارہ طلب ہے وہ بھی

کہہ گیا آگے ثنا میں تری جیسے قدسیؔ — سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی

آمدہ سوی تو قدسیؔ پَیِ درماں طلبی

خمسہ اسد اللہ خاں غالب دہلوی در فارسی :۔

کیستم تا بجز و شرم زدم بی ادبی — قدسیاں پیش تو در موقفِ حاجت طلبی

رفتہ از خویش بدیں زمزمہ زیر لبی — مرحبا سید مکی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

ایکہ روی تو دہد روشنی ایمانم — کافرم کافر اگر مہر منیرش خوانم

صورتِ خویش کشیدست مصور دانم — من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بو العجبی

ای گلِ تازہ کہ زیب چمنی آدم را — باعثِ رابطۂ جان و تنی آدم را

کرده در یوزهٔ فیض تو غنی آدم را — نسبتی نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چه عالی نسبی

ای لبت را بسوی خلق ز خالق پیغام — روح را لطف کلام تو کند شیرین کام
ابر فیضی که بود از اثر رحمت عام — نخل بستان مدینه ز تو سرسبز مدام
زان شده شهرهٔ آفاق به شیرین رطبی

خواست چون ایزد دانا که بساطی از نو — گسترد در همه آفاق چه نزدیک چه دور
حکم اصدار تو در ارض و سما یافت صدور — ذات پاک تو درین ملک عرب کرد ظهور
زان سبب آمده قرآن بزبان عربی

وصف رخش تو اگر در دل ادراک گذشت — نه همین ست که از دایرهٔ خاک گذشت
همچو آن شعله که گرم از خس و خاشاک گذشت — شب معراج عروج تو ز افلاک گذشت
بمقامیکه رسیدی، نرسد هیچ نبی

چه کنم چاره که پیوند خجالت گسلم — منکه جز چشمهٔ حیوان نبود آب و گلم
منکه چون مهر درخشان ندهد نور دلم — نسبت خود به سگت کردم و بس منفعلم
زانکه نسبت به سگ کوی تو شد بی ادبی

دل زغم مرده و غم برده ز ما صبر و ثبات — غمگسار کن و بنمای بما راه نجات
وادسوز جگر ما که دهد نیل و فرات — ما همه تشنه لبانیم و تویی آب حیات
رحم فرما که ز حد میگذرد تشنه لبی

غالب غمزده را نیست درین غمزدگی — جز بامید ولای تو تمنای بهی
از تپ (تب) و تاب دل سوخته غافل نشوی — سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمده سوی تو قدسی پی درمان طلبی

مخمس حکیم مومن خاں مومن دہلوی :

ہوں تو عاشق مگر اطلاق یہ بے ادبی میں غلام اور وہ صاحب ہے، میں امت وہ نبی
یا نبی یک نگہ لطف یا می(؟) وابی مرحبا سید مکی، مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

مظہر نور خدا، شکل ہے محسود صنم محو تیرے ملک و حور، پری و آدم
کیا ہے عالم کہ ہے تصویر ہی کا سا عالم من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدین بوالعجبی

دشت عالم میں سراسیمہ گذارے اوقات آج تک منزل مقصود نہ پائی ہیہات
مدد اے خضر کرامت کہ نہیں پائی ثبات ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات
لطف فرما کہ زحد میگذرد تشنہ لبی

خود کہا ابن ذبیحین تو ظاہر میں کہا جوہر پاک کی خوبی ہے فرشتوں سے سوا
سر سے لے پاؤں تلک نور خدا نام خدا نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

صاحبِ خانہ سے ہوتا ہی مکاں کا اکرام وہی جنت ہے جہاں میں ہو جہاں تیرا مقام
آبِ ہر چشمہ کرے کوثر و تسنیم کا کام نخل بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

ہوئی انجیل کہاں ناسخ توریت و زبور تیری خاطر سے خدا نے یہ نکالا دستور
ہے رعایت تری ہر بات کی کتنی منظور ذات پاک تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

کرسکے پایۂ عالی کو ترے کون ادراک   ترے درجہ کو نہ عیوق ہی پہنچے نہ سماک
گرچہ کافی تھی فضیلت کو حدیثِ لولاک   شبِ معراج عروجِ تو گذشت از افلاک

بہ مقامیکہ رسیدی، نرسد ہیچ نبی

جوش میں شوق کے کچھ یاد رہی مدح نہ ذم   یہ نہ سمجھے کہ یہ کیا جا ہی ہے اور کیا ہیں ہم
خود ستائی ہے زبس رسمِ فصیحانِ عجم   نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم

زاں کہ نسبت بہ سگِ کوی تو شد بی ادبی

مومنِ زار کی صحت کا نہ تھا کچھ اسلوب   نہ دوا اور نہ پرہیز، مرض حرص ذنوب
پر ترا لطف ہے اعجاز مسیحا سے بھی خوب   یا طبیب الفقرا انت شفاء القلوب

زاں سبب آمدہ قدسی پی درماں طلبی

خمسہ فارسی جناب مولوی امام بخش صہبائی :-

زیں طرب کز پیٔ امت تو شفاعت طلبی   برلبِ رحمت حق خندہ بود زیرلبی
نسبتِ عرش بہ جاہ تو بود بی ادبی   مرحبا سید مکی، مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

برق زد لمعۂ خورشید رخت بر جانم   زاضطراب آئینہ وش ریخت ہمہ مژگانم
ایکہ مہر تو بہ تن جان و بدل ایمانم   منِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی

چوں ترا یافتہ باشم چہ کنم عالم را   از ہمہ بیشی و با بیش نخواہم کم را
داند آنکس کہ شناسد ز گہر شبنم را   نسبتی نیست بذاتِ تو بنی آدم را

بہ تر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

طوطی سدره شده در شکرت شیرین کام   طوبی از فیض تو در خلد دهد میوه کام
زمزم از بحر کف جود تو سیراب تمام   نخل بستان مدینه ز تو سرسبز مدام
زان شده شهرهٔ آفاق به شیرین رطبی

بود تا مسکن و ماوای تو در عالم نور   بی زبان داشت سخن حق به تو در بزم حضور
هست اسباب چو در عالم اسباب ضرور   ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظهور
زان سبب آمده قرآن بزبان عربی

رخش چالاک تو زیں عرصه چو بیباک گذشت   کز زمیں جست بلند و ز جهان پاک گذشت
رفعت شان تو تنها نه ازیں خاک گذشت   شب معراج عروج تو ز افلاک گذشت
به مقامیکه رسیدی، نرسد هیچ نبی

همچو جان شوق تو ره یافته در آب و گلم   نقش زد حرف وفا خامهٔ حیرت به دلم
لیک چون می نگرم در تو در خود خجلم   نسبت خود به سگت کردم و بس منفعلم
زانکه نسبت به سگت نیز بود بی ادبی

ای ز حق بر تو و بر آل تو دائم صلوات   از لب لعل تو یک جنبش و از خلق نجات
سوز ما بین و بده بر لب تسنیم برات   ما همه تشنه لبانیم و تویی آب حیات
لطف فرما که ز حد میگذرد تشنه لبی

زان زمان کامده لعلت پی مرده مجی (؟)   تهمت معجزه نابسته کسی بر عیسی
درت صهبائی دلسوخته مپسند تهی   سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمده سوی تو قدسی پی درمان طلبی

اس ضمن میں اور بھی تضمینیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم نے طول کلام کے ڈر سے عمداً ان کو

نظر انداز کر دیا ہے، لہذا انھیں چند نمایندہ اقتباسات پر زیر نظر مقالہ کو ختم کیا جا رہا ہے، آیندہ کسی صحبت میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ ان تمام نسخوں کا جو مطالعہ میں آئے ہیں، ایک مفصل تنقیدی جائزہ لیا جائے تاکہ نعت گوئی کے میدان میں انکی اہمیت اور ان کا معیار متعین کیا جا سکے، ہمیں امید ہے کہ ان سطور سے جو بحثیں کی گئیں نعت قدسی کی تصنیف اور اس کے مصنف اعلیٰ کے تعین میں کسی حد تک مدد مل سکے گی اور اس طرح ایک دلچسپ بحث کے مختلف گوشے ناظرین کے سامنے آسکیں گے۔

سلسلۂ شعر العجم

مرتبہ مولانا شبلیؒ

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور انکے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ہر عہد کے تمام مشہور شعراء کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے:-

شعر العجم حصہ اول :- عباس مروزی سے نظامی تک کا تذکرہ۔ قیمت ۱۰/۹۵ پ

" " " دوم :- شعرائے متوسطین یعنی خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ شیرازی اور ابن یمین کا تذکرہ مع تنقید کلام، قیمت ۶/۷۵ پ

" " " سوم :- شعرائے متاخرین فغانی سے ابو طالب کلیم تک کا تذکرہ اور کلام کی خصوصیت۔ قیمت ۶/۲۵ پ

" " " چہارم :- شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی خصوصاً شاہنامہ فردوسی پر بسیط تبصرہ قیمت ۸/۹۰ پ

" " " پنجم :- قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت ۸/۲۵ پ

منیجر

وفیات

آہ ! مولانا سید ریاست علی ندوی

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

گذشتہ مہینہ پٹنہ کے اخبار صدائے عام میں دار المصنفین کے ایک پرانے لائق خدمت گذار مولانا سید ریاست علی ندوی کی وفات کی خبر بڑے دکھ اور درد کے ساتھ پڑھی، اسی وقت ان کی اہلیہ کے نام ایک تعزیتی تار بھیجا، پھر انکے صاحبزادے سید ارشد علی کا یہ خط موصول ہوا :-

آبگیلہ، ڈاکخانہ بنیاد گنج، گیا

۱۹؍ دسمبر ۱۹۷۶ء

محترم چچا جان ! السلام علیکم

بہت ہی افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ والد محترم جناب مولانا سید ریاست علی ندوی صاحب ۱۴؍ نومبر ۱۹۷۶ء کو بروز اتوار بوقت سوا نو بجے دن رحلت فرماگئے، موت حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی، پہلا دورہ ۱۳؍ نومبر کو ۹ بجے دن کو ہوا، شہر کے مشہور ڈاکٹروں نے دیکھا، طبیعت سنبھل گئی، ہم لوگ کافی پُر امید ہو گئے، احتیاط کی خاطر گیارہ بجے رات کو مقامی اسپتال میں داخل کر دیا گیا، کبھی کبھی طبیعت

کچھ گر جاتی تھی، لیکن برابر ہوش میں رہے، اپنی وفات سے ایک منٹ پہلے تک ہنستے بولتے رہے، ہم لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ہم لوگوں کو اس قدر جلد داغِ مفارقت دے جائیں گے۔

ان کو اپنی غیر مطبوعہ کتابوں کی کافی فکر تھی۔ وہ اعظم گڈھ جانے کا ارادہ بار بار کرتے رہے۔ وہ دسمبر میں اعظم گڈھ ضرور پہنچتے۔ وہ اپنی چند کتابیں دار المصنفین کو دینا چاہتے تھے، یہ بات اطلاعاً لکھ رہا ہوں، امید کہ جناب عالی مع الخیر ہوں گے"۔

اس خط کو پڑھ کر آبدیدہ ہوا اور چالیس سال پہلے کے دار المصنفین کی صحبتیں یاد آگئیں، میں یہاں ۱۹۳۵ء میں آیا، یہ اس کی شہرت کے شباب کا زمانہ تھا، اس وقت اس علمی کاروان کے سالار اور حدی خواں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ تھے، جن کے علم کا اعتراف علامہ اقبالؒ نے جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد کہہ کر کیا تھا، اس وقت انکی علمی بصیرت اور تحقیقی ژرف نگاہی سے پورا ہندوستان گونج رہا تھا، ہندوستان کے ہر گوشہ سے ان سے استفادہ کے لیے اربابِ علم پہنچتے رہتے تھے۔ دار المصنفین کے اندر مولانا عبد السلام ندویؒ اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر علم و ادب کے موتی بکھیرنے میں مشغول تھے، اس بیت الحکمت سے مولانا ابوظفر ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سید ریاست علی ندوی، جناب محمد عزیر صاحب ایم۔ اے، ایل، بی، اور یہاں مدراس سے آکر مولوی حافظ محمد یوسف کوکنی عمری وابستہ تھے، مولوی مسعود علی ندوی اہل علم نہ ہونے کے باوجود اس علمی مجلس کے رکن رکین بنے رہے، وہ اپنی دلچسپ باتوں اور بذلہ سنجیوں سے اس پر چھائے رہتے، میں یہاں پہنچا تو مجھکو یہاں کا ہر ہر گوشہ بساطِ دامانِ باغبان اور کفِ گلفروش نظر آیا،

مگر یہی بزم جو جنت نگاہ اور فردوس گوش بنی ہوئی تھی، سرور و سوز، جوش و خروش

سے خالی ہوتی گئی، پہلے تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی جدائی سے ان کے صریر خامہ کے نوائے سروش سے محروم ہو گئی، ان کے بعد مولانا عبد السلام ندوی کے قلم کا خرام ناز اور نظارۂ جمال آنکھوں سے اوجھل ہوا، مولانا ابو ظفر ندوی بھی دار المصنفین سے جاکر اللہ کو پیارے ہوئے، پھر مولوی مسعود علی ندوی کی شیریں بیانی اور خوش گفتاری چھن گئی، جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی دار المصنفین کے وقار اور آبرو کے ضامن بنے ہوئے اس کی مسند پر متمکن تھے کہ یکایک اس کے ذرہ ذرہ کو سینہ کوبی کرنے کے لیے چھوڑ گئے، ڈاکٹر محمد عزیر ۱۹۳۰ء ہی میں دار المصنفین چھوڑ کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے تھے، مگر بفضل اللہ تعالیٰ وہ بقید حیات ہیں اور کراچی میں عاقبت سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں جناب مولوی حافظ محمد یوسف صاحب بھی پانچ سال یہاں رہ کر مدراس واپس ہو گئے، جہاں وہ مدراس یونیورسٹی میں عربی فارسی اور اردو کے شعبوں کے صدر ہوئے،

مولانا سید ریاست علی ندوی بھی ۱۹۵۰ء میں یہاں سے مستقل طور پر چلے گئے، مگر یہاں سے جانے سے پہلے دار المصنفین کی بزم دوشین کی ایک روشن شمع وہ بھی تھے، مگر آہ وہ بھی اب خموش ہے

وہ ۱۹۲۴ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ ندوہ کی تعلیم ختم کر کے حضرت سید صاحبؒ کی خواہش پر یہاں آئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں سید صاحب کو اپنی علمی ریاضت و محنت سے متاثر کیا، ۱۹۲۶ء میں ان کو اپنی نگرانی میں معارف کے مضامین کی ترتیب کا کام سپرد کیا، جس میں وہ اچھے اچھے مضامین کی تلخیص کرتے اور مطبوعات جدیدہ پر ریویو بھی لکھتے رہے، ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۰ء تک معارف میں ان کے اہم مضامین حسب ذیل عنوانات سے شائع ہوئے،

عربوں کا علم طب شام میں (جون ۱۹۲۶ء)، فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ (جولائی تا ستمبر ۱۹۲۶ء

ترکی ادبیات پر ایک اجمالی نظر (جون ۱۹۲۷ء)، امام غزالی اور حکمائے یورپ (اگست ۱۹۲۸ء) ابن رشیق صقلیہ میں (اپریل، اگست، ستمبر ۱۹۲۹ء)، خان اعظم تاتار خاں (فروری ۱۹۳۲ء)، کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی قانوناً جرم تھی (مئی ۱۹۳۲ء)، ترجمان القرآن اور نجات وسعادت کی راہ (مارچ ۱۹۳۳ء)، اغلبیوں کا عدالتی نظام (دسمبر ۱۹۳۳ء)، سندھ کے اسلامی حملوں کے قیدی (مئی ۱۹۳۵ء)، سسلی میں مسلمانوں کا تمدن (ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور میں پڑھا گیا، ستمبر تا دسمبر ۱۹۳۵ء وجنوری ۱۹۳۶ء)، صقلی ہندی (مارچ ۱۹۴۳ء) عالمگیر کے عہد میں مندروں کا انہدام (ستمبر ۱۹۴۳ء)، کتاب العشر والزکوٰۃ (اگست، ستمبر ۱۹۴۴ء) عہد اسلامی کا ہندوستان (مئی، جون، جولائی ۱۹۴۹ء)

معارف میں باب الاستفسار قائم کیا گیا تو اس میں بیرونی سوالات کے جوابات بہت ہی محنت سے لکھتے، جو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے،

دار المصنفین کے قیام میں ان کا اہم کارنامہ دو جلدوں میں تاریخ صقلیہ کی ترتیب و تدوین ہے، اس جزیرہ میں مسلمانوں کی حکومت کے کارناموں کو بالکل بھلا دیا گیا تھا، یہاں ان کی ڈھائی سو سال حکمرانی رہی، اس مدت میں انھوں نے اس کو جس طرح سنوارا، وہ مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا شاندار کارنامہ ہے، اس کی پہلی جلد بقول مصنف مرحوم رزمگاہ ہے جس میں یہاں کے سیاسی حالات اور مسلسل معرکہ آرائیاں دکھائی گئی ہیں، اور دوسری جلد بزمگاہ ہے جس میں صقلیہ کے اسلامی تمدن کے مناظر دکھائے گئے ہیں، اس طرح یہ دونوں جلدیں ایک ایسی تمدن آفریں قوم کی سرگذشت ہے جس کی تمدنی ترقیاں یورپ کی جدید ترقیوں کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے، مرحوم نے ان دونوں جلدوں کو جس محنت و ریاضت سے لکھا ہے وہ دار المصنفین کی علمی تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ شمار کرنے کے لائق ہے، اس کو جن چند کتابوں پر

... ان میں یہ دو مضامین بھی شامل ہیں، [illegible]

ان کی ایک کتاب تاریخ اندلس جلد اول بھی ہے، یہ بھی دارالمصنفین کی مقبول کتابوں میں ہے اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، انھوں نے معارف میں اسلامی نظامِ تعلیم کے عنوان سے ایک سلسلہ مضمون بھی لکھنا شروع کیا تھا جو بعد میں کتاب کی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوئی، اردو میں اس موضوع پر اس سے بہتر شاید کوئی اور کتاب نہیں، معارف میں ان کے جو مضامین ہندوستان پر نکلتے رہے، ان کا ایک مجموعہ "عہد اسلامی کا ہندوستان" کے نام سے شائع کیا،

دارالمصنفین میں تقریباً ۲۴ سال رہنے کے بعد وہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل کے عہدہ کے خواستگار ہوئے، وہاں ان کا انتخاب نہیں ہو سکا تو ان کو دارالمصنفین واپس آنے میں تامل ہوا، اس لیے وہ اپنے وطن گیا جا کر رسالہ ندیم کے مالک ہو گئے، ان کو خیال ہوا کہ وہ معارف کے اپنے ادارتی تجربے سے اس کے معیار کو اونچا کر کے معارف بنا دینگے، لیکن اس میں ان کو مایوسی ہوئی، ندیم کا ایک بہار نمبر تو اچھا نکالا مگر اس کے بعد مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے تو پھر دارالمصنفین واپس آ گئے، یہ زمانہ ہندوستان کی سیاست میں بہت ہی پُر آشوب تھا، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش سے ہندوستان کی سیاست بہت ہی مکدر ہو رہی تھی، سید صاحب دارالمصنفین کو اس سیاسی الجھاؤ سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے، مگر ریاست علی صاحب کھل کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، جو سید صاحب کو پسند نہ آیا، سنہ ۱۹۵۰ء میں وہ دارالمصنفین کو چھوڑ کر شمس الہدیٰ کے پرنسپل ہو گئے، تو وہاں نہ خود مطمئن رہ سکے، نہ وہاں طلبہ اور اساتذہ کو خوش رکھ سکے، اس لیے بہار عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ منتقل ہو گئے،

جہاں سے ریٹائر ہوئے تو انکو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن سے کچھ تحقیقی کام کیلئے وظیفہ بھی ملا، مگر شاید مکمل نہ کر سکے انکا وطن آبگیلہ ضلع گیا تھا، وہیں زندگی کے آخری ایام گذار رہے تھے، سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باوجود سیاست ان کیلئے سازگار نہیں ہوئی، وفات سے کچھ دنوں پہلے انکو موتیا بند ہو گیا تھا، اسلیے لکھنے پڑھنے سے مجبور رہ گئے، آپریشن کے بعد روشنی آگئی تھی، میرا اصرار تھا کہ وہ دارالمصنفین آکر تاریخ اندلس کی دوسری جلد مکمل کر دیں، اسکے لیے وہ رضامند بھی ہو گئے تھے، انکی آمد کا انتظار تھا، کہ یکایک انکی رحلت کی خبر ملی جس سے بڑا دکھ پہنچا، وفات کے وقت انکی عمر غالباً ۴ سال تھی،

ان کی اصل جگہ دارالمصنفین تھی، وہ ایک پرنسپل، ایک استاد اور ایک سیاست داں کی حیثیت سے تو بھلا دیے جائیں گے لیکن ایک اچھے مصنف کی حیثیت سے برابر یاد کیے جائیں گے، اگر انکی ساری عمر دارالمصنفین ہی میں گذرتی تو اپنے پیچھے مفید اور بلند پایہ تصانیف چھوڑ جاتے، انھوں نے پٹنہ میں ادارۃ المصنفین قائم کرنا چاہا لیکن ناکام رہے، وہ خود کہتے کہ دارالمصنفین چھوڑا تو علم کا لبادہ بھی خود بخود اتر گیا، دارالمصنفین کی تاریخ کا یہ پہلو عجیب ہے کہ یہاں رہ کر اچھے سے اچھے مصنف تیار ہوئے لیکن یہاں سے جانے کے بعد وہ علم وفن کے لیے کھو گئے، مرحوم دارالمصنفین چھوڑ رہے تھے تو سید صاحب کو دکھ تھا کہ ایک لائق، محنتی اور قابل قدر مصنف ان سے جدا ہو رہا ہے، اس تحریر کے لکھتے وقت یہ خیال آرہا ہے کہ وہ یہاں آخر وقت تک رہتے تو دارالمصنفین کے علمی آسمان کے ایک اہم سیارہ اور ملک کے ایک قیمتی علمی سرمایہ بنکر رہتے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ ان کو اپنی آغوش مغفرت میں لیکر ہر قسم کی رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائیں۔ آمین

مطبوعات جدیدہ

سیرت عائشہؓ (ملیالم):۔ مترجمہ جناب ایم۔ پی عبدالرحمٰن کرکل تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۳۷۶، قیمت ۱۲؍، پتہ: ہادی پبلیکیشنز منجیری کیرالا۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور و مقبول کتاب سیرت عائشہؓ کے متعدد اڈیشن دارالمصنفین سے چھپ چکے ہیں، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات زندگی، فضل و مناقب، علمی و دینی کارناموں، فقہی اجتہادات اور صنف نسوانی پر انکے احسانات وغیرہ کے متعلق اردو کیا دوسری زبانوں میں بھی اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اب جناب ایم۔ پی عبدالرحمٰن کرکل صاحب نے جنوبی ہند کی ایک مشہور زبان ملیالم میں اسکا ترجمہ شائع کیا ہے، راقم کو اس زبان سے واقفیت نہیں ہے، مگر لائق مترجم نے ترجمہ کے دوران دارالمصنفین کے ذمہ داروں کو جو خطوط لکھے اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کا کام بڑے شوق، دلچسپی، محنت اور توجہ سے انجام دیا ہوگا، اللہ تعالیٰ اس علمی و دینی خدمت کا انکو اجر عطا فرمائے، ملیالم جاننے والوں کے لیے اس ترجمہ کی اشاعت بہت ہی مفید ہے، امید ہے کہ اردو ہی کی طرح ملیالم میں بھی یہ کتاب مقبول ہوگی۔

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر:۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد عمر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ بہتر، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۵۰۰، قیمت ۲۰؍، ناشر: وزارت

اطلاعات ونشریات حکومت ہند، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

زیر نظر کتاب میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت، عادات و اطوار، رسم و رواج، رہن سہن اور خیالات وغیرہ کا تقابلی مطالعہ کرکے مسلمانوں پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات دکھائے گئے ہیں، پہلے ہندو مسلم تعلقات اور دونوں قوموں میں محبت و یگانگت کے اسباب کے ضمن میں مسلم سلاطین کی رواداری، ہندو مذہب کے بارہ میں نیک خیالات اور صوفیوں اور سادھو سنتوں کے رویے کا ذکر ہے۔ پھر قدیم ہندوستان کی ذات پات کے نظام، اسکے متعلق اسلام کا نظریہ، مسلمانوں میں اس کے رجحانات اور انکی مختلف سماجی اور پیشہ ورانہ ذاتوں کو بیان کرکے دونوں قوموں کی ذات پات کے نظام میں مماثلت دکھائی گئی ہے، ایک باب میں شادی بیاہ اور پیدائش سے وفات تک کی ان گوناگوں رسموں کا ذکر ہے جن کو ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی اختیار کیے ہوئے ہیں، چوتھے باب میں ہندو تہواروں میں مسلمانوں کے حصہ لینے، پانچویں میں کھیل تماشے اور تفریحی مشاغل میں ان کی دلچسپی اور چھٹے میں اس زمانہ کی ہندوستانی سواریوں سے مسلمانوں کے شغف کا حال تحریر کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں کائنات کے بارہ میں ہندوؤں کے عقائد بیان کرکے ثابت کیا گیا ہے کہ ان کی طرح مسلمان بھی بعض توہمات نجوم، سحر، ٹونا ٹوٹکا، تعویذ، گنڈہ اور ارواح خبیثہ پر اعتقاد رکھتے ہیں، آٹھویں باب میں تصوف پر ہندوستانی اثرات بیان کرتے ہوئے اسلامی تصوف اور ہندوؤں کے صوفیانہ خیالات میں مشابہت کے پہلوؤں کا ذکر ہے۔ نویں باب میں ہندوستانی موسیقی، سنگیت اور راگوں سے مسلمان امرا، عوام اور صوفیہ کی دلچسپی دکھائی گئی ہے اور آخری باب میں اردو ادب پر ہندوستانی اثرات کا ذکر ہے، اس طرح یہ کتاب بڑی پر از معلومات ہے۔

ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے سلسلہ میں ایک بحث یہ اٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ اس میں زیادہ تر

خارجی وحدت ہے، جو تہذیب کا جز نہیں بن سکتی، تہذیب، داخلی وحدت سے مبنی ہے، مصنف کی اس کتاب میں اس بحث پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، اگر مدلل بحث سے اس کی تنقیح ہو جاتی تو ان کے قارئین کا ذہن صاف ہو جاتا، ڈاکٹر امبیدکار نے بھی یہ بحث اٹھائی تھی کہ جو ہندو اسلام قبول کرکے مسلمان ہوگئے، ان میں تبلیغ اچھی طرح نہیں کی گئی، عالموں اور مبلغوں نے بہت سے اسباب کی بنا پر ان میں اسلام کا صحیح پیام نہیں پہنچایا، اس لیے ان مسلمانوں میں ہندوؤں کے بہت سے رسم و رواج پہلے کی طرح باقی رہ گئے، اسی طرح یہ محض میکانکی اسباب کی بنا پر مسلمانوں میں ابتک جاری ہیں، یہ معاشرتی یا تہذیبی یگانگت کی خاطر اختیار نہیں کیے گئے، ڈاکٹر امبیدکار کے اس دعویٰ پر بھی بحث کرنا ضروری تھا، تاکہ یہ اندازہ ہو جاتا کہ ان کا یہ دعویٰ کرنا صحیح ہے یا غلط، تصوف پر ہندوستانی اثرات دکھاتے وقت اس کا ذکر بھی آنا چاہیئے تھا کہ صوفیائے کرام میں تین قسمیں تھیں، صاحب وصول، صاحب اصول، صاحب فضول، ان میں سے کس نے ہندوستانی اثرات قبول اور کس نے رد کیے، مسلمانوں پر بت پرستی کا الزام عائد کرنا صحیح نہیں ہے، رہی گور پرستی تو اس میں مسلمانوں کا جو طبقہ ملوث ہے وہ اس کو پرستش نہیں سمجھتا، ایک جگہ لکھتے ہیں "مسلم عوام خصوصاً سلاطین نے ہندوؤں کے ساتھ نرمی اور مذہبی رواداری کا طرز عمل اختیار کیا اور تبلیغ اسلام کو اپنا لائحہ عمل نہیں بنایا" (ص ۱۵) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تبلیغ و اشاعت اسلام نرمی و رواداری کے منافی ہے، آگے اس سلسلہ میں جو کچھ مزید لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ عہد میں مسلمانوں کے لیے تبلیغ کا فریضہ بعض حیثیتوں سے مضر ہوتا،

یہ مفید کتاب زبان و بیان کی جابجا خامیوں سے داغدار ہوگئی ہے، جیسے انھوں نے بہت سے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف رجوع کیا" (۸)، "مسجدیں تعمیر کروائیں" (ص ۹) اسی

فن کی تربیت دلوانے لگے (ص ۸۹)۔ ایسا نازک اور کپڑے تیار کرتے تھے (ص ۹۰) ہزاروں روپیے صرف ہوتا تھا (ص ۱۰۰)، اشراف شہر کی یہ موروثی رسم ہے کہ بغیر منجم سے دریافت کیے بغیر کوئی کام خیر کوئی معاملۂ خواستگاری بغیر منجم کے استصواب رائے کے نہیں ہوتا (ص ۲۵۰)، عورتوں میں بدشگونی کے اعتبار سے ساری رات نیند نہیں آتی اور اس قسم کی شادی کو بہت برا منحوس خیال کرتی ہیں (ص ۲۶۴)، صرف ایک دو واقعات سے عام مسلمانوں میں بت پرستی کے رجحان کے لیے دلیل نہیں بن سکتے (ص ۲۹۰)، اور قسم قسم کے امراض اور بلاؤں سے مدافع کے لیے تعویذیں پہنائی جاتی تھیں (ص ۲۶۸)، تذکیر و تانیث کی بعض غلطیاں بھی ہیں، مثلاً "ہندوؤں کے قدیم طبقاتی تقسیم (۸۹)، ان کے سیاسی اور سماجی تنظیم (ص ۸۰)، اسلام کے توسیع (ص ۸۴)، اسلام کے مساوات اور عالمگیر اخوت کے نظریے (۸۵)، مہاجرین کی مختلف نسلی گروہوں میں (۸۶)، جمع کے استعمال میں بھی بے احتیاطی کی گئی ہے جیسے ارذال ۸۶ علم نجوم و ہیات (ص ۲۵۲)، رسوم و رواجوں (۴۹۵)، ماخذات (۵۲۸)، زہدا (۲۲۹) اکابروں (۲۵۱) وغیرہ، ہندی الفاظ کا بلاضرورت استعمال بھی ذوق پر گراں گذرتا ہے۔ جیسے انیک، ورن، چندا و چندہ وغیرہ، املا اور کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں، مثلاً حذف کو ہذف اور تعویذ کو ہر جگہ تویذ لکھا گیا ہے، البیرونی کی کتاب الہند (عربی) کا فارسی کتابوں کے ضمن میں ذکر ہے، اور تقویۃ الایمان کے اردو ترجمہ کا حوالہ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ تو اردو ہی میں لکھی گئی تھی

انسانی حقوق کیا ہیں؟ :- مترجم جناب جلیس عابدی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۵۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد معہ غیر مجلد للعہ، پتہ: نیشنل اکاڈمی، ۱۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی۔

یہ لندن کے موریس کرینسٹن کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، اس میں انسان کے بنیادی حقوق کی تشریح کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں گذشتہ چار پانچ صدیوں سے اب تک کے مغربی مفکرین کے خیالات کا ماحصل پیش کیا گیا ہے، مصنف نے انسانی حقوق، کا منشا و مفہوم متعین کرکے زندگی، آزادی، ملکیت اور معاشی و سماجی حقوق پر سیر حاصل بحث کی ہے، انکے خیال میں نظری طور پر تمام حکومتیں ان حقوق کو تسلیم کرتی ہیں، مگر عملاً وہ ان میں پہلو تہی سے کام لے رہی ہیں، اس ضمن میں انسانی حقوق کے مستقبل پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، آخر میں تین ضمیمے ہیں، ان میں انسانی حقوق کے عالمی منشور، اقوام متحدہ کے معاشی، سماجی، تہذیبی، شہری اور سیاسی حقوق کے میثاق اور انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کے تحفظ کے لیے یورپین کنونشن کی دفعات اور تجویزوں کا ذکر ہے، مصنف کو اعتراف ہے کہ انسانی حقوق کا یہ تصور یورپ کے روشن خیال دور کی دین نہیں ہے، بلکہ قدیم یونان میں بھی فطری حقوق کا یہ تصور موجود تھا، مگر انھوں نے اسلام کے عطا کردہ حقوق کو قصداً بالکل نظر انداز کر دیا ہے، یورپ کے مصنفوں کا یہ عام رنگ ہو گیا ہے کہ وہ اسلام کی کسی قسم کی خوبیوں کا ذکر کرنا کسی لحاظ سے پسند نہیں کرتے جو ان کے علمی اور ذہنی تعصب کی دلیل ہے، مترجم کا ترجمہ سلیس ہے،

اوپر کی دنیا:۔ از جناب عبدالکریم صاحب پاریکھ، تقطیع خورد، کاغذ اچھا، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۷۲، قیمت تحریر نہیں، ناشر: مکتبہ جامعۃ الصالحات، مالیگاؤں، ناسک مہاراشٹر

زیر نظر کتاب میں آسمان سے متعلق قرآنی بیانات کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہے، تاکہ اسکی کاریگری میں غور و فکر سے کائنات کے خالق کا علم ہو سکے، مصنف نے سائنس دانوں اور ٹکنالوجی کے ماہرین کو بھی دعوت دی ہے کہ وہ اپنے علم و مشاہدے کی روشنی میں ان آیتوں کی رو سے صحیح نتیجہ تک پہنچیں، مصنف دین و مذہب کی خدمت کا سچا ولولہ رکھتے ہیں، یہ کتاب اسی جذبے سے لکھی گئی ہے۔

"ض"

شاہ صاحب کی تصنیفات

معارف کے علمی تحقیقی و ادبی و تنقیدی و تاریخی مضامین اور شذرات کے ہزاروں صفحوں کے علاوہ جو مطالعہ و بصیرت تجربہ و مشاہدہ اور فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، شاہ صاحب کی مستقل تصنیفات و تراجم کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔

۱- مہاجرین جلد دوم قیمت: ۱۲-۹

۲- سیر الصحابہ جلد ۶ " ۹-۴

امام حسین کے حالاتِ زندگی کے ضمن میں واقعۂ حزنیہ کربلا کی غم انگیز تفصیل،

۳- سیر الصحابہ جلد ۷،

۴- تابعین: ۶۹، اکابر تابعین کے سوانح،

قیمت: ۱۲-۵۰

۵- تاریخ اسلام اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

قیمت: ۱۲-۵۰

۶- تاریخ اسلام دوم (خلافت بنی امیہ) ۰۰-۱۱

۷- تاریخ اسلام سوم (خلافت عباسیہ اول)

قیمت: ۱۴-۰۰

۸- تاریخ اسلام چہارم (خلافت عباسیہ دوم)

قیمت: ۱۵-۰۰

۹- اسلام اور عربی تمدن قیمت: ۱۵-۰۰

۱۰- عرب کی موجودہ حکومتیں،

قیمت

۱۱- ادبی نقوش (شائع کردہ فروغ اردو لکھنؤ)

۱۲- دین رحمت قیمت: ۱۰-۰۰

۱۳- خریطۂ جواہر ۴-۷۵

زندگی کی آخری کتاب

۱۴- حیات سلیمان: یعنی جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا دلآویز مرقع۔ اور اپنے اسلوب و طرز انشا اور تحقیق کے لحاظ سے حیات شبلی کا مثنیٰ، دلکش، دلچسپ قابل مطالعہ اسمیں سید صاحب کے دور کی تمام تحریکوں کی مختصر تاریخ بھی آگئی ہے، قیمت: ۲۷-۵۰

معارف کے گذشتہ سالوں کے مکمل فائل

اور

متفرق پرچے

معارف علوم و معارف کا گنجینہ، مشرقی و مغربی علوم و فنون کا دائرۃ المعارف اور ہزاروں علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، فقہی، دینی مضامین اور تحقیقات کا ایک دلآویز مجموعہ ہے، اس کی اسی دلآویزی، اور اہمیت کی بنا پر اس کا آوازۂ شہرت ہندوستان کی چار دیواری سے گذر کر یورپ و امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ملکوں تک پہونچ گیا ہے، مستشرقیات کے جن غیر مسلم فضلاء نے غلط فہمی کی بنا پر جب جب بھی اسلام پر اعتراضات کئے تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں دار المصنفین کے رفقاء محققین نے ان کے دندان شکن جوابات اسی کے صفحات پر دیئے ہیں، متفرق پرچوں کے علاوہ حسب ذیل رسالوں کے فائل تو مکمل موجود ہیں،

مکمل فائلوں کی تفصیل

۱۹۳۴ء   ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۹ء

۱۹۷۱ء

ان کو خرید کر اپنے کتب خانہ کی رونق بڑھائیں،   "منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ"